قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
www.urducouncil.nic.in

ستمبر 2014، قیمت -/15

ماہنامہ اردو دنیا
دہلی

Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

ٹیگور اور اقبال: فکر و فن

URDU DUNIYA Monthly, September- 2014, Vol. 16, Issue: 09
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Higher Education, Ministry of Human Resource Development, Government of India

RNI NO. 70323/99
DL (S) - 01/3394/2014-16
ISSN 2249 - 0639
Date of Publication: 24/8/2014
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

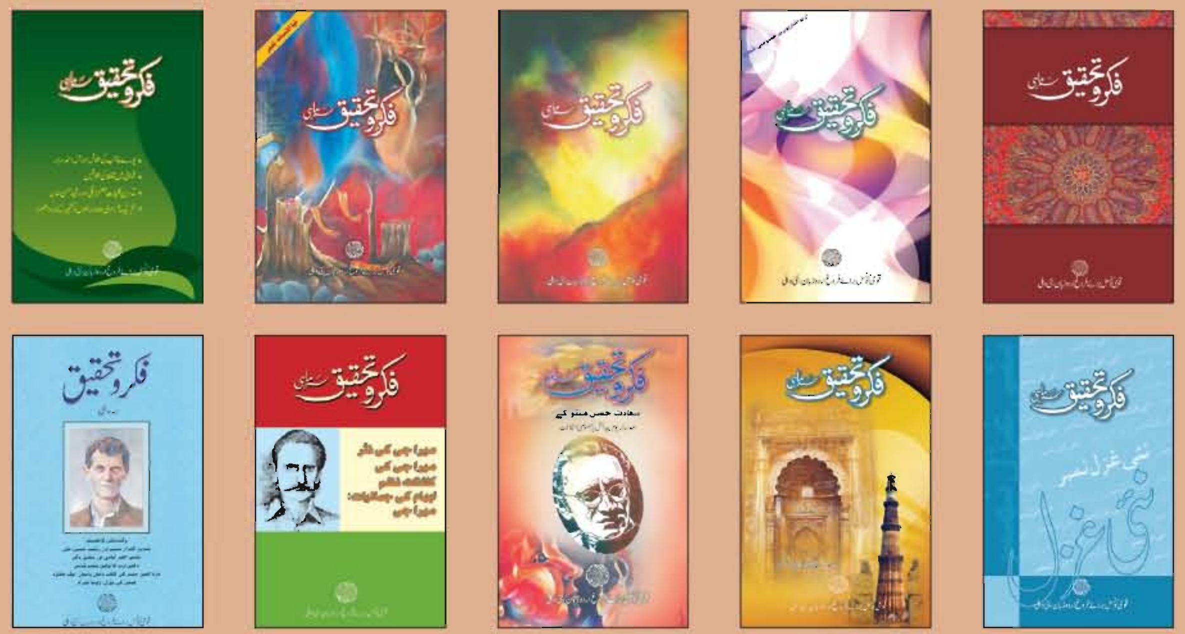

سہ ماہی فکر و تحقیق

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان و ادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

منگانے کے لیے رابطہ کریں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Printed and Published by Dr. Khwaja Md. Ekramuddin, Director, NCPUL on behalf of NCPUL, FAROGH-E-URDU-BHAWAN, FC-33/9, Institutional Area, Jasola, New Delhi-110025 and printed at S. Narayan & Sons, B-88, Okhla Indl. Area, Phase-II, New Delhi-110020 on 80 GSM Art Paper produced by JK Editor :Dr. Khwaja Md. Ekramuddin, Tel : 49539000

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

عصری لغت

مصنف: پروفیسر عبدالحق
صفحات: 749
قیمت: 240 روپے

اردو لوک ناٹک: روایت اور اسالیب (حصہ اول)

مصنف: کنول ڈبائیوی
ترتیب وترمیم: پروفیسر ابن کنول
صفحات: 482
قیمت: 170 روپے

اردو لوک ناٹک: روایت اور اسالیب (حصہ دوم)

مصنف: کنول ڈبائیوی
ترتیب وترمیم: پروفیسر ابن کنول
صفحات: 482
قیمت: 162 روپے

حصول آزادی کے لیے ہندوستان کی جدوجہد

مترجم: سعید احمد انصاری
صفحات: 680
قیمت: -/234 روپے

عربی ادب کی تاریخ (جلد سوم)

مصنف: عبدالحلیم ندوی
صفحات: 695
قیمت: -/178 روپے

اردو سب کے لیے

ادارہ
صفحات: 121
قیمت: -/45 روپے

ابوالکلام آزاد ایک ہمہ گیر شخصیت

مصنف: رشیدالدین خان
صفحات: 684
قیمت: -/200 روپے

کلیات سعادت حسن منٹو (پہلی جلد)

تحقیق، تدوین، ترتیب:
پروفیسر شمس الحق عثمانی
صفحات: 567
قیمت: -/184 روپے

کلیات سعادت حسن منٹو (دوسری جلد)
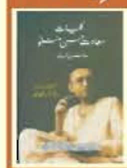
تحقیق، تدوین، ترتیب:
پروفیسر شمس الحق عثمانی
صفحات: 575
قیمت: -/186 روپے

اردو-ہندی لغت

ادارہ، ایڈیٹر: ڈاکٹر روپ کرشن بھٹ
کوآرڈینیٹر: مسرت جہاں
صفحات: 416
قیمت: -/220 روپے

کلیاتِ اکبرالٰہ آبادی (جلد دوم)
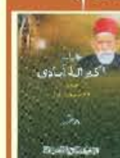
مرتب: احمد محفوظ
صفحات: 803
قیمت: -/257 روپے

اردو میں ترقی پسند تحریک

مصنف: خلیل الرحمٰن اعظمی
صفحات: 410
قیمت: -/129 روپے

اردو سافٹ ویئر

ادارہ
صفحات: 135
قیمت: -/68 روپے

کلیات کمار پاشی (جلد اول)

مرتب: چندر بھان خیال
صفحات: 477
قیمت: 166 روپے

کلیات کمار پاشی (جلد دوم)

مرتب: چندر بھان خیال
صفحات: 465
قیمت: 157 روپے

کلیاتِ سلیم واحد سلیم

مرتبہ: مسلم سلیم
صفحات: 432
قیمت: -/150 روپے

کلیات محمد قلی قطب شاہ

مرتبہ: ڈاکٹر سیدہ جعفر
صفحات: 823
قیمت: -/233 روپے

اے نیو ہندستانی-انگلش ڈکشنری

مصنف: ایس ڈبلو فیلن
صفحات: 1216
قیمت: -/656 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل
بچوں کے لیے اردو کی تاریخ کا سب سے خوب صورت، خوب سیرت شاندار رسالہ

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ بچوں کی دنیا دہلی
Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

پیاری پیاری نظمیں
قسط وار ناول
عجیب وغریب خبریں

دل چسپ کہانیاں
معلوماتی مضامین
ہنسنے ہنسانے کی باتیں

ان کے علاوہ:

دنیا کے مذاہب ♦ کامکس کہانی ♦ نانی کا صندوق

اردو ایس ایم ایس ♦ اردو فیس بک ♦ دماغی ورزش

ننھے فنکار ♦ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

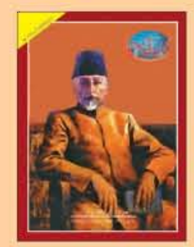

ہندوستان بھر میں سب سے زیادہ چھپنے والا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ: 10 روپے   سالانہ: 100 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in
شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون: 24415194 - 040

مشمولات

اداریہ

ہماری بات 2

خطوط

آپ کی بات — قارئین کے خطوط 3

انٹرویو

ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی — محمد عارف اقبال 8

گوشہ ٹیگور اور اقبال

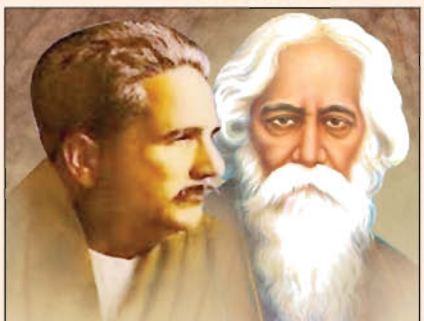

ٹیگور اور اقبال: فکری و شخصی موازنہ — محمد ارشاد علی 12

ٹیگور اور اقبال کا مشترکہ المیہ — محمد علم اللہ 16

اقبال کب پیدا ہوئے؟ — فرحت زیبا 20

ٹیگور کی زندگی اور تخلیقی عناصر — شمیم احمد 23

اقبال اور ٹیگور: ایک مختصر جائزہ — محمد عارف 26

زمین سے پیدا ہونے والا سورج

رابندر ناتھ ٹیگور — منظر اعجاز 30

ٹیگور اور اقبال کا شخصی و نظریاتی مطالعہ — اسامہ شعیب علیگ 37

اقبال کا تصورِ تعلیم — یاسمین فاطمہ 44

کلام ٹیگور — رابندر ناتھ ٹیگور 46

چھٹی (بنگلہ کہانی) — رابندر ناتھ ٹیگور 48

کلامِ اقبال — علامہ اقبال 51

لسانیات

زبان کے مختلف معیار — نصیر احمد خان 57

زبان و تعلیم

اردو درس و تدریس میں لغات کا کردار — غضنفر 58

ادبی مباحث

افسانہ شعریات کی تشکیل کا جواز — شاہد الرحمن 62

سجاد ظہیر خطوط کے آئینے میں — راحت افزا 64

پہلی جنگِ آزادی

20 ستمبر 1857:

حالات، واقعات و اثرات — معصوم عزیز کاظمی 66

صحت

اپنی قوتِ مدافعت بڑھائیے — شمس الاسلام فاروقی 72

کتابوں کی دنیا

تبصرہ و تعارف 75

عالمی اردو نامہ

عالمی خبریں — ادارہ 85

خبر نامہ

اردو دنیا کی خبریں — ادارہ 86

ماہنامہ اردو دنیا دہلی

Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد: 16 شمارہ: 09 ستمبر 2014

مدیر : ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین

نائب مدیر : ڈاکٹر عبدالحی

اعزازی مدیر : نصرت ظہیر

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومتِ ہند

مطبع:

ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا

فیز-II، نئی دہلی-110020

مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

کمپوزنگ: محمد اکرام

ڈیزائننگ: فیض الاسلام فیضی

قیمت -/15 روپے سالانہ -/150 روپے

- اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
- ڈرافٹ NCPUL,New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغِ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا جسولہ، نئی دہلی-110025

فون: 49539000 شعبۂ ادارت: 49539000

ویب سائٹ

http://www.urducouncil.nic.in

E-mail: editor@ncpul.in

urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7 آر کے پورم، نئی دہلی۔110066

فون: 26109746، فیکس: 26108159

ای میل: sales@ncpul.in,ncpulsaleunit@gmail.com

شاخ: 22-7-110، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس

بلاک نمبر 5-1 پتھر گٹی، حیدر آباد۔500002

فون: 040-24415194

ہماری بات

’اردو دنیا‘ کے اس شمارے میں خصوصی گوشے کے تحت ہم نے برصغیر کی اُن دو اہم ادبی شخصیتوں کے فکروفلسفے کا ایک معروضی جائزہ لینے کی کوشش کی ہے جنھیں کسی ایک جغرافیائی خطے تک محدود رکھ کر دیکھنا اور سمجھنا ان کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔ ٹیگور اور اقبال دونوں نے غیر منقسم اور غلام ہندوستان میں آنکھیں کھولیں اور ملک کی آزادی سے بمشکل ایک عشرہ پہلے دونوں ہم سے رخصت ہوگئے۔ بحیثیتِ ادیب ان کے قومی و مذہبی نظریات وتصورات میں اگرچہ بہت زیادہ مماثلت و یگانگت نہیں تھی تاہم بطور شاعر دونوں آج بھی ہماری قومی زندگی سے جڑے ہوئے ہیں۔ دونوں کی شاعری ہمارے قومی ترانوں کا جزو ہے۔ خواہ وہ ’جن گن من‘ کا قومی گیت ہو یا ’سارے جہاں سے اچھا..‘ جیسا حب الوطنی کا قومی ترانہ، دونوں کی وطن نوازی ہمیں ہر قومی سرگرمی میں اُن کی اہمیت کا احساس کراتی ہے اور اُن کی یاد دلاتی ہے۔

اس علاقائی رشتے کے باوجود اقبال اور ٹیگور دونوں صرف اِس خطے کے نہیں بلکہ پوری دنیا کے شاعر تھے۔ عالمی سطح پر انھوں نے مغرب کی دنیا کو مشرق کی دنیا کے باطن وضمیر سے جس شعوری انداز میں اور جس منظم طریقے سے آگاہ کرایا اس کی کوئی اورمثال مشرق کے کسی ملک کی کسی زبان میں نہیں ملتی۔ تہذیبی، فکری اور روحانی سطحوں پر مشرقیت کی ترجمانی کرنے والا دوسرا ٹیگور اور دوسرا اقبال مشرق کی دنیا میں کہیں نہیں پایا جاتا۔ یہیں سے مشرق کی اِن دو بے مثل شخصیتوں کی عالمی حیثیت اوران کے سخن کی آفاقی اہمیت کا بھی سراغ ملتا ہے، کیونکہ مغربی فکر میں مشینی معیشت کی روشنی اور دماغی فتوحات کی چکا چوند کے ساتھ ساتھ دل کے نہاں خانوں میں جو تاریکیاں پائی جاتی ہیں اور روحانی احساسات کی وادیوں میں جو سنّاٹے سرسراتے ہیں انہیں مشرق سے طلوع ہونے والے یہ دو آفتاب ہی دور کرسکتے ہیں۔ یعنی دوسرے لفظوں میں کہیں تو یہ مشرقی حسیت ہی ہے جو مغربی شعور کو ایک ہمہ جہت عالمی شعور کا رتبہ اور حیثیت عطا کرسکتی ہے۔

ہمارے یہاں ہندوستان میں اقبال اور ٹیگور دونوں کی عظمت کا اعتراف تقریباً سبھی کو ہے لیکن ان سے اختلاف رکھنے والے بھی موجود ہیں۔ علامہ اقبال پر اگر اپنی فکر کو صرف ایک مذہبی نظریے سے وابستہ کرلینے اور صرف اسی مذہب کو اپنے عالمی تصورات کی بنیاد بنانے کا الزام ہے تو ٹیگور کو کچھ لوگ ادب اور آرٹ میں بورژوائیت کے ترجمان کے طور پر دیکھتے ہیں اور ان کے روحانی و مذہبی نظریات وتصورات پر کئی طرح کے سوال اٹھاتے ہیں۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ دونوں ہستیاں اگر آج ہمارے درمیان موجود ہوتیں تو ان سوالات پر ان کا کیا ردعمل ہوتا۔ دونوں عین اس وقت ہمارے بیچ سے اٹھ گئے تھے جب تحریک آزادی رفتہ رفتہ زور پکڑ رہی تھی اور کاروانِ آزادی تیزی سے آگے بڑھنے لگا تھا۔ دو قومی نظریے نے جس طرح ملک کو تقسیم سے دوچار کیا اور ہندوستان کا بٹوارہ جس وحشت اور بربریت کے ساتھ ایک عالمی سانحہ بن کر سامنے آیا اور اس کے بعد مذہب کے نام پر علاحدہ ہوچکے ملک میں خوں ریزی، دہشت گردی اور قتل وغارت گری کے جو لامتناہی سلسلے شروع ہوئے ان پر اقبال کیا کہتے اور ٹیگور کا کیا ردعمل ہوتا، اس کا اندازہ لگانا آسان نہیں۔ البتہ اس کی کوشش ضرور کی جاسکتی ہے۔ زیرنظر شمارے کا خصوصی گوشہ اسی کوشش کا چھوٹا سا حصہ ہے۔

کسی نے کہا ہے کہ ہم سب اپنے ماضی کی پیداوار ہیں، لیکن ہمیں ماضی کا قیدی بن کر نہیں رہنا چاہیے۔ مگر اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ ماضی کو سمجھے اور جانے بغیر حال اور مستقبل کو صحیح معنوں میں بہتر بنانا کسی طور سے ممکن نہیں ہے۔ پیچھے مڑ کر اقبال اور ٹیگور کے فکروفن پر نظر ڈالنے کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ ہم بیتے ہوئے کل کی تصویر دیکھ کر اپنے ذہنوں میں آنے والے کل کا تصوراتی نقشہ اور وژن مرتب کرسکیں۔

آنے والے دنوں میں بھی ہم ’اردو دنیا‘ میں اس طرح کے خصوصی گوشے پیش کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ امید ہے اس بارے میں اپنی رائے سے ضرور آگاہ فرمائیں گے۔

(پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین)

خطوط

آپ کی بات

کرشن بھاوک

A-201، گورونانک، گلی نمبر K-18، پٹیالہ (پنجاب)

اگست کا شمارہ تاریخی دستاویز کے خصائص سے مزین ہے۔ اس میں صدر عالم گوہر صاحب کا مشہور موسیقار خیام صاحب کے ساتھ مشافہہ بے حد معلوماتی ہے۔ ایک بات ملحوظِ خاطر ہے کہ ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی نے اپنی محنت طلب کتاب (ساحر کی محبتیں: ناکام محبت، تجزیاتی مطالعہ) میں خیام صاحب کے جدوجہد والے ایام کی خط کشی کرتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ ”ان ہی دنوں دو فلاپ موسیقار فلم انڈسٹری میں دربدر پھر رہے تھے، شرما جی اور ورما جی۔ ورما جی ناکامی اور پریشانی کے عالم میں لاہور چلے گئے اور رحمن ورما کے نام سے کچھ کامیابی انھیں وہاں ملی۔“ بعدازاں فلم انڈسٹری کی بابت وثوق سے لکھنے کے لیے مقبول عام مصنف جناب اظہر جاوید کا حوالہ دیتے ہوئے ہرگانوی صاحب نے ان کا یہ قابلِ غور اقتباس بھی رقم کیا ہے۔ ”(ڈائریکٹر) رمیش سہگل نے ’پھر صبح ہوگی‘ فلم شروع کی، تو ساحر (لدھیانوی) کی سفارش پر ’شرما جی‘ کو چانس دیا گیا۔ شرما جی کا نیا نام خیام تجویز ہوا۔ کرنا خدا کا کیا ہوا کہ ساحر کے گیتوں نے خیام کی موسیقی کو بھی وہ مقام دیا، کہ وہ راتوں رات بڑے موسیقاروں میں شمار ہونے لگا۔“ (صفحہ 49)

یہاں کسی چیستاں یا معمے کی مانند فقط دو سوال مجھے تنگ کررہے ہیں، اول تو یہ کہ بذاتِ خود ایک مسلم شخص و اصل نام محمد ظہور ہاشمی ہونے کے باوصف خیام صاحب کو عوام ’شرما جی‘ کیوں کہتے تھے؟ کیا جدوجہد کے دنوں میں اپنے برابر کے موسیقار ورما نام کے اتباع پر ہی تو ان کا ہندو نام شرما جی نہیں چلا دیا گیا تھا؟ یہ تو فقط اس خاکسار و ناچیز کا ایک تخمینہ یا قیاس بھر ہے۔ دوسرا سوال ذہن میں یہ ابھرتا ہے کہ خیام نام دھرنے کے مستحق کون تھے ڈائریکٹر رمیش سہگل صاحب یا کہ شاعر ساحر لدھیانوی؟ امید کا پاٹ ساحر کی جانب ہی زیادہ خمیدہ ہوتا لگتا ہے۔ کاش مشافہہ کے موصوف گوہر یا جناب خیام صاحب بجائے خود اس راز کا انکشاف کرنے کی زحمت گوارا کریں، تو میری طرح

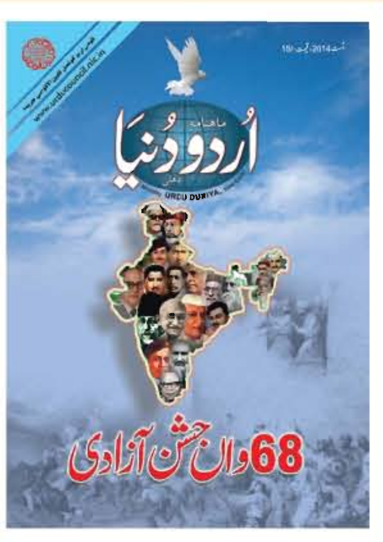

تمام قارئین ان کے شکر گزار رہیں گے۔

اس شمارے کا دوئم مقالہ ظفر سعیدی صاحب کا حاصلِ شمارہ کی حیثیت رکھنے والا ہے اور قارئین اس کی اشاعت کے لیے ادارے کے ازحد ممنون ہیں۔ لارڈ بائرن انگریزی شاعر کی مانند دوسرے شاعر ارنسٹ جونز کے بارے میں چند برس قبل ہندی کے موقر جریدے ’ہنس‘ میں ایک مفصل مضمون شائع ہوا تھا، جس میں ارنسٹ جونز کی 44 صفحات میں مکمل نظم کا بیشتر حصہ محولہ تھا۔ اس کا عنوان تھا ”ہندوستان کی بغاوت یا نئی دنیا۔“

اس میں دلیر جاں باز وحقیقت پسند شاعر نے انگریزوں کی حد درجے کی جہالت کو لاثانی ولافانی شجاعت سے بے نقاب کرتے ہوئے بے پناہ تخیل یا تصور کی بدولت یہ پیشن گوئی کرڈالی تھی کہ اپنی جان کی بازی لگا کر ایک دن ہندوستانی فوج اپنے ملک کو آزاد کرانے کے نصب العین سے بغاوت پر آمادہ ہوجائے گی۔ جونز کو اس نظم کے تحریر کرنے کے بعد کسی سیاسی بنا پر جیل میں ڈال دیا گیا تھا۔

اوّل الذکر مقالے کے آخر میں شہید بھگت سنگھ جی کے خاص رفیق ڈاکٹر بھگوان داس ماہور کی جس بیش قیمت کتاب کا حوالہ دیا گیا ہے، وہ خوش نصیبی سے اس خاکسار کے پاس موجود ہے اور ہندوستان میں جنگِ آزادی کے شہیدوں میں ان کے واحد ادبی ’ڈاکٹر‘ ہونے کا بھی ایک پختہ ثبوت ہے، کیونکہ اسی موضوع پر انھوں نے ہندی زبان میں بہت سال قبل پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی تھی۔ جہاں اس تھیِسس میں برطانوی حکومت میں اس کے آفتاب کے کبھی بھی غروب نہ ہونے کے مروجہ ومحولہ ضرب المثل کا حوالہ درج ہے، وہیں ایک اسکالر کا ایک کمال کا یہ منہ توڑ مقولہ بھی ملحوظِ خاطر کہا جاسکتا ہے کہ ”برطانوی حکومت میں تو آفتاب کبھی طلوع ہوتا ہی نہیں ہے۔“

اسی شمارے میں ذکی انور کا زیرِ عنوان ’چاند نزدیک ہے‘ افسانہ نہایت علامتی و سبق آموز قابلِ تحسین ومدح ہے اور افسانے سے متعلق اختر آزاد کا تجزیہ بھی! ازحد دوراندیش، محتاط، ملتفت اور متنبیّہ ادارے کی محنتوں سے یہ تابندہ و درخشاں مجلہ دنوں دن بتدریج لاانتہا معراجوں پر گامزن ہوتا جا رہا ہے۔ بقول داغ ”اللہ کرے حسنِ رقم اور زیادہ!!“

عبدالحق

2315، ہڈسن لین، کنگس وے کیمپ، دہلی 9

’اردو دنیا‘ کی ترتیب وتزئین اور مواد پر حیرت انگیز خوشی حاصل ہوئی ہے کہ اردو کو اس دورِ پُرآشوب میں ایسے ہی جاں باز جیالوں کی ضرورت ہے۔ تین رسالوں کی بروقت تہذیب وتسوید اور اشاعت پر جاں سوز انہماک دیکھ کر اطمینان ہوتا ہے۔ پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین ترسیل و ترجمانی کے رمز شناس ہیں۔ انھوں نے کونسل کے اشاعتی ادارے کو جو فروغ بخشا ہے وہ بے مثل ہے۔ خاکسار ذاتی طور پر شکرگزار ہے کہ آپ فرمائش کرکے مضمون لکھواتے ہیں۔ فارسی اور اردو کے تعلق پر ناچیز کے ہفوات شائع کرکے آپ نے جو عزت دی ہے وہ میرے لیے سرمایۂ سعادت وشرف ہے۔ تازہ شمارے کی ترتیب وتدوین دیکھ کر مزید خوشی ہوئی۔ یہ مضامین کا ایک مرقع ہے۔ اردو اور ہندوستان سے قطع نظر، پروفیسر محمد ذاکر، عابد سہیل جیسے بزرگوں کے ساتھ جوانانِ ادب بھی ہم سفر ہیں۔ اردو نثر کے بنیادی اسالیب، مولانا جامی احوال وآثار میرے لیے روح

افزا ہیں کیونکہ مولانا جامی کے ایک نادر مخطوطہ (دیوان اوّل) پر راقم ایک زمانے سے ایک تعارفی مضمون قلم بند کرنا چاہتا ہے۔ اب شاید تحریک ملے۔ ندیم صدیقی نے ایک خیال افروز یادنامہ لکھ کر بہت مسرور کیا ہے۔ 14 نومبر 1980 کو ملاقات کے دوران جنرل ضیاء الحق مرحوم نے نوری نستعلیق پر گفتگو کرتے وقت احمد مرزا جمیل صاحب کا تفصیلی تعارف فرمایا تھا۔ ندیم صدیقی صحافیوں میں ذی علم اور صاحبِ قلم صحافی ہیں۔ خمار بارہ بنکوی پر مضمون پڑھ کر پورا منظرنامہ یاد آگیا۔ مشاعروں کا چمکتا ہوا چہرہ بھلا لگا۔ روبرو اور تبصرے بھی خاصے دل کش اور معلوماتی ہیں۔ یہ سب آپ کی جدوجہد کے سنگِ نشاں ہیں۔ منزل تو چرخِ نیلی فام سے بھی آگے ہے۔ اللہ کرے آپ لوگ صحت و عافیت کے ساتھ سلامت رہیں۔ آمین

ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی

(سابق ممبر راجیہ سبھا)

C-501، روز ووڈس اپارٹمنٹس، میوو ہار فیز I، دہلی 91

جولائی 2014 کا اردو دنیا نظر نواز ہوا۔ حسن طباعت اور کتابت کے ساتھ گراں قدر محققانہ اور معلوماتی مضامین سے مزین اس شمارے میں اردو کے بارے میں یہ حقیقت بیان کی گئی ہے کہ وہ ہندوستانی تہذیب کا جیتا جاگتا نمونہ ہے۔ مندرجہ ذیل گراں قدر مضامین نے اردو کی اس امتیازی خصوصیت کو بیان کیا ہے: ہندوستانیت اور اردو، اردو شعری روایات اور ہندوستانی عناصر، اردو اشعار میں ہندوستانیت اور غزل اور ہندوستانی تہذیب۔ اسی کے ساتھ ادبی مباحث کے تحت اقبال کے ہم معنی فارسی اور اردو اشعار، فارسی کے ہندو نامور شعرا، حیات اللہ انصاری: ایک ہمہ جہت شخصیت، مشاہیر ادب کے تحت خمار کی سرور آگیں شاعری بھی قابل مطالعہ مضامین ہیں۔ خمار کے دیوان پر اردو کے جلیل القدر ادیب اور منفرد طرز انشا کے مالک مولانا عبدالماجد دریابادی کی رائے ہے:

”خمار بارہ بنکوی کے دیوان پر دو لفظ

دریاباد، 21 اکتوبر 1972

سالہا سال ہوئے کہ خمار صاحب کا میرا ساتھ محض اتفاق سے ریل میں ہوگیا۔

خمار صاحب نے پہلی شرافت اور خودداری یہ دکھائی کہ اپنا کلام بے تحاشہ سنانا شروع نہیں کیا جیسا کہ آج کل شاعر اپنا کلام سنانے کے لیے بے تاب اور بلبلاتا رہتا ہے۔ لیکن میری فرمائش کے بعد جانِ انتخاب شعر ہے:

جدا ہوئے مجھ سے کوئی جارہا ہے
ازل مل رہی ہے زندگی سے

میں ایسے لطیف اور موثر کلام کا متوقع نہ تھا۔ داد زبان سے کم دی گئی آنکھیں نمی سے بے اختیار ہوگئیں، معلوم ہوا کہ خاص الخاص دل پر چوٹ ماردی۔

وہ دن ہے کہ ان کا کلام کہیں بھی دیکھنے کو مل گیا اس تاثر کو برابر گہرا ہی کرتا گیا۔ ان کے مختصر دیوان آتش نو، 151 صفحات، سہیل بک ڈپو، مچھلی کمان حیدر آباد کی سرسری ورق گردانی کی تو یہ نقش اور بھی قائم بلکہ دائم ہوگیا۔ صفحہ 15 کا مطلع:

ہجر کی رات غمگین فضائیں اف ری محبت ہائے ری جوانی
جینے کے دن مرنے کی دعائیں اف ری محبت ہائے ری جوانی

اور پھر اس کے بعد والا شعر اور اسی طرح صفحہ 114 کا یہ شعر:

میری نظر میں ان کا چہرہ ان کی نظر میں میرا دل
مل گئے تھے رازدار اور رازداں کل رات کو

اسی طرح صفحہ 31 پر:

غم دنیا بہت ایذا رساں ہیں
کہاں ہے غم جاناں کتنا اور ہے

اسی طرح سرسری ورق گردانی میں نظر انداز ہونے کے قابل نہیں۔ اس وقت بیمار ہوں لیکن کلام کی کشش اپنا وقت لیے بغیر نہ ٹلی اور نمونے کے چند چاول بریانی کی پوری دیگ کے اندازے کے لیے کافی ہیں۔“

عبدالماجد دریابادی

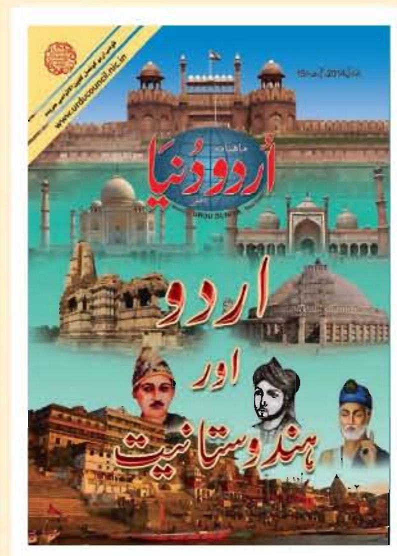

ایم۔ راگھوراؤ

ساؤتھ سول لائنس، چھندواڑا۔ 480001 مدھیہ پردیش

جولائی 2014 کا شمارہ ملا۔ ہندوستانیت کو اردو کے علاوہ کوئی اور زبان بہتر طور پر سمجھ اور سمجھا نہیں سکتی۔

خمار بارہ بنکوی کی شاعری میں بلا کی غنائیت موجود ہے۔ عشق کی معاملہ بندی میں خمار کے یہاں ’اکتاہٹ کہیں نہیں ملتی۔ عشق کی یہی شائستگی انھیں اپنے ہم عصروں میں ممتاز کرتی ہے۔ اردو نثر کا ابتدائی اسلوب فارسی زدہ تھا، نثر نگاروں نے اپنے اپنے مزاج سخن کے اعتبار سے اسالیب اختیار کیے۔ ہندوستان نے کئی تہذیبوں کو پروان چڑھایا۔ مختلف مذاہب کو اپنی آغوش میں سمیٹا۔ مختلف رسم و رواج کی پاسداری کی ہے۔ اسی گنگا جمنی تہذیب سے اردو زبان پیدا ہوتی ہے۔ نظیر اکبر آبادی نے عام آدمی کے جذبوں اور رویوں کی ترجمانی اسی کی زبان میں کر کے اردو شاعری میں ایک روایت کو استحکام بخشنے کی جرأت کی ہے۔

پرویز اشرفی

ڈی 321، دعوت نگر، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی

اُردو دنیا جولائی 2014 کا شمارہ زیر مطالعہ ہے۔ بیشتر مضامین کا مطالعہ کر چکا ہوں۔ اداریہ لاجواب ہے۔ آپ نے بجا فرمایا کہ ”اردو واحد زبان ہے جس نے اس ملک کی شاندار، عظیم اور قدیم تاریخ کے تسلسل کا حصہ بنتے ہوئے اسے ہندوستانیت کا نام دیا ہے۔ اس جغرافیائی خطے کے رسم و رواج، رہن سہن کے طور طریقوں اور فکری زاویوں میں پائے جانے والے اختلافات اور فرق کو کسی گلشن میں پھیلی ہوئی خوش نما رنگارنگی سے تعبیر کیا۔“

نصیر احمد خاں کا انٹرویو پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ ایک سوال کے جواب میں نصیر احمد خاں صاحب نے بالکل درست فرمایا ہے کہ ”ہمارے یہاں ’میں‘ اتنی زیادہ ہے کہ اُس نے ہم اردو والوں کو بھیڑ بکریاں بنا کر رکھ دیا ہے۔ زوال پذیر معاشرے کی یہی علامت ہوتی ہے۔“ آپ نے دوسرے سوال کے جواب میں حقیقت بیان کی ہے کہ ”ہمارے اکثر تحقیقی مقالے حیات اور کارناموں میں اُلجھے رہتے ہیں۔“ آپ نے جس طرح تلفظ اور اِملا کی درستگی پر زور دیا ہے قابل ستائش ہے۔

مظفر حسین سید کا مضمون ’ہندوستانیت اور اردو‘ کے مطالعے نے علم میں اضافہ کیا ہے۔ لفظ ’ہندوستان‘ کی تاریخ پڑھ کر احساس ہوا کہ ابھی بہت کچھ پڑھنا باقی ہے۔ اس کے علاوہ شائستہ فاخری کا مضمون اپنی تمام تمثیل کے ساتھ مکمل ہے۔ شاداب عالم مبارکباد کے مستحق ہیں کہ اُنھوں نے ہندوستانی عناصر اور اردو شعری روایات پر خوبصورت مضمون پڑھنے کا موقع دیا۔

شخصیات کے کالم میں ٹیپو سلطان، حیات اللہ انصاری اور مولانا جامی احوال و آثار بہترین مضامین ہیں۔ تاریخ و ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے نہایت مفید ہے۔

’حصول آزادی کے لیے پہلی جدوجہد‘ پڑھ کر ’جنگ آزادی‘ کی ایک الگ تصویر آنکھوں میں اُبھری۔ اس موضوع پر جتنا زیادہ مطالعہ کرتا ہوں ہر بار نئے نئے تحقیقی پہلو سامنے آتے ہیں۔ آخر میں اس نتیجے پر پہنچتا ہوں کہ آخر ہم سے کہاں پر غلطی ہوگئی کہ نہ صرف ہماری حکومت بھی چلی گئی بلکہ ہمارا وقار و دبدبہ بھی جاتا رہا۔ اگر ہم جان لارینس John Lawrence کی بات پر یقین کرلیں تو کیا واقعی ہمارے پاس اُس وقت کوئی باصلاحیت قائد نہیں تھا؟

رمیز طلحہ دانی

روم نمبر 202، بوائز ہاسٹل-1، مانو کیمپس، حیدرآباد

’اردو دنیا‘ رسالہ جولائی 2014 کے شمارے میں تمام مضامین بے حد موثر و جاذبِ نظر بہترین ڈیزائن کے ساتھ شائع ہوئے ہیں۔ صرف تصویر سے بھی مضمون کی اہمیت و افادیت کا قاری کو اندازہ ہوجاتا ہے۔ یہ شمارہ ’اردو اور ہندوستانیت‘ پر مبنی اپنے آپ میں ایک مختصر encyclopedia ہے۔ جاں نثار معین کا مضمون ’کتب بینی کا تحقیقی جائزہ‘ بھی عمدہ اور معلوماتی مضمون ہے۔ کتب بینی سے ہی انسان کی علمی، ادبی، اخلاقی تربیت ہوتی ہے۔

شاد سجاد

استادِ اردو ڈگری کالج پلوامہ کشمیر

ماہنامہ ’اردو دنیا‘ نہ صرف میرے قلب وجگر کو مسرت عطا کرتا ہے بلکہ میری صلاحیتوں کو نکھارنے میں اس اثر انگیز رسالے کا رول پچھلے پانچ سالوں سے اہم رہا ہے۔ جولائی 2014 کے رسالے کا سرورق صحیح معنوں میں گنگا جمنی تہذیب کی بھرپور عکاسی کرنے میں کامیاب رہا ہے اس سلسلے میں پروفیسر خواجہ اکرام الدین نے ہماری بات میں کیا خوب کہا ہے کہ ہندوستان مختلف تہذیبوں کا مسکن رہا ہے... اور یہی رواداری اردو کے ڈی این اے میں بھی شامل ہے۔ باقی دیگر مضامین خصوصاً اردو میں ’ہندوستانیت کا مصور شاعر نظیر اکبر آبادی: محمد ذاکر‘ نہایت سنجیدہ اور معلوماتی تھا۔

پروفیسر جمال نصرت

روشنی، 509/148، اولڈ حیدر آباد، لکھنؤ

آپ نے اردو دنیا کا بیمار بنا دیا ہے۔ میری بھی گزارش تھی کہ گزشتہ وقتوں کی ہستیوں پر مضامین شامل کیے جائیں۔ اس (مراسلہ) کو آپ نے شامل بھی کیا تھا اور اس پر باقاعدہ عمل بھی شروع ہوچکا ہے۔ حیات اللہ صاحب اور خمار صاحب دونوں پر جولائی 2014 میں مضامین بہت خوب ہیں۔ عابد سہیل صاحب نے بہت خوب لکھا ہے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کو بھی پراثر بنا دیا ہے۔ اسی طرح وسیم کارنجوی صاحب نے بھی بہت اچھے انداز میں خمار صاحب کے حالات بیان کیے ہیں۔

زبیر شاداب

قومی آزمائشی خدمات، ہند، سی آئی آئی ایل، میسور

’اردو دنیا‘ جولائی 2014 کا شمارہ پڑھتے وقت بارہا محسوس ہوا کہ اس رسالے پر کچھ اظہارِ خیال کیا جائے۔

اس برس سے ’اردو دنیا‘ کی دیدہ زیبی لائق رشک ہوگئی ہے۔ ہر ایک شمارے کا تقریباً نصف حصہ تخصیصی مطالعے پر مشتمل ہوتا ہے جس سے یہ رسالہ حوالہ جاتی ہوتا جارہا ہے۔ اردو- ہندی، اردو رسائل و جرائد و طباعت، خواجہ احمد عباس، غلام ربانی تاباں، امیر خسرو اور یوم اردو، اردو اور ہندستانیت پر مخصوص مضامین اس کے بین ثبوت ہیں۔ مخصوص موضوعات پر مضامین کا یہ سلسلہ جاری و ساری رہنا چاہیے تاکہ ایک ہی موضوع پر مختلف نوعیت کے خیالات سے ایک ہی شمارے سے واقفیت حاصل کی جاسکے۔

جولائی کے شمارے میں اردو اور ہندستانیت پر سبھی مضامین مختلف اصناف و ابعار کا احاطہ کرنے میں کامیاب ہیں۔ جناب مظفر حسین سید صاحب نے بڑی محنت سے اپنا مضمون مکمل کیا ہے۔ موصوف نے لفظ ’ہندستان‘ کے وجود پر جو قیاس پیش کیا ہے کہ ”جب عرب اس سرزمین پر شمال مغرب کی سمت سے وارد ہوئے اور دریائے سندھ کے کنارے خیمہ زن ہوئے تو انھوں نے لفظ ’سندھو‘ کو اپنی سہولت ادائی کے لیے بدل کر ’ہندو‘ کردیا اور یہاں کے باشندوں کے لیے یہی نام تجویز کردیا... شاید اس صراحت کی ضرورت نہیں کہ لفظ ’ہندوستان‘ بہ نفسِ نفیس (رسالے میں دونوں مرتبہ نفیس شائع ہوا ہے) فارسی الاصل ہے۔“ (صفحہ 12) اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا دریائے سِندھ کے کنارے خیمہ زن عربوں کی زبان فارسی تھی؟ دوسری بات یہ کہ عرب لفظ ’سِندھ‘ کو ’سِند‘ تو بول سکتے تھے بلکہ بولتے ہیں لیکن ’س‘ کی جگہ ’ہ‘ کی صوتی تقلیب (Phonetic Transformation) کا جواز عقل سے پرے ہے۔ دراصل یہ لسانی بدعت ہندی علما بھارتیندو ہریش چندر، لچھمن سنگھ، راہل سانکرتائن، رام چندر شکل اور ان کی تقلید میں بھولا ناتھ تیواری اور اودے نرائن تیواری وغیرہ کی غلط بیانی کے مطالعے کا نتیجہ ہے۔ عربی، فارسی میں ’س‘ اور اس کی ہم صوت مماثلت ’ص‘ اور ’ث‘ کی آوازیں موجود ہیں، ہائے حطی اور ہوز موجود ہیں تو ’ہ‘ کو ’س‘ سے بدلنے کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ یہ معرب و مفرس لفظ ہے اور اس کا منبع ’سندھ‘ قطعی نہیں ہے۔ سِندھ آج بھی سِندھ ہے اور ہند اب بھی ہند ہے۔ یاد رہے کہ جب کسی زبان کے لفظ میں استعمال ہونے والی کوئی ’صوت‘ دوسری زبان میں ناپید ہوتی ہے تو اس کی جگہ قریب المخرج صوت کا استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً تمل میں ’ہ‘ کی آواز نہیں ہے لہٰذا اس کی جگہ ’گ‘ کا استعمال ہوتا ہے، یعنی ’نہانا‘ کو ’نگانا‘ کہتے ہیں۔ اسی طرح عربی میں ’گ‘ کی جگہ ’ج‘ کا استعمال ہوتا ہے مثلاً عربی بولنے والا ’گیلانی‘ کو ’جیلانی‘ کہتا ہے۔

ایک اور بات یہ کہ صفحہ 14 پر مظفر حسین سید صاحب نے لکھا ہے کہ ”ایک ستم ظریفی یہ ہوئی کہ اردو کو ایک غیر ہندستانی نام (اصلاً ترکی الاصل) تفویض کردیا گیا۔“ جنابِ عالی اس لحاظ سے تو ’ہندستانی‘ بھی ایک غیر ہندستانی نام (اصلاً عربی الاصل) ہوتا۔

’اردو شاعری میں جھلکتا ہندوستان‘ کے عنوان سے محترمہ شائستہ فاخری صاحبہ کا مضمون بہت اچھا ہے لیکن ایک مقام پر محسوس ہوا کہ انھوں نے جو کچھ نظیر اکبر آبادی کے متعلق لکھنا چاہا تھا وہ امیر خسرو کے متعلق لکھ گئیں ہیں۔ مثلاً ”امیر خسرو کی تصانیف میں ہندوستانی تہذیب و فلسفہ، یہاں کا قدرتی اور جغرافیائی حسن، گاؤں دیہات کے مناظر، علاقائی بولی ٹھولی، رسم و رواج کی بھرپور عکاسی ملتی ہے۔ اس سے قبل حب الوطنی کا تصور اردو شاعری سے ناپید تھا۔“ جناب عالی خسرو سے قبل اردو شاعری میں حب الوطنی کا تصور تو درکنار، کیا ہم خسرو سے قبل اردو شاعری کا تصور بھی کرسکتے ہیں؟ شاداب عالم اور راشد انور راشد صاحبان کے مضامین معلوماتی ہیں، خلیق الزماں نصرت صاحب نے اپنے مضمون کی شروعات زبانوں کی اقسام سے کرتے ہوئے سنسکرت کو بھی آسمانی زبانوں میں شمار کیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ سنسکرت ’دیو وانی‘ کہی جاتی ہے لیکن اس زبان میں کوئی آسمانی کتاب نازل نہیں ہوئی ہے۔ نورالحسنین صاحب نے اردو افسانے میں ہندستانیت تلاش کرنے کی کوشش کی ہے اس موقعے پر اگر انھوں نے راجندر سنگھ بیدی، قاضی عبدالستار، سید محمد اشرف اور طارق چھتاری کے افسانوں کا محاکمہ کردیا ہوتا تو تشنگی کا احساس ختم ہوجاتا۔ عبدالحق، عابد سہیل، عبدلقادر، عبداللہ انصاری، ساجد حسین اور وسیم فرحت کارنجوی صاحبان کے مضامین فاضلانہ ہیں۔

کارنجوی صاحب نے خمار صاحب اور محمد فیروز دہلوی صاحب نے سید ضمیر حسن دہلوی صاحب کی یادیں تازہ کرادیں، اردو دنیا نے خمار صاحب کے کلام کا انتخاب شائع کر کے ان کے چاہنے والوں کو ایک حسین تحفہ دیا ہے۔ سید ضمیر حسن دہلوی صاحب دہلوی تہذیب کے تابندہ ستارہ

تھے۔ 'دہلوی اردو پر' ان کی کتاب ہمیشہ قابلِ مطالعہ رہے گی۔ 'اردو دنیا' نے صحیح معنی میں عالمی معیار قائم کرلیا ہے۔

سلمان جونپوری

23، اقراڈ پلیکس، احمد آباد

'اردو دنیا' کا جولائی کا شمارہ موصول ہوا۔ اس رسالے کا ہر شمارہ آپ اپنا جواب ہوتا ہے اور اپنے سابقہ شماروں سے بہتر ہوتا ہے۔ ٹیپو سلطان پر ساجد حسین کی تحریر کافی معیاری اور دلچسپ ہے جس کے مطالعے سے ٹیپو سلطان سے متعلق نئی معلومات فراہم ہوتی ہیں۔ کوراسٹوری کے مشمولات بھی انفرادی نوعیت کے حامل ہے۔ 'اردو دنیا' کا یہ شمارہ دستاویزی شمارے کی حیثیت رکھتا ہے۔

ڈاکٹر حیات افتخار

سابق ایسوسی ایٹ، پروفیسر اور صدر شعبہ اردو، قائد ملت کالج ،میڈاواکم، چینئی

ماہانہ 'اردو دنیا' اسم بامسمیٰ ہے۔ اس کا مطالعہ ہماری ادبی تشنگی کو دور کرتا اور اردو دنیا کی تقریباً تمام ادبی و علمی سرگرمیوں سے ہمیں مطلع کرتا ہے۔ حالیہ شمارہ بابت جولائی 2014 میں 'اردو اور ہندوستانیت' کے موضوع پر مضامین دلچسپ اور معلوماتی ہیں۔ یہ موضوع اتنا وسیع اور ہمہ گیر ہے کہ 'سفینہ چاہیے اس بحر بیکراں کے لیے'۔ اردو کے ممتاز محقق اور نقاد نصیر احمد خان نے انٹرویو میں جو باتیں کہی ہیں وہ اردو دانشور طبقے کے لیے دعوتِ فکر اور عمل کا تقاضا کرتی ہیں مثلاً تحقیق و تنقید کے معیار کو بلند اور اس کی زبان کے معیار کا تعین کرنا اور اردو زبان کے تلفظ اور املا کے مسئلے کو حل کرنے کے لیے اقدامات اٹھانا وغیرہ۔

مصطفیٰ ندیم خاں غوری

زرینہ منزل، ورنداون کالونی، قدیم جالنہ، ضلع جالنہ (مہاراشٹر)

'اردو دنیا' برائے جون و جولائی 2014 یکے بعد دیگرے موصول ہوئے۔ یعنی جون کا شمارہ غیر معمولی تاخیر سے پہنچا۔ جون 2014 کے شمارے میں پروفیسر عتیق اللہ تابش سے لیا گیا ڈاکٹر عبدالحی کا انٹرویو حقائق کا آئینہ دار ہے۔ علمی و عملی معلومات کے ان دفتروں کا حصول بنالا جواب سوالوں کے ممکن نہ تھا۔ شاہد انصاری نے بھی پر از معلومات انٹرویو پیش کیا ہے۔ گوشۂ خواجہ احمد عباس نے یہ سبق دیا ہے کہ انسان کو انتھک محنت سے کبھی ہاتھ نہیں کھینچنا چاہیے۔ اس ضمن میں نصرت ظہیر کی تحریر لاجواب ہے لگتا ہے کہ موصوف نے اسے ایک ہی نشست میں قلم برداشتہ سپردِ قلم کیا ہے۔ جولائی 2014 کے شمارے کی کوراسٹوریز بے حد معلوماتی ہیں۔ خصوصاً محمد ذاکر اور نورالحسنین کی نگارشات نہایت عمدہ ہیں۔ متذکرہ شماروں کے باقی مشمولات بڑے افادیت کے حامل ہیں۔

ڈاکٹر عظیم راہی

گھر نمبر 4-11-44/279، نزد مدینہ مسجد، کریم گنج، اورنگ آباد

'اردو دنیا' نہایت دیدہ زیب، جاذب نظر ہونے کے ساتھ، بے حد معیاری اور عمدہ نگارشات سے مزین اردو کے ایک منفرد رسالے کی حیثیت سے بہت مقبول ہوگیا ہے یعنی صوری اور معنوی دونوں اعتبار سے ممتاز حیثیت کا حامل ہے۔ سونے پہ سہاگہ نت نئے موضوعات اور مختلف اہم شخصیات پر خصوصی گوشے ترتیب دے کر آپ نے پرچے کی دلکشی میں مزید اضافہ کیا ہے۔ جون کے شمارے میں خواجہ احمد عباس کا گوشہ ان کے شایان شان تو نہیں مگر حق بہ حق دار کا حق ضرور ادا کرتا ہے۔ فکشن، فلم اور صحافت کے اس تکون فنکار کی صد سالہ پیدائش کے موقعے پر، بروقت یہ اہم گوشہ ترتیب دے کر آپ نے ادبی دیانت داری کا ثبوت دیا ہے۔ واقعی آپ نے اہم فنکاروں کے اعترافِ خدمات کا اہتمام بھی خوب کیا ہے۔

محترم عتیق اللہ صاحب کا انٹرویو بے حد پسند آیا جو معلوماتی ہونے کے ساتھ اردو کے تنقیدی و تحقیقی رویوں پر بڑے منفرد انداز میں روشنی ڈالتا ہے۔ وہیں انھوں نے اورنگ آباد شہر سے اپنی گہری وابستگی اور تعلق خاص کو جس محبت کے ساتھ بیان کیا ہے وہ ان کا ہی حصہ ہے۔ ویسے بھی محترم خلوص و محبت کے پیکر ہیں۔ نرم مزاج اور اپنے چھوٹوں کو بڑی محبتوں سے نوازتے ہیں۔

عابد علی خاں

مالیر کوٹلہ، پنجاب

'اردو دنیا' 2014 کا شمارہ 'خواجہ احمد عباس شخصیت اور فن' بہت پسند آیا۔ اس گوشے سے خواجہ صاحب کے بارے میں بہت سی نئی باتوں کا علم ہوا اور ساتھ ہی اپنا لکھا مقالہ 'پریم وار برٹنی اپنے شعری مجموعوں کے آئینے میں' دیکھ کر بھی بہت خوشی ہوئی جسے بہت سے قارئین نے بھی پسند کیا اور برابر فون بھی آتے رہے۔ شہر مالیر کوٹلہ کے دانشوروں نے بھی اسے خوب پسند کیا۔ اس مضمون کے حوالے سے جولائی 2014 کے شمارے میں ایک بزرگ افسانہ نگار کا خط شائع ہوا ہے جسے پڑھ کر بہت تعجب ہوا کہ قبلہ کا کہنا ہے کہ میں نے یہ مضمون لکھ کر پریم صاحب کا تمسخر اڑایا ہے۔ انھیں اس بات پر بھی اعتراض ہے کہ میں نے معتبر ادبا اور اشعرا کے حوالے، کتابیات، حواشی اور پریم صاحب کے اشعار اس مضمون میں کیوں شامل کیے ہیں۔ جبکہ مضمون شائع ہونے کے بعد پریم وار برٹنی صاحب کے کئی دوستوں اور فیملی ممبران نے بھی اسے بے حد پسند کیا۔ یہ مقالہ پریم وار برٹنی کے شعری مجموعوں کی روشنی میں لکھا گیا ہے نہ کہ ان کی ذاتی زندگی یا افسانہ نگاری پر۔ اس میں یہ باتیں لکھنا ضروری نہیں ہیں کہ وہ دھرمیندر، مینا کماری اور سوہن راہی کو بھی جانتے تھے، فلاں فلاں رسالے میں ان کے افسانے چھپے اور بلانوشی کے بھی عادی تھے۔ جولائی 2014 کے شمارے میں اردو شاعری اور نثر میں ہندوستانی رنگ پر بہت سے مضامین پڑھنے کو ملے اور پسند بھی آئے۔ خاص طور پر نورالحسنین صاحب کا مضمون 'اردو افسانہ میں ہندوستانیت' بے حد پسند آیا۔ موصوف نے مختلف حوالوں کے ساتھ بڑی خوبصورتی سے اردو افسانے میں ہندوستانی زندگی کے رنگ پیش کیے ہیں۔ اس کے علاوہ دیگر مضامین بھی قابلِ تعریف ہیں۔

شکیل سہسرامی

یو ایس بی ایل سی، پٹنہ

'اردو دنیا' پر نظر پڑتے ہی دل کھل اٹھتا ہے۔ اردو دنیا ایک عالمی شہرت یافتہ رسالہ ہے۔ آج سے کچھ ماہ قبل اس میں معلوماتی مضامین زیادہ ہوا کرتے تھے۔ کریئر گائڈنس سے متعلق ایک دو مضامین ضرور رہا کرتے تھے۔ عام رسالوں کی طرح ادبی مضامین اس میں کم از کم ہوا کرتے تھے جس کی ان دنوں بہتات نظر آتی ہے۔ اس سے بقدر ضرورت گریز لازمی ہے۔ اردو کے معمر اور بزرگ اساتذہ کا انٹرویو شائع کیا جائے جس میں اردو کی تعلیم و تدریس، اردو زبان و ادب کے درپیش مسائل اور ان کے تدارک پر گفتگو کی جائے۔ جہاں تک تواریخی مضامین کا سوال ہے تو کچھ نئی باتیں ماہرین تاریخ کے قلم سے سامنے آنی چاہئیں جن کی انفرادیت بہر صورت قائم رہے۔ لسانیات سے متعلق ایک دو مضامین ضرور شائع کریں۔ کسی بھی زبان کی بنیاد کا استحکام لسانی قواعد کی صحت پر منحصر کرتا ہے۔

احترام اسلام

635/547، اَترسوئیا، الہ آباد

مؤقر ماہنامہ 'اردو دنیا' کا شمارہ جون 2014 پیش نظر ہے۔ 'ہماری بات' کے تحت آپ کا یہ بیان پڑھ کر بہت خوشی ہوگئی کہ 'اردو دنیا' ہندوستان میں سب سے زیادہ پڑھا اور خریدا جانے والا ادبی و سماجی اردو رسالہ بن چکا ہے۔ رسالہ جس قدر دیدہ زیب ہے اور جس طرح کے رنگا رنگ مضامین اس کے جلو میں نظر آتے ہیں، اس کے پیشِ نظر اس کی یہ کامرانی بعید از قیاس ہرگز نہیں لگتی۔ خواجہ احمد عباس کے لیے کل ملا کر 24 صفحات پر مشتمل گوشے کا

حامل ہونے کے باوجود شمارہ دستاویزی حیثیت کا ہوگیا ہے۔ گوشے سے گزر کر کوئی بھی قاری خواجہ احمد عباس کو جاننے کا دعویٰ آسانی سے کرسکتا ہے۔

گوشۂ عباس سے ہٹ کر جس تحریر نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ ہے پروفیسر عتیق اللہ سے کیا گیا عبدالحی کا انٹرویو۔ پروفیسر عتیق اللہ نے ڈنکے کی چوٹ پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ تلخ و ترش سچائیوں پر برملا زبان کھولی ہے۔ ایسا کم لوگ کرپاتے ہیں۔ عام طور پر لاگ لپیٹ کے ساتھ ہی باتیں کی جاتی ہیں۔ جی چاہتا ہے کہ ان کے کچھ جملے دہرادیے جائیں۔

"ہماری یونیورسٹی کے اساتذہ کا ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھیں تنقید کے نام پر لفاظی کا فن خوب آتا ہے۔"

"بڑے تلخ و شیریں زمانے دیکھے۔ اس عزت سے ہمیشہ بچتا رہا جو بڑی ذلتوں کے بعد میسر آتی ہے۔"

"پوری برہنگی میں وہ کشش نہیں ہوتی جو چاک سے جھلک مارنے والا حصہ فراہم کرتا ہے۔"

"بے حد بری اور پھسپھسی شاعری سے بازار گرم ہے۔ اس کی داد دینے والوں کی بھی کمی نہیں۔"

ایک عام لیکن اہم بات اور۔ کچھ الفاظ اپنی غلط ہجے اور غلط معنی کے ساتھ ہمارے ذہنوں میں نقش ہوکر پتھر کی لکیر بن جاتے ہیں۔ ہندی زبان میں یہ بیماری عام ہے وہاں اردو کے چند الفاظ کا حلیہ بگاڑ کر ہی استعمال کرنے کو لیاقت کا اظہار سمجھا جاتا ہے۔ تبھی تو اچھا خاصا لفظ 'خلافت' 'مخالفت' کی جگہ استعمال ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ بیشتر ہندی داں 'بیش قیمت' کو 'بیش قیمتی' بولتے اور لکھتے ہیں۔ لیکن جب کوئی اردو داں وہ بھی یونیورسٹی کے پروفیسر کی حیثیت رکھنے والا 'بیش قیمتی' بولتا اور لکھتا ہے تو مزاج پر فطری طور پر گراں گزرتا ہے۔ میں نے کئی پروفیسر حضرات کو 'بیش قیمتی' بولتے اور لکھتے دیکھا ہے۔ وجہ یہی ہے کہ ایک غلط لفظ صحیح بن کر ذہن پر ایسا چھا جاتا ہے کہ ہم اسے غلط شکل میں ہی استعمال کرتے رہتے ہیں۔ پروفیسر عتیق اللہ بھی ایک لفظ 'پروا' کو 'پرواہ' مان بیٹھے ہیں شاید۔ اپنے انٹرویو میں انھوں نے کہا یا لکھا ہے "حالی اور غالب بھی اپنے عہد کے عمومی مذاق سے بے پرواہ تھے۔ ممکن ہے یہ کسی اور کے قلم کا سہو ہو یا پھر پروف کی غلطی لیکن 'پروا' کی جگہ 'پرواہ' کا استعمال اکثر دیکھنے کو ملتا ہے جیسے کہ 'خرد' کی جگہ 'خورد' کا۔ شمارے میں شامل دیگر مضامین عمدہ ہیں اور معلومات میں اضافہ کرتے ہیں۔

شرافت حسین

ایڈیٹر 'وقارِ ادب' ٹانڈہ، امبیڈکر نگر، یوپی

'اردو دنیا' شمارہ جون ملا۔ سرورق پر خواجہ احمد عباس کی تصویر دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی۔ اس عظیم فنکار پر گوشہ شائع کرکے آپ نے نہ صرف ان کی شخصیت اور فن سے روشناس کرایا ہے بلکہ اردو زبان کے قارئین و ریسرچ اسکالروں پر احسان کیا ہے۔ نئے لکھنے والوں کو یقینا روشنی ملے گی۔ اردو کے تمام شرکا کو مبارکباد پیش کرتا ہوں کہ اسے سجانے سنوارنے میں انتھک کوشش کررہے ہیں۔

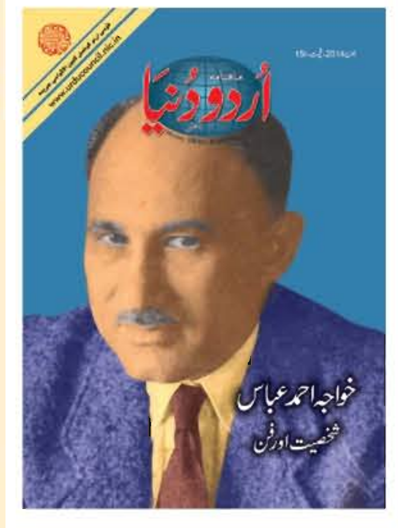

نسیم سحر

کولی واڑہ، وسئی تھانہ، ممبئی

'اردو دنیا' کا تازہ شمارہ قومی یکجہتی کے تعلق سے اپنے سابقہ شمارے پر سبقت لے گیا۔ ڈھیر ساری معلومات لیے خلیق الزماں نصرت صاحب کا مضمون بے حد معیاری ہے۔ اردو شاعری میں ہندوستان کافی جاندار مضمون ہے۔ ہماری معلومات میں چونکا دینے والا اضافہ یہ بھی ہے کہ نہرو جی کی مادری زبان کے کالم میں ہندی اور اردو دونوں زبان ہے۔

طاہر ہاشمی

پرنسپل (ریٹائرڈ) بلند شہر یوپی

'اردو دنیا' شمارہ مئی 2014 کے 'خبرنامے' کا مطالعہ کرتے وقت ایک اہم خبر 'شاہ ولی اللہ لائبریری کی حالت زار' نظر سے گزری جس میں لائبریری کے صدر جناب محمد نعیم نے لائبریری کی زبوں حالی کا بڑی تفصیل سے ذکر کیا ہے اور یہ بھی بتایا کہ وہ اس (لائبریری) کی بقا کے لیے کافی دنوں سے کوشاں ہیں جو قابلِ ستائش ہے۔ ان شاء اللہ وہ ضرور اس لائبریری کے قیمتی قومی سرمایے کو جو اردو فارسی زبانوں میں محفوظ ہیں مناسب مقام حاصل کرائیں گے۔

اراضی الاٹ کرانے کے علاوہ اِس وقت بہت ضروری ہے کہ کتابوں کو دیمک، نمی وغیرہ سے محفوظ کرلیا جائے اس کے لیے ناچیز کا مشورہ ہے کہ جناب صدر اور سکریٹری صاحبان رامپور رضا لائبریری کے ایک سرکاری شعبے کے انچارج جناب سید طارق اظہر سے رابطہ کرکے اُن سے اس سلسلے میں مزید معلومات حاصل کریں۔ یہ شعبہ Conservation کہلاتا ہے اس کا کام یہی ہے کہ بوسیدہ پرانے مخطوطات کو محفوظ کرنا۔ اس کے لیے وہ وقتاً فوقتاً سیمینار بھی کرتے رہتے ہیں۔

سید جاوید علی آغاز

تیجاس اپارٹمنٹس، بھوانی نگر، ناسک

میں نے ایک عرصہ قبل کسی رسالے میں یہ جملہ پڑھا تھا کہ "جب آپ کھانا مانگ کر نہیں کھاتے تو کتابیں مانگ کر کیوں پڑھتے ہیں۔" بس اسی زمانے سے میں رسالے اور اخبارات خرید کر پڑھنے کا عادی ہوگیا اور سمجھنے لگا کہ اردو کی ترقی اور فروغ کے لیے کتابیں خرید کر پڑھنا زیادہ بہتر ہے۔ اپریل اور مئی کے اداریے اسی بات کو واضح کرتے ہیں۔ یہ بات درست ہے کہ انٹرنیٹ سے ہمیں بہت سی سہولیات دستیاب ہیں، اخبارات اور رسالے پڑھنے کو مل رہے ہیں۔ چھپی ہوئی کتابوں کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔

شفیق الرحمن صدیقی

پورہ معروف، ضلع مئو، یوپی

'اردو دنیا' اپریل کا تازہ شمارہ اپنے جلو میں بیش بہا مضامین لے کر حاضر ہوا۔ عمدہ ٹائٹل اچھا ورق اور معیاری کتابت و طباعت نے اس کو بے حد دلکش بنا دیا ہے۔ ابھی تک پورا رسالہ نہیں پڑھ سکا۔ صرف مضامین پر سرسری نگاہ ڈالی ہے۔ ہاں ایک مضمون 'رسالوں کی دنیا' سہیل انجم بغور پڑا۔ اس مضمون میں بہت کچھ کمیاں اور خامیاں رہ گئی ہیں یقین نہیں ہوتا کہ رسالوں کے متعلق اتنی بھرپور معلومات رکھنے والا سینئر صحافی اتنی بڑی غلطی کرے گا۔ میں ان رسالوں کے نام لکھنا چاہتا ہوں جو موصوف کی روشن نگاہوں سے بچ کر نکل گئے اور وہ رسالے موصوف کی نگاہوں میں کچھ وقعت حاصل نہ کرسکے۔

خاتون مشرق، بچوں کا ماہنامہ ہلال، حسنات رامپور، المفتاح، ضلع مئو، دین و دنیا دہلی، مولوی دلی، مظاہر علوم سہارنپور، ندائے شاہی مرادآباد، پاکیزہ آنچل دہلی، ہما دہلی، مفتاح، مظاہر علوم، اور نداء شاہی کو چھوڑ کر بقیہ سارے رسالے اردو زبان و ادب اور تہذیب و ثقافت کے میدان میں جو نمایاں خدمات انجام دے رہے ہیں انھیں نظر انداز کرنا نہ صرف احسان فراموشی بلکہ ایک طرح کی صحافتی بد دیانتی ہے۔ ■

محمد عارف اقبال

اردو والے اپنے بچوں کو اردو نہیں پڑھاتے!

ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی

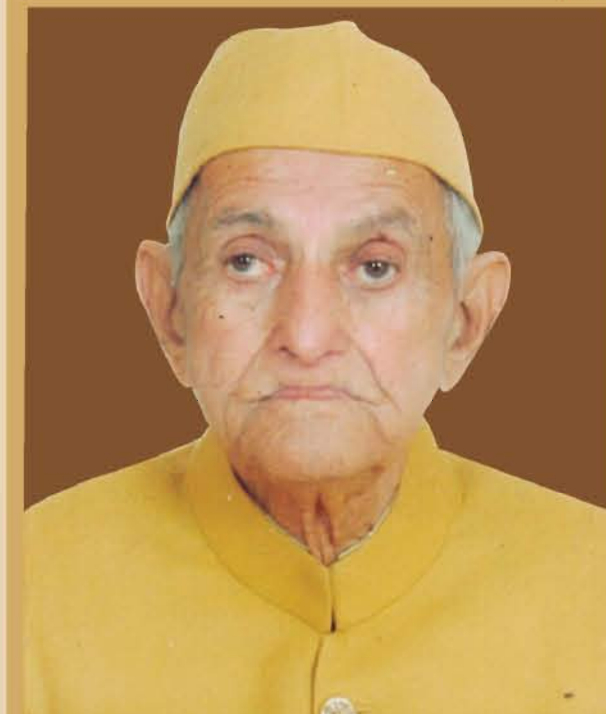

ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی صاحب (پ: 31 مارچ 1921) کی بزرگ، شفیق اور محترم شخصیت تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ ڈاکٹر قدوائی صاحب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں تقریباً 34 برس (اکتوبر 1948 سے مئی 1982 تک) شعبہ سیاسیات سے وابستہ رہے اور 1982 میں ریڈر کی حیثیت سے سبکدوش ہوئے۔ 1984 سے 1990 تک راجیہ سبھا کے فعال اور سرگرم ممبر رہے۔ قدوائی صاحب کا شمار ان نامور شخصیتوں میں ہوتا ہے جنھوں نے اپنی عمر کا زرّیں دَور تحریک آزادی کی جدوجہد میں گزارا۔ ہندوستان کو جس وقت انگریزوں کی غلامی سے آزادی ملی، ڈاکٹر قدوائی صاحب 26 برس کے پختہ اور تجربہ کار نوجوان تھے۔ وہ مسلم یونیورسٹی میں ایک شفیق اور مثالی استاد رہے۔ ان کے روابط جن اہم شخصیات سے رہے، ان میں معروف مجاہد آزادی رفیع احمد قدوائی، مولانا حفظ الرحمن، ڈاکٹر سیّد محمود، فیروز گاندھی، لال بہادر شاستری، اندرا گاندھی اور راجیو گاندھی خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ ڈاکٹر قدوائی کا ایک بڑا وصف یہ ہے کہ وہ اردو رسائل و اخبارات پر گہری نظر رکھتے ہیں اور علمی، تاریخی اور مذہبی امور میں کسی غلطی یا تسامح کو نظر انداز نہیں کرتے اور دیانت داری کے ساتھ اس کی نشاندہی کرنا اپنا علمی فریضہ سمجھتے ہیں۔ حال ہی میں اردو دنیا کے لیے محمد عارف اقبال نے ان سے جو انٹرویو کیا اس کے چند اقتباس پیش ہیں:

محمد عارف اقبال: سب سے پہلے اپنے خاندان اور ابتدائی حالات کے بارے میں ہمیں کچھ بتائیں۔

ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی: میں دریاباد ضلع بارہ بنکی کے ایک نامور قدوائی خاندان میں پیدا ہوا۔ ہم قدوائیوں کے مورث اعلیٰ قاضی معزالدین جن کا وطن مالوف اناطولیہ یا ایشیا کوچک میں تھا، وہ نسلاً اسرائیلی تھے ان کا سلسلۂ نسب حضرت ہارون علیہ السلام سے ہوتا ہوا لاوی بن حضرت یعقوب علیہ السلام سے ملتا ہے۔ قاضی صاحب علم و فضل میں امتیازی پوزیشن کے مالک تھے اس لیے وہ 'قدوۃ العلم والدین' کے لقب سے نوازے گئے۔ وہ شہاب الدین غوری کے زمانے میں ہندوستان تشریف لائے اور قاضی القضاۃ کے جلیل القدر عہدے پر مقرر کیے گئے۔ وہ اجودھیا میں مقیم ہوئے اور وہیں مدفون ہوئے۔ بابری مسجد کی شہادت کے بعد ان کا مزار بھی قبرستان کے ساتھ شہید کر دیا گیا۔ ان کی اولاد مسولی، بڑاگاؤں، سترکھ، بھیارا، دریاباد، ضلع فیض آباد، اُناؤ اور جکور ضلع لکھنؤ میں آباد ہوئی۔ ان کی دسویں پشت میں ایک بزرگ مخدوم محمد شیخ آبکش پیدا ہوئے۔ وہ محمود آباد ضلع بارہ بنکی میں رہتے تھے اور شیخ طریقت تھے۔ ان کا خاص مجاہدہ مسافروں کو پانی پلانا تھا اس لیے وہ مخدوم آبکش کہلائے۔ ان کے ایک مرید دریا خاں دریاباد کے چکلے دار تھے جنھوں نے دریاباد میں سکونت اختیار کی۔ ان کی گیارہویں پشت میں ایک صاحب شیخ مخدوم بخش تھے جن کے چار صاحبزادے تھے۔ سب سے بڑے حکیم نور کریم جو نہ صرف عالم دین بلکہ طبیب حاذق تھے اور اس سے بڑھ کر طبیب گر تھے۔ لکھنؤ اور جوار لکھنؤ میں ان کے سیکڑوں طبیب شاگرد تھے۔ منجھلے صاحبزادے مفتی مظہر کریم میرے پردادا تھے۔ ان کو فرنگی محل لکھنؤ سے سند افتا ملی تھی۔ بسلسلہ ملازمت وہ شاہجہاںپور میں کلکٹریٹ بحیثیت سر رشتہ دار رہے اور وہاں کی سربرآوردہ ہستیوں میں تھے۔ ان کا وہاں 34 سال قیام رہا۔ 1857 کی جنگ آزادی میں انھوں نے نمایاں حصہ لیا اور شاہجہاںپور کی آزاد حکومت کے مشیر خصوصی تھے۔ انگریزوں کے تسلط کے بعد انھیں بغاوت کے جرم میں سزا دی گئی اور وہ انڈمان نکوبار یا کالے پانی میں کئی برس محبوس رہے اور ایک عربی کی جغرافیہ کی

کتاب کا ترجمہ کرنے پر ان کی بقیہ سزا معاف کر دی گئی۔ ان کے چھوٹے صاحبزادے یعنی میرے دادا مولوی عبدالقادر نیک نام سرکاری افسر تھے اور ڈپٹی کلکٹری کے عہدے سے ریٹائر ہوئے اور مختلف اضلاع لکھیم پور، فیض آباد، گورکھپور، بستی اور سیتاپور میں بحیثیت ڈپٹی کلکٹر مامور رہے۔ وہ بڑے ہی ہردلعزیز حاکم تھے نہ صرف اپنے غریب عزیزوں بلکہ دوسرے حاجت مندوں کی بھی مالی مدد کرتے تھے اور اسی کے ساتھ علمی ذوق کے مالک تھے اور بڑے گہرے مذہبی شخصیت کے حامل تھے اور مضمون بھی لکھتے رہتے تھے۔ ان کے دو صاحبزادے تھے بڑے صاحبزادے کا نام عبدالمجید تھا جو میرے والد تھے۔ اپنے والد کی طرح وہ بھی تحصیل داری سے ترقی پاکر ڈپٹی کلکٹر ہوئے اور پرتاپ گڑھ، گونڈہ، بستی، سہارنپور، سیتاپور، اناؤ اور بہرائچ میں تعینات رہے۔ وہ بھی اپنے والد کی طرح بڑے نیک نام اور لائق سرکاری عہدے دار رہے۔ انھی کی طرح وہ حاجت مندوں اور ضرورت مندوں اور اپنے عزیزوں کی ہر طرح مدد کرتے رہے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد وہ ملّی سرگرمیوں میں بھی حصہ لیتے رہے۔ مولوی عبدالقادر کے دوسرے صاحبزادے یعنی میرے چچا ادیب جلیل، لاثانی طرز انشا کے مالک، نامور عالم دین اور مفسر قرآن مولانا عبدالماجد دریابادی تھے۔ دونوں بھائیوں میں مثالی محبت تھی۔ چچا صاحب کی چار صاحبزادیاں تھیں۔ وہ سب ہم چاروں بھائیوں سے منسوب ہوئیں۔ میرا گھرانہ علمی اعتبار سے امتیازی پوزیشن کا مالک تھا۔ اس کے اکثر افراد سرکاری عہدوں پر فائز رہے اور اسی کے ساتھ تھوڑی بہت زمینداری کے بھی مالک تھے اور اس سے بڑھ کر یہ گھرانہ علم کے لحاظ سے بہت ممتاز رہا۔

م ع ا: آپ کا شمار مجاہدینِ آزادی میں ہوتا ہے اور آپ کی زندگی کا ابتدائی دَور آزادی کی جدوجہد میں صرف ہوا۔ تحریک آزادی میں آپ نے کس عمر میں شرکت کی اور کانگریس ہی سے آپ کیوں متاثر ہوئے؟

ڈاکٹر قدوائی: جب سے ہوش سنبھالا یعنی 1926 سے گھر میں مولانا محمد علی، گاندھی جی اور مولانا شوکت علی اور خلافت کا ذکر سنا۔ عم مرحوم مولانا عبدالماجد دریابادی اودھ خلافت کمیٹی کے صدر تھے۔ فروری 1927 میں لکھنؤ میں آل انڈیا خلافت کانفرنس کا سالانہ اجلاس ہوا۔ اس کانفرنس کی تقریروں سے انگریزی حکومت کے خلاف نفرت کے جذبات پیدا ہوئے۔ خلافت کے لکھنؤ اجلاس کے دوران مولانا محمد علی عم مرحوم سے ملنے ان کی قیام گاہ خاتون منزل تشریف لائے۔ اتفاق سے چچا صاحب کہیں گئے ہوئے تھے۔ مولانا نے کچھ دیر ان کا انتظار کیا اور مجھ سے اور عم مرحوم کی بڑی صاحبزادی جو میری ہم سِن تھیں، مخاطب رہے۔ گاندھی جی کو پہلی بار سہارنپور میں 1929 میں دیکھا اور ان کی تقریر سنی۔ 1930 میں جب کانگریس نے سول نافرمانی کی تحریک شروع کی تو کانگریس کے جلسے اور جلوسوں میں شریک ہوتا رہا۔ جمعیۃ العلما نے بھی اس تحریک میں حصہ لیا اور اس کے جلسوں میں بھی شرکت کی۔ جمعیت اور کانگریس کے لیڈروں کی تقریروں سے بہت متاثر ہوا اور برطانوی حکومت کے خلاف نفرت کے جذبات میں اور زیادہ اضافہ ہوا۔ اور اپنے جیب خرچ سے کھادی خریدی اور کانگریس کا جھنڈا گھر میں لگایا۔ اپنے جیب خرچ ہی سے گرفتار شدہ لیڈروں کے فوٹو

> **"خلافت کے لکھنؤ اجلاس کے دوران مولانا محمد علی عم مرحوم سے ملنے ان کی قیام گاہ خاتون منزل تشریف لائے۔ اتفاق سے چچا صاحب کہیں گئے ہوئے تھے۔ مولانا نے کچھ دیر ان کا انتظار کیا اور مجھ سے اور عم مرحوم کی بڑی صاحبزادی جو میری ہم سِن تھیں، مخاطب رہے۔ گاندھی جی کو پہلی بار سہارنپور میں 1929 میں دیکھا اور ان کی تقریر سنی۔"**

اور لٹریچر خریدتا تھا۔ 1930-32 کی سول نافرمانی کی تحریکات کا لٹریچر اور اخبارات بڑے شوق سے پڑھتا تھا۔ بڑے بھائی حکیم عبدالقوی اس زمانے میں طبیہ کالج دہلی میں طالب علم تھے۔ جب وہ سہارنپور آتے تھے تو تحریک کا لٹریچر لاتے تھے، اسے بڑے شوق سے پڑھتا تھا۔ جب 1931 میں مشہور انقلابی لیڈر بھگت سنگھ اور ان کے ساتھیوں کو پھانسی دی گئی تو میرے اسکول یعنی گورنمنٹ اسکول، سہارنپور کے لڑکوں نے اسٹرائک کی اور میں اُن دس پندرہ لڑکوں میں تھا جو ٹیچروں اور ہیڈ ماسٹر کی اس دھمکی کے باوجود کہ اگر کلاس نہ گئے تو امتحان میں فیل کر دیے جاؤ گے، اور سالانہ امتحان میں ہم سب یعنی دس پندرہ لڑکے امتحان میں فیل کر دیے گئے اور اسی طرح سے یہ ملک کی آزادی کے لیے میری ایک قربانی تھی۔ کانگریس سے اس لیے دلچسپی پیدا ہوئی کہ یہ ملک کو آزاد کرانا چاہتی تھی اور برطانوی حکومت کو ختم کرنا چاہتی تھی اور یہ فریضہ اس نے سول نافرمانی کی عوامی تحریکوں سے ادا کیا۔

م ع ا: روف و ممتاز ادیب و دانشور اور مفسر قرآن مولانا عبدالماجد دریابادیؒ آپ کے چچا تھے اور آپ ان کا ذکر خاص طور سے کرتے ہیں۔ مولانا محترم سے آپ کے اس خاص تعلق کی اصل وجہ کیا ہے؟

ڈاکٹر قدوائی: نامور عالم دین، مفسر قرآن، لاثانی طرز انشا کے مالک، جلیل القدر ادیب، صف اول کے ممتاز صحافی مولانا عبدالماجد دریابادی کا تذکرہ خاص طور سے اس لیے کرتا ہوں کہ انھوں نے میری تربیت کا زبردست فریضہ انجام دیا۔ ہر شعبۂ زندگی میں رہنمائی کی اور اسی کے ساتھ اعلیٰ کردار سازی کی بھی کوشش کی۔ یہ کم استعداد و بے بضاعت آج جو کچھ بھی ہے انھی کی تربیت کی وجہ سے ہے۔ انھوں نے ہم سب بھائیوں کی تربیت کا فریضہ انجام دیا بلکہ متعدد قریبی رشتے دار نوجوانوں کو بھی تربیت دی۔

م ع ا: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ایک شفیق استاد کی حیثیت سے تقریباً 34 برس اس کے شعبہ سیاسیات سے وابستہ رہے۔ آپ کے زمانے میں مسلم یونیورسٹی کی تہذیبی و ثقافتی روایات اور آج میں آپ کیا نمایاں فرق محسوس کرتے ہیں؟

ڈاکٹر قدوائی: میرے زمانے میں مسلم یونیورسٹی کی تہذیبی اور ثقافتی روایات اور آج میں ایک نمایاں فرق یہ ہے کہ اب مغربیت کے اثر سے مخلوط تقریبات زیادہ ہونے لگیں۔ میرے زمانے میں یہ تقریبات ہوتی تھیں لیکن موجودہ وائس چانسلر کے پیش روؤں کے زمانے میں مخلوط تقریبات کا بہت زیادہ زور ہوا۔ میرے زمانے میں اسلامی شعائر کو برقرار رکھنے کے لیے شعبۂ دینیات کی فیکلٹی کی طرف سے بڑی کوشش کی جاتی تھی۔ لیکن بدقسمتی سے موجودہ وائس چانسلر کے پیش رو وائس چانسلر جن کا تعلق جنوبی ہند سے تھا۔ ان کے زمانے میں دینیات کی فیکلٹی ناکام ثابت ہوئی۔ جنوبی ہند کے اس وائس چانسلر کے دور میں ایک ایسی کتاب یونیورسٹی کے ایک استاد نے شائع کی جس میں اسلامی تعلیمات پر دلآزار انداز میں لکھا گیا۔ صحابہ کرام کو سازشی قرار دیا گیا لیکن شعبۂ دینیات نے ایک لفظ بھی اس کتاب کے خلاف نہیں کہا۔

م ع ا: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا قیام سرسیّد احمد خاں نے جن مقاصد کے لیے کیا تھا، آپ کے نزدیک مسلم یونیورسٹی اپنے مقاصد کے حصول میں کس حد تک کامیاب ہے؟

ڈاکٹر قدوائی: مسلم یونیورسٹی کا اوّلین مقصد طلبا کی کردار سازی تھا اور مسلم طلبا کو اعلیٰ کردار کا مسلمان بنانا تھا۔ یہ مقصد بڑی حد تک حاصل ہوا لیکن مغربی کلچر اور تمدن کے اثر کی وجہ سے اس مقصد پر بھی اثر پڑا ہے اور تجدد نے اسلامیت کو ایک حد تک کمزور کرنے کی کوشش کی ہے اور اسی کے ساتھ اساتذہ اور طلبا کے گہرے رابطے میں بھی کمی ہوئی ہے۔

م ع ا: آپ نے اپنے زمانے میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں کئی وائس چانسلروں کے دَور کو دیکھا ہے۔ آپ کس وائس چانسلر کے کام سے سب سے زیادہ متاثر ہوئے؟

ڈاکٹر قدوائی: ایک نہیں بلکہ چار وائس چانسلروں کے کاموں سے بہت زیادہ متاثر ہوا۔ یہ وائس چانسلر تھے کرنل بشیر حسین زیدی، بدرالدین طیب جی، نواب علی یاور جنگ، پروفیسر علی محمد خسرو۔

م ع ا: آپ 1984 سے 1990 تک راجیہ سبھا کے ممبر رہے۔ اس دوران اردو زبان اور ملک میں مسلمانوں کے اہم مسائل کے سلسلے میں آپ نے خاص طور پر کن نکات پر توجہ دی اور اپنی تجاویز کو تسلیم کرانے میں کس حد تک کامیاب رہے؟

ڈاکٹر قدوائی: اپنی راجیہ سبھا کی ممبری کے دوران میں نے مسلم یونیورسٹی کے اقلیتی کردار کی بحالی اور مسلم مخالف فسادات کی روک تھام اور خاطی افسروں کو خاص طور سے پولیس کے حکام کے خلاف کارروائی کیے جانے کا مطالبہ کرتا رہا اور اس میں کبھی کبھی کامیابی بھی ہوئی۔ جب جامعہ ملیہ اسلامیہ کو مرکزی یونیورسٹی کا درجہ دیا گیا تو راقم کی توجہ دلانے پر اسے بھی اقلیتی کردار دیا گیا۔ اسی طرح سے اردو کو اس کا جائز حق دلانے کے لیے برابر کوشش کرتا رہا۔ اسی طرح سے جب کلکتہ ہائی کورٹ میں یہ عرضی پیش ہوئی کہ قرآن مجید سے قتال و جہاد کے بارے میں آیات خارج کر دی جائیں تو مولانا اسعد مدنی کے ساتھ راقم وزیر اعظم راجیو گاندھی سے ملا اور ان کے بنگال کے چیف منسٹر کو ٹیلی فون کرنے سے ہائی کورٹ نے وہ عرضی خارج کر دی۔

م ع ا: ہندوستان کی آزادی کے بعد اردو کی وکالت کرنے والوں میں مولانا ابوالکلام آزاد جیسی عبقری شخصیت کے شامل ہونے کے باوجود اردو زبان کو ہندی کے ہم پلہ سرکاری حیثیت کیوں حاصل نہ ہو سکی؟

ڈاکٹر قدوائی: بلاشبہ آزادی کے بعد اردو کی وکالت کرنے والوں میں مولانا ابوالکلام آزاد کی عبقری شخصیت تھی لیکن اس کے باوجود اردو کو ہندی کے ہم پلہ سرکاری حیثیت حاصل نہ ہو سکی۔ اس کی بہت بڑی وجہ مسلم دشمنی کی فضا تھی جو ملک کی الم ناک تقسیم اور مسلم لیگ کے دوقومی نظریے کی وجہ سے پیدا ہوئی۔ خود گاندھی جی جو کانگریس کے سب سے بڑے لیڈر تھے، ان کی بات بھی نہیں سنی گئی۔ بلاشبہ یہ ملک کی بہت بڑی بدقسمتی ہے کہ اردو جو ہندوستان کی قومی یکجہتی اور گنگا جمنی تہذیب کا نمونہ ہے اسے سرکاری حیثیت حاصل نہ ہو سکی اور تعلیم گاہوں میں اس کی تدریس ختم کر دینے سے اردو دانوں کا بڑا زبردست نقصان ہوا اور قومی یکجہتی کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا۔

م ع ا: گزشتہ 60 برسوں میں اردو جس تیزی سے زوال پذیر ہوئی ہے، اس کے لیے کیا آپ اردو والوں کو بھی ذمے دار مانتے ہیں؟

ڈاکٹر قدوائی: بلاشبہ اردو کی زوال پذیری کے ذمے دار حکومتوں کے ساتھ اردو والے بھی ہیں۔ مثلاً بچوں کو کم سے کم گھر میں اردو پڑھاتے ہیں۔ وہ اردو اخبارات پڑھنے کے بجائے دوسری زبانوں کے ہی اخبارات پڑھتے ہیں اور اردو کتابیں نہیں خریدتے۔ میں ہر مہینے اردو کتابیں خریدتا رہتا ہوں اور اردو رسالے بھی۔ کاش سب اردو والے یہی طریقہ اختیار کریں۔

م ع ا: تاریخی واقعات پر آپ کی نظر گہری ہے۔ تاریخی حقائق اور واقعات آپ کے حافظے میں اب بھی محفوظ رہتے ہیں۔ 93 سال کی عمر میں بھی آپ حافظے کی دولت سے مالا مال ہیں۔ ہندوستان کی سیاسی تاریخ کے حوالے سے کیا حکومت نے کبھی آپ کی خدمات حاصل کرنے کی کوشش کی؟

ڈاکٹر قدوائی: بدقسمتی سے ابھی تک حکومت نے میری خدمات حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی۔

م ع ا: سیاسیات کے استاد کی حیثیت سے آپ ایک درجن

> **لاشبہ اردو کی زوال پذیری کے ذمے دار حکومتوں کے ساتھ اردو والے بھی ہیں۔ مثلاً بچوں کو کم سے کم گھر میں اردو پڑھاتے ہیں۔ وہ اردو اخبارات پڑھنے کے بجائے دوسری زبانوں کے ہی اخبارات پڑھتے ہیں اور اردو کتابیں نہیں خریدتے۔ میں ہر مہینے اردو کتابیں خریدتا رہتا ہوں اور اردو رسالے بھی۔ کاش سب اردو والے یہی طریقہ اختیار کریں۔**

سے زائد کتابوں کے مصنف ہیں۔ اردو میں 1857 سے آج تک کی کرانولوجی (Chronology) موجود نہیں ہے۔ کیا آپ اس کی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے اس تاریخی و تحقیقی کام کو اپنی نگرانی میں انجام دے سکتے ہیں؟

ڈاکٹر قدوائی: یقیناً۔ 1857 سے آج تک کی کرانولوجی موجود نہیں ہے۔ اس کی شدید ضرورت ہے اور میں اس تاریخی اور تحقیقی کام کو اپنی نگرانی میں کرا سکتا ہوں۔

م ع ا: ہر زبان کا براہ راست تعلق تعلیم اور تعلیمی اداروں سے ہوتا ہے۔ زبان کی ترقی و توسیع میں مادری زبان میں تعلیم ناگزیر ہوتی ہے۔ اردو زبان گزشتہ 60 برسوں میں ملک کے تعلیمی اداروں میں حاشیے پر پہنچا دی گئی ہے۔ کیا آپ محسوس کرتے ہیں کہ ملک کے تمام سرکاری پرائمری، مڈل اور سکنڈری اسکولوں میں ہندی اور انگریزی کی طرح اردو زبان کی تدریس کو یقینی بنانے کے لیے حکومت کی کوئی خاص ذمے داری ہے؟

ڈاکٹر قدوائی: بلاشبہ ملک کے تمام سرکاری، پرائمری، مڈل اور سیکنڈری اسکولوں میں اردو زبان کی تدریس کو یقینی بنانا حکومت کا ہی خاص فریضہ ہے جو اسے فوراً پورا کرنا چاہیے۔

م ع ا: آپ کے نزدیک ادبی تخلیقات میں اقدار کی کیا اہمیت ہے اور تخلیق کار کو اپنی تخلیقات میں کن سماجی امور اور اخلاقی قدروں پر توجہ مبذول کرنی چاہیے؟

ڈاکٹر قدوائی: ادب کی بنیاد اخلاقی قدروں پر ہونی چاہیے اور اخلاق بیزاری اور فحش نویسی اور عریاں نگاری کی اس میں کوئی جگہ نہیں ہونی چاہیے۔ ایمان داری، فرائض کی ادائیگی، سماجی برائیوں اور استحصال کے خلاف ادیبوں کو لکھنا چاہیے۔

م ع ا: مختلف النوع موضوعات کی کتابوں پر آپ کے تبصرے بے حد مقبول ہوئے۔ موجودہ دَور میں اردو میں شائع ہونے والی کتابوں میں کن موضوعات پر کتابیں کم تصنیف ہو رہی ہیں؟ آپ کے نزدیک وہ کون سے موضوعات ہو سکتے ہیں جن پر محققین اور ادیبوں کو کام کرنے کی شدید ضرورت ہے؟

ڈاکٹر قدوائی: مسلم مجاہدین آزادی کے کارناموں پر کتابیں لکھنے کی سخت ضرورت ہے۔ بدقسمتی سے ہندوستانی اور ہندوستانی مسلمانوں کی سیاسیات پر زیادہ تر شائع شدہ کتابوں میں حقائق سے صرفِ نظر کیا گیا ہے۔ یعنی اصل واقعات کو نظر انداز کیا گیا ہے۔ ضرورت ہے کہ ان کذب بیانیوں کی تردید کی جائے اور حقائق پیش کیے جائیں۔ اسی طرح سے اسلام کی تعلیمات پر کتابوں کے شائع کرنے کی ضرورت ہے۔

م ع ا: آپ کی علمی و ادبی شخصیت آج کی نسل کے لیے باعثِ فخر ہے۔ آپ نے کئی نسلوں کو دیکھا ہے۔ 93 سال کی عمر میں بھی مختلف رسائل و اخبارات میں آپ کے خطوط تواتر سے شائع ہوتے رہتے ہیں۔ آپ کے نزدیک خطوط لکھنے کے کیا مقاصد ہو سکتے ہیں؟

ڈاکٹر قدوائی: اخباروں میں خطوط لکھنے کے مقاصد صرف یہ ہیں کہ حقائق سامنے آئیں اور خرابیوں کو دور کرنے کی کوشش کی جائے، مسلمانوں کے بارے میں جو غلط فہمیاں ہیں وہ دور ہوں، بدعنوانیوں کو بے نقاب کیا جائے اور ہندوستانیوں کے ضمیر کو بدعنوانیوں کے خلاف جھنجھوڑا جائے۔

■

Mohd Arif Iqbal, Editor: URDU BOOK REVIEW, 1739/3 (Basement), New Kohinoor Hotel, Pataudi House, Darya Ganj, New Delhi - 110002
Dr. Hashim Kidwai, C-501, Rosewood Apts. Mayur Vihar Phase I, Delhi - 110091

مشرق کے دو آفتاب

ٹیگور اور اقبال، مشرقی ادب اور مشرقی شعریات کی وہ روشن شخصیتیں ہیں جو ہماری کئی نسلوں کے ذہنوں پر اثرانداز ہوئی ہیں اور آنے والی نسلیں بھی جن سے مختلف نظریاتی و شعوری سطحوں پر اکتسابِ فکر و فن کرتی رہیں گی۔ بظاہر برصغیر کی ان دو اہم شخصیتوں میں مماثلت و مواصلت کے ایسے خاص پہلو نظر نہیں آتے کہ انھیں آمنے سامنے رکھ کر اتصالی نکتوں اور نقطوں کی تلاش کرنا ضروری ٹھہرے۔ یا اس قسم کی جستجو کسی خاص علمی و ادبی اہمیت کی حامل ہو سکتی ہے۔ لیکن ایک ہی خطے، ایک ہی تہذیب اور ایک ہی ملک کی دو سمتوں سے ابھرنے والی ان روشنیوں کو ادبی و نظریاتی پرزم سے گزار کر ان کے رنگوں کی انعطافی سمتوں اور زاویوں کو سمجھنے کی کوشش کرنے میں کچھ مضایقہ بھی نہیں۔ اور پھر یہ کوئی ایسی لاحاصل سرگرمی نہیں ہے جس سے اجتناب برتا جائے۔

یہ بھی محض اتفاق نہیں ہے کہ عالمی ادب میں جب ہندوستان کے ادب کا ذکر آتا ہے تو کالیداس اور غالب کے بعد نگاہِ انتخاب ٹیگور اور اقبال پر ہی آ کر ٹھہرتی ہے اور یوں دونوں کے نام ساتھ ساتھ آتے ہیں۔ عظمتوں کی یہ ہم رشتگی اس حقیقت کے باوجود اپنے ہونے کا احساس دلاتی ہے کہ دونوں کی شخصیتوں اور نظریاتی زاویوں میں اچھا خاصا بعد ہی نہیں پایا جاتا بلکہ تصادم کی سی کیفیت بھی نظر آتی ہے۔ مثال کے طور پر ٹیگور جہاں مذہبی تکثیریت اور آفاقیت کے حامی تھے وہاں اقبال نے نظریاتی سطحوں پر خود کو صرف ایک مذہب، اسلام، سے وابستہ ہی نہیں بلکہ اس کا پابند بھی کر لیا تھا۔ ٹیگور ہندوستان کے عوام کو ایک قوم کی طرح دیکھتے تھے، بلکہ اس میں بھی وہ بین الاقوامی یکجہتی کے متلاشی نظر آتے تھے جب کہ دوسری طرف اقبال کو نہ صرف اپنے وطن کی سطح پر ہی دوقومی نظریے کا بانی مانا جاتا ہے بلکہ عالمی سطح پر بھی وہ دنیا کی آبادی کو مسلم اور غیر مسلم میں تقسیم کر کے دیکھتے تھے۔ اس کے علاوہ کچھ لوگ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ تخلیقیت اور فعالیت میں ٹیگور اقبال کے مقابلے میں کہیں آگے ہیں۔ خود اقبال نے بھی کم از کم فعالیت کے معاملے میں اس حقیقت کو قبول کیا تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ ٹیگور کا فن اور تخلیقی جوہر صرف شاعری تک محدود نہیں تھا۔ انھوں نے افسانہ نگاری، موسیقی اور مصوری میں بھی خود کو تسلیم کرایا تھا۔ اقبال نے فنون لطیفہ کے ان گوشوں میں نہ کبھی طبع آزمائی کی نہ کوئی دل چسپی لی لیکن صرف شاعری میں ہی انھوں نے اپنے فن اور زور بیان کا وہ بے مثل مظاہرہ کر دکھایا کہ پورے اردو ادب میں سوائے انیس اور غالب کے کوئی ان کے آگے ٹکتا ہوا دکھائی نہیں دیتا۔ ان پر بھی اقبال کو یہ تفوق حاصل ہے کہ کسی مخصوص نظریے کو اس قدر اثرانگیزی اور جامعیت کے ساتھ ان سے پہلے کسی اردو شاعر نے نہ تو برتا نہ اجاگر کیا۔

یہ صحیح ہے کہ اقبال ''ہندی ہیں، ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا'' کہتے کہتے ''مسلم ہیں، ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا'' کہنے لگے تھے اور بقول جوش ملیح آبادی ''ایک سمندر نے خود کو دریا بنا لیا تھا''، لیکن اس سے سخنِ اقبال کی اہمیت، انفرادیت اور افادیت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔ انھوں نے اسلام کو ایک عالمی نظریے کے طور پر اپنایا تھا جس میں وطنیت یا انفرادی قومیت اپنے آپ مدغم ہو جاتی ہے۔ یہی ان کا یونی ورسلزم تھا اور یہی ان کی آفاقیت تھی جسے بھرپور انداز سے اپنے اردو اور فارسی کلام کے زور پر سامنے لانے کی کوشش انھوں نے پورے خلوص، صدق دلی اور کمٹ منٹ کے ساتھ کی تھی۔

ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ باوجود جزوی نظریاتی اختلاف کے ٹیگور اور اقبال ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے۔ بلکہ ایک مرتبہ تو لاہور میں ٹیگور نے اقبال سے ملاقات بھی کرنا چاہی تھی لیکن کسی وجہ سے یہ ملاقات نہ ہو سکی جس کا اقبال کو ہمیشہ افسوس رہا اور انھوں نے ٹیگور کو اس سلسلے میں خط بھی لکھا۔ جہاں تک زمانے کا تعلق ہے تو ان دونوں ہستیوں کا عہد کم و بیش ایک ہے۔ دونوں انیسویں صدی میں پیدا ہوئے اور بیسویں صدی پر اپنے نشانِ راہ ثبت کرنے کے بعد دو تین سال کے فرق کے ساتھ آگے پیچھے اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔

اس تمام پس منظر کے ساتھ ہم 'گوشۂ اقبال و ٹیگور' پیش کر رہے ہیں جس میں سبھی زاویوں سے اقبال اور ٹیگور کو سمجھنے سمجھانے کی ممکنہ کوشش کی گئی ہے۔ امید ہے قارئین بھی اس پیشکش کو پسند فرمائیں گے۔

نصرت ظہیر

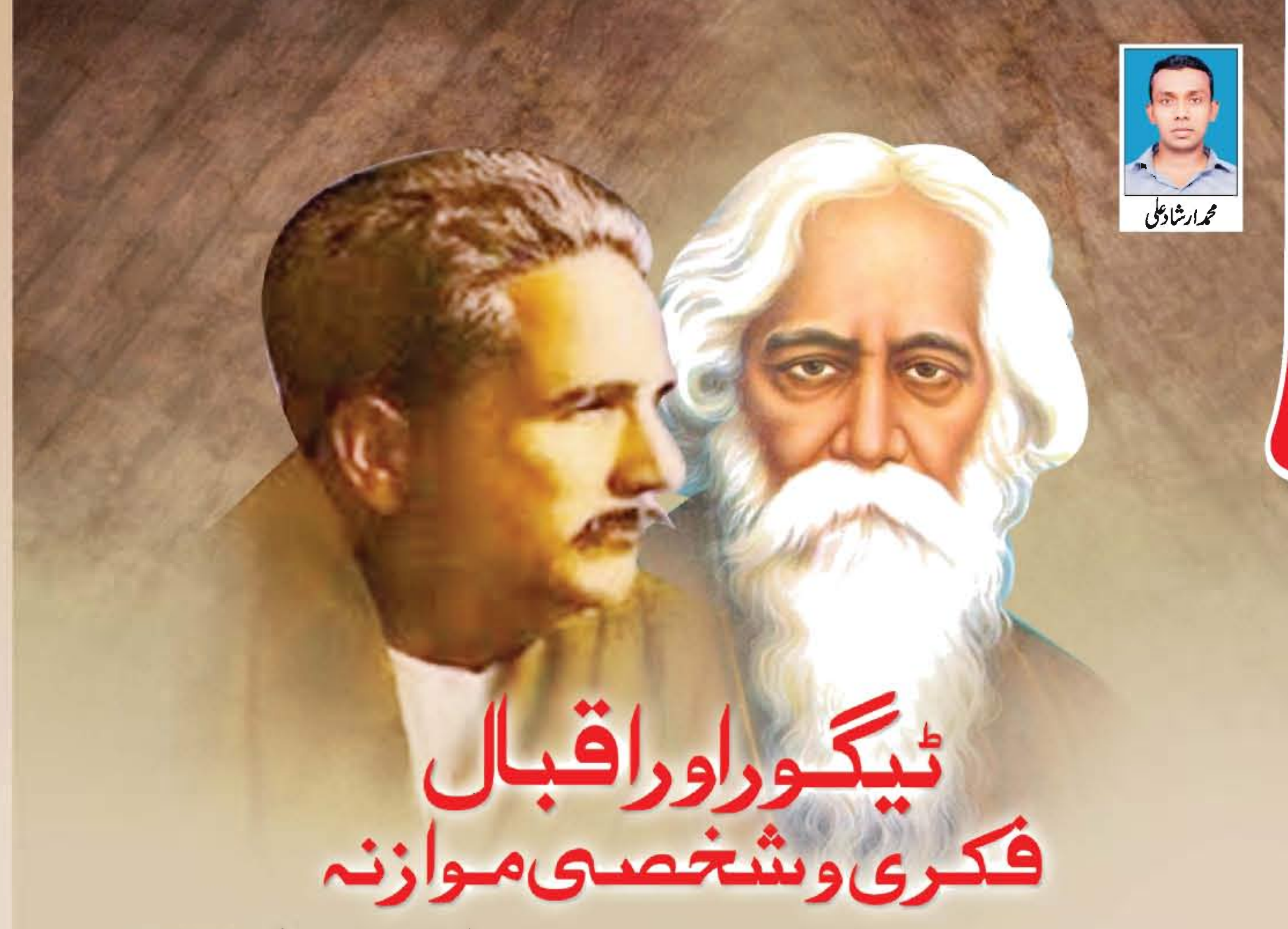

ٹیگور اور اقبال
فکری و شخصی موازنہ

محمد ارشاد علی

بیسویں صدی کا ہندوستان کئی لحاظ سے اہمیت کا حامل ہے۔اس صدی میں جہاں مختلف سیاسی، سماجی اورادبی تحریکوں نے سرابھارا وہیں کئی مختلف شخصیتوں کا ظہور بھی ہوا جنھوں نے نہ صرف لوگوں کی توجہ اپنی جانب مبذول کرائی بلکہ ایسے کار ہائے نمایاں انجام دیے جس کی وجہ سے انھیں کسی مخصوص زمان ومکان میں قید نہیں کیا جاسکتا۔رابندر ناتھ ٹیگور اور شاعر مشرق علامہ اقبال کا شمار ایسی ہی Stunning Personalities میں ہوتا ہے جنھوں نے اپنی فکری بلوغت، فنی بصیرت اور تعمیر برائے انسانیت کے خیال سے پوری دنیا کو متاثر کیا۔ بلاشبہ ٹیگور اور اقبال عالمی شہرت کے حامل ہیں کیونکہ اقبال کی شاعری نے جہاں یقیں محکم، عمل پیہم اور محبت فاتح عالم کا سبق لوگوں کو پڑھایا وہیں ٹیگور کی گیتانجلی نے اپنے نغمات سے تشنگان ادب کی پیاس بھی بجھائی۔دونوں کے ادوار کا جائزہ لیا جائے تو یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ فکر کے اعتبار سے دونوں ایک دوسرے سے بہت قریب دکھائی دیتے ہیں۔دونوں کے یہاں ہمیں سیکڑوں اشعار دوستی، اخوت ومساوات، عشق خداوندی، عجز وانکسار اور حرکت وعمل وغیرہ کے موضوع پر مل جاتے ہیں۔ٹیگور اور اقبال اپنی زندگی میں عہد ساز بھی رہے اور اس کے نقیب بھی۔انسانی زندگی کا مطالعہ اور وجدان خودی کے مرحلے سے گزرتے ہوئے انھوں نے اپنی کاوشوں سے نہ صرف علم وادب کے چراغ روشن کیے بلکہ ایک انقلابی روح بھی پیدا کی۔

جیسا کہ معلوم ہے ٹیگور اور اقبال ایک ہی عہد میں زندگی بسر کررہے تھے اور بین الاقوامی سطح پر جو سیاسی، سماجی، اقتصادی، تہذیبی اور ادبی تبدیلیاں رونماں ہورہی تھیں ان سے باخبر ہونے کے ساتھ ساتھ کسی نہ کسی طریقے سے اس کی تشہیر کے لیے بھی کوشاں تھے۔لیکن شاید اس عہد کا المیہ تھا کہ دونوں ایک دوسرے کے خیر خواہ ہونے کے باوجود زندگی بھر ایک دوسرے سے براہ راست نہ مل سکے۔ایک دفعہ ٹیگور، اقبال کی مزاج پرسی کے لیے لاہور بھی پہنچے لیکن وہاں بھی وہ ایک دوسرے سے نہ مل سکے۔اقبال اپنے ایک خط بنام عباس علی خاں بابت 11 مارچ 1934 میں لکھتے ہیں:

''آپ کی ایما پر ٹیگور میری مزاج پرسی کے لیے لاہور آئے تھے۔مگر میں لاہور میں موجود نہ تھا۔اس لیے ملاقات نہ ہوسکی آپ انھیں مطلع کردیں''...

اقبال کے دل میں ٹیگور کے لیے جو عقیدت واحترام کا جذبہ تھا اس کا اندازہ اس گفتگو سے بھی لگایا جاسکتا ہے جو 1932 میں لندن کے سفر کے دوران اقبال نے ٹیگور کے تعلق سے اپنے دوست سے کی تھی۔فرماتے ہیں:

''ٹیگور اور میرے درمیان صرف اتنا فرق ہے کہ وہ آرام اور سکون کی تبلیغ کرتے ہیں لیکن عملی طور پر کام کرتے ہیں لیکن میں عمل کی بات کی کرتا ہوں لیکن خود تساہل برتتا ہوں''

بحوالہ اقبال شاعر اور سیاست داں از ڈاکٹر رفیق ذکریا، ص 43

یہ عزت واحترام کا جذبہ صرف یک طرفہ نہ تھا بلکہ خود ٹیگور بھی اس کا پاس رکھتے تھے۔اقبال کی موت پر ٹیگور درج ذیل الفاظ میں اظہار تاسف کرتے ہیں:

''ڈاکٹر اقبال اپنی وفات سے ہمارے ادب میں ایسی کمی پیدا کر گئے جس کا گھاؤ مدت مدید میں بھی مندمل نہیں ہوسکتا۔ہندوستان کا رتبہ آج دنیا کی نگاہ میں اتنا کم مایہ ہے کہ کسی حالت میں بھی ہم ایسے شاعر کی کمی برداشت نہیں کرسکتے جس کے کلام نے عالم گیر مقبولیت حاصل کرلی تھی۔''

جواہر اقبال محمد حسین صدیقی، ص 5

دنیا کی کسی بھی زبان میں ادب کی تعریف متعین نہیں کی گئی ہے۔کوئی اسے محض خیال کے اظہار کا نام دیتا ہے تو کوئی بہترین خیال کے بہترین اظہار کو ادب گردانتا ہے۔فی الحال ادب کی جو بھی تعریف ہو مگر اسے بالائے طاق رکھ کر اگر ہم اس بات پر غور کریں کہ ادب کیوں کر لکھا جاتا ہے یا کیوں لکھا جانا چاہیے تو شاید اس کا جواب یہی ہے کہ جذبات کے اظہار اور اس کی ترسیل کا وسیلہ ادب ہے۔یہ جذبات ہی ہیں جو کسی فن پارے میں مسرت، مقصدیت، افادیت، آفاقیت اور روحانیت کو جنم دیتے ہیں۔ٹیگور کے نزدیک ادب میں روحانیت کا ہونا ضروری ہے اور روحانیت کے لیے محبت، نظریہ اور Contemplation کا ہونا ضروری ہے۔اپنے ایک مضمون The Principle of Literature میں لکھتے ہیں:

اقبال مذہب اسلام کے ماننے والے تھے۔ ان کے بیشتر اشعار کے مآخذ قرآن و حدیث اور اسلامی واقعات ہوا کرتے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ جب ہم کلیات اقبال کا مطالعہ کرتے ہیں تو خاک وطن کا ذرہ بھی ان کے یہاں خدا نظر آتا ہے لیکن یہ وطن عزیز سے محبت کی دلیل ہے اقبال کا تصور خدا نہیں۔

"The Upanishad says of the infinite being that we can reach him not with speech nor with the mind, but our conciousness of delight, wherewith a fear departs from us. Our soul had her hunger for this immediateness of realization whereby she is enabled also to know herself. The love, the contemplation, the vision that alone can satisfy this hunger finds its place in literature in art."

اقبال ٹیگور کے درج بالا خیالات سے اختلاف نہیں کرتے لیکن ادب میں مقصدیت پر زور دیتے ہیں ان کے خیال میں پیغام اہم ہے اور اس کی تشہیر ضروری ہے۔وہ فن کی باریکیوں اور اس کی اہمیت سے انکار نہیں کرتے لیکن اسے مطمح نظر نہیں رکھتے۔ چونکہ اقبال بنیادی طور پر حرکت وعمل کے شاعر ہیں اس لیے ایسے خیالات کو عام کرتے ہیں جس سے انسانی زندگی فعال اور متحرک ہوتی ہے۔اقبال ایک خط میں اپنے نظریہ ادب کا بیان درج ذیل طریقے سے کرتے ہیں:

''شاعری میں لٹریچر بحیثیت لٹریچر کبھی میرا مطمح نظر نہیں رہا ہے کہ فن کی باریکیوں کی طرف توجہ کرنے کے لیے وقت نہیں۔مقصود صرف یہ ہے کہ خیالات میں انقلاب پیدا ہو اور بس۔اس بات کو مدنظر رکھ کر جن خیالات کو مفید سمجھتا ہوں ان کو ظاہر کرنے کی کوشش کرتا ہوں کیا عجب ہے کہ آئندہ نسلیں مجھے شاعر تصور نہ کریں۔اس واسطے کہ آرٹ غایت درج کی جانکاہی چاہتا ہے اور یہ بات میرے حالات میں میرے لیے ممکن نہیں،'' خطوط اقبال

ٹیگور اور اقبال کی ذاتی زندگی پر اگر ہم غور کریں تو ہم دیکھیں گے کہ دونوں دو مختلف تہذیبی اقدار، الگ عقائد اور مختلف میلانات کے باوجود بعض معاملات میں ایک دوسرے سے قریب نظر آتے ہیں۔اب 'تصور خدا' کو ہی لے لیجیے۔ ٹیگور کے یہاں خدا کا جو تصور ملتا ہے وہ وہی ہے جو مذہب اسلام کے ماننے والوں کا ہے۔ٹیگور خدا کی وحدانیت اس کی قائم ہستی، اس کی عنایتوں کا انکار نہیں کرتے اور نہ ہی اس کی طاقت وعظمت کے مدمقابل کسی کو سمجھتے ہیں۔وہ خدا کے آگے خود کو بے بس محسوس کرتے ہیں اور اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ فنا وبقا کا مالک صرف وہ ذات واحد ہے جسے مختلف مذاہب میں مختلف ناموں سے پکارا جاتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں شعوری ولاشعوری طور پر ایسی خوبی در آئی ہے جو کسی مخصوص مذہب کی نمائندگی نہیں کرتی۔ایک جگہ لکھتے ہیں:

''خدا ہم سے دور نہیں۔ایسا نہیں کہ وہ عبادت گاہوں میں ہو۔وہ ہمارے اندر ہے۔وہ موت اور حیات پر، خوشی اور غم پر، گناہ اور پرہیزگاری پر، ملاپ اور جدائی پر قادر ہے۔یہ پوری زمین اسی کی ازلی ابدی عبادت گاہ ہے۔''

ٹیگور ورکس، وشو بھارتی ایڈیشن جلد چہارم

اقبال مذہب اسلام کے ماننے والے تھے۔ان کے بیشتر اشعار کے ماخذ قرآن وحدیث اور اسلامی واقعات ہوا کرتے تھے۔یہ الگ بات ہے کہ جب ہم کلیات اقبال کا مطالعہ کرتے ہیں تو خاک وطن کا ذرہ بھی ان کے یہاں خدا نظر آتا ہے لیکن یہ وطن عزیز سے محبت کی دلیل ہے اقبال کا تصور خدا نہیں۔اقبال کا خدا وہی ہے جو ابراہیم کو نار نمرود سے بچاتا ہے، جو سفینۂ نوح کو ٹھکانے لگاتا ہے، جو موسیٰ سے ہم کلام ہوتا ہے اور انسانوں کو براہ راست حکم دیتا ہے کہ:

کی محمد سے وفا تونے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح وقلم تیرے ہیں

ٹیگور خدا کی وحدانیت اس کی قائم ہستی، اس کی عنایتوں کا انکار نہیں کرتے اور نہ ہی اس کی طاقت و عظمت کے مد مقابل کسی کو سمجھتے ہیں۔ وہ خدا کے آگے خود کو بے بس محسوس کرتے ہیں اور اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ فنا و بقا کا مالک صرف وہ ذات واحد ہے جسے مختلف مذاہب میں مختلف ناموں سے پکارا جاتا ہے۔

رابندر ناتھ ٹیگور اور محمد اقبال کو کن محرکات نے عظیم شاعر بنایا یہ ایک تحقیق طلب مسئلہ ہے لیکن کسی عظیم فن کار کی پہچان اس سے بھی کی جاسکتی ہے کہ اس نے اپنی تحریروں میں کن عظیم شخصیتوں کو خراج عقیدت پیش کیا اور ان کے کن خیالات سے وہ متاثر تھے۔کیونکہ کسی عظیم شاعر کا کسی سے متاثر ہونا خود اثر انداز ہونے والے شخص کی اہمیت کا پتہ دیتا ہے اور پھر ان کی شخصیت تحقیق طلب امر بن جاتی ہے۔ٹیگور نے اپنی شاعری میں ایسے اشخاص کا ذکر کیا ہے جن کے ناموں کو مورخ نے تاریخ کے صفحوں پر سنہرے حروف سے لکھا ہے۔اس ضمن میں گاندھاری، کالی داس، گرو گووند اور شاہجہاں وغیرہ کا نام کافی اہمیت کا حامل ہے۔نظم شاہجہاں کا ایک بند ملاحظہ ہو:

اے شہنشاہ شاعر
یہی تمھارے دل کی تصویر ہے
یہی تمھارا اپنا میگھ دوت ہے
بے مثال، لاثانی!
چھندوں اور گیتوں میں اترا ہے عالم غیب کی طرف

سے ٹیگور کی طرح اقبال بھی بین الاقوامی شہرت کے حامل شاعر ہیں اور اپنی اس حیثیت کو منوانے کے لیے انھوں نے بھی دنیا کے عظیم دانشوروں کا مطالعہ کیا ہے جس کا اندازہ ہمیں اقبال کے فکری سرچشموں کے مطالعے سے ہوتا ہے جہاں تک کلام اقبال میں برگزیدہ ہستیوں کے ذکر کا تعلق ہے تو اس کی ایک طویل فہرست ہے تاہم مجدد الف ثانی، معین الدین چشتی، گرونانک، نظام الدین اولیاء اور رام وغیرہ کا ذکر ناگزیر ہے۔نظم 'نانک' کے اشعار ملاحظہ فرمائیں جس میں انھوں نے گرونانک کو خراج عقیدت پیش کیا ہے:

بتکدہ پھر بعد مدت کے مگر روشن ہوا
نور ابراہیم سے آزر کا گھر روشن ہوا
پھر اٹھی آخر صدا توحید کی پنجاب سے
خلق کو ایک مرد کامل نے جگایا خواب سے

ٹیگور اور اقبال اپنی شاعری میں جتنے موضوعات کو بروئے کار لائے ہیں ان میں سے بیشتر کا تعلق انسانی زندگی سے عبارت ہے۔دونوں کی شاعری میں فلسفہ اور حرکت وعمل جاری وساری نظر آتا ہے۔زندگی ان کے نزدیک محض گزار دینے کی شے نہیں ہے بلکہ کچھ کر گزرنے کا نام ہے۔ان کے اشعار کے مخاطب ایسے انسان ہیں جو عمل پیہم سے دور اور کام سے جی چراتے ہیں۔انھوں نے نہ صرف اپنے اشعار کے ذریعے مردہ طبیعتوں کو حرارت بخشی بلکہ ان کے نزدیک زندگی کا صحیح تصور بھی پیش کیا۔ٹیگور 'سادھنا' میں کہتے ہیں:

زندگی کی خوشی کام میں ہے۔کام میں ایک عجیب لذت

ہے۔ یہ لذت تکمیل حیات میں ہے۔ ممد و معاون ہے۔ کوئی ذی حیات اس قدر محنت و مشقت نہیں کرتا جس قدر انسان، اور یہی انسان کے اشرف المخلوقات ہونے کی دلیل ہے۔"

اقبال زندگی کی اہمیت کا اظہار درج ذیل اشعار میں اس طرح کرتے ہیں:

زندگانی کی حقیقت کوہ کن کے دل سے پوچھ
جوئے شیر و تیشہ و سنگ گراں ہے زندگی
تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں پیہم رواں ہر دم جواں ہے زندگی
یقیں محکم عمل پیہم محبت فاتح عالم
جہاد زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

ٹیگور اور اقبال کی شاعری میں جہاں مذہب، فلسفہ اور تاریخ وغیرہ پر عمدہ خیالات ملتے ہیں وہیں ان کی شاعری میں مناظر فطرت کے خوبصورت عناصر بھی ملتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ دونوں نے دوسری اصناف کے مقابلے شاعری کو خاص کر اپنے ترسیل اظہار کا ذریعہ بنایا اور مناظر فطرت کی بھر پور عکاسی کی۔ ٹیگور نے اپنی شاعری میں نیچر کا بیان نہایت ہی سلیقہ مندی سے کیا ہے۔ یوں بھی وہ پوری زندگی مناظر فطرت کے پرستار رہے ہیں اور اس کے اظہار میں وہ انگریزی کے مشہور شاعر ورڈز ورتھ (Wordsworth) کے بہت قریب نظر آتے ہیں۔ لیکن ٹیگور کا اپنا ایک منفرد انداز ہے جو ان کی انفرادیت کی دلیل پیش کرتا ہے۔ نیاز فتح پوری گیتا نجلی کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

"ٹیگور فطرتاً قدرت میں جذب ہونے والی نگاہ اور ان کی رنگینیوں میں ڈوب جانے والا دل لے کر آیا ہے۔ وہ طوفانی راتوں کا تذکرہ کرتا ہے اور لفظوں میں ایسی تصویر کھینچ کر رکھ دیتا ہے کہ ساری ہیبتیں، ساری مایوسیاں، تمام اضطراب و وحشت کی صورتیں جن سے ایک انسان ایسی حالت میں متاثر ہو سکتا ہے پیش نظر ہو جاتی ہیں۔ وہ بہار کا سماں دکھلاتا ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کی ساری شگفتگی و نکہت، رنگینی و موسیقیت دل کے اندر سمائی جاتی ہے۔"

گیتا نجلی، دیباچہ

ٹیگور کی طرح اقبال نے بھی مناظر فطرت کے بیان میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی ہے۔ بانگ درا کی متعدد نظمیں اس بات کی شہادت دیتی ہیں کہ ابتدائی دور میں مناظر فطرت کا رجحان اقبال کی شخصیت پر کس حد تک غالب تھا۔ ابر کوہسار، گل رنگیں، ابر صبح، اختر صبح، چاند، پیام صبح وغیرہ اس کی عمدہ

ٹیگور اور اقبال کی شاعری میں جہاں مذہب، فلسفہ اور تاریخ وغیرہ پر عمدہ خیالات ملتے ہیں وہیں ان کی شاعری میں مناظر فطرت کے خوبصورت عناصر بھی ملتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ دونوں نے دوسری اصناف کے مقابلے شاعری کو خاص کر اپنے ترسیل اظہار کا ذریعہ بنایا اور مناظر فطرت کی بھر پور عکاسی کی۔ ٹیگور نے اپنی شاعری میں نیچر کا بیان نہایت ہی سلیقہ مندی سے کیا ہے۔

مثالیں ہیں۔ اس کے علاوہ ایک اہم نظم ہمالہ ہے جس سے کلیات اقبال کی شروعات ہوتی ہے اور جو حب الوطنی اور مظاہر فطرت کی ایک حسین مثال ہے۔ ایک بند ملاحظہ کریں:

ابر کے ہاتھوں میں رہوار ہوا کے واسطے
تازیانہ دے دیا برق سر کہسار نے
اے ہمالہ کوئی بازی گاہ ہے تو بھی جسے
دست قدرت نے بنایا ہے عناصر کے لیے
ہائے کیا فرط طرب میں جھومتا جاتا ہے ابر
فیل بے زنجیر کی صورت اڑا جاتا ہے ابر

ٹیگور اور اقبال کی شاعری کا ایک اہم موضوع 'عشق' ہے گرچہ اس موضوع پر ان گنت شاعروں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے لیکن ٹیگور اور اقبال کے یہاں 'عشق' کئی معنوں میں استعمال ہوتا رہا ہے۔ ٹیگور کا نظریہ عشق آدمی کو خالص انسان بناتا ہے جو محبت کرتا ہے خدا سے اور اس کی پیدا کردہ چیزوں سے۔ جبکہ اقبال کا نظریہ عشق فرد کے اندر اپنی انتہا کو پہنچتا ہے تو انسان مرد کامل بن جاتا ہے اور موت اس پر حرام ہو جاتی ہے۔ ٹیگور کی شاعری دولت عشق سے مزین ہے۔ مظاہر قدرت کا اظہار ہو یا محبوب حقیقی کی تلاش ہر جگہ

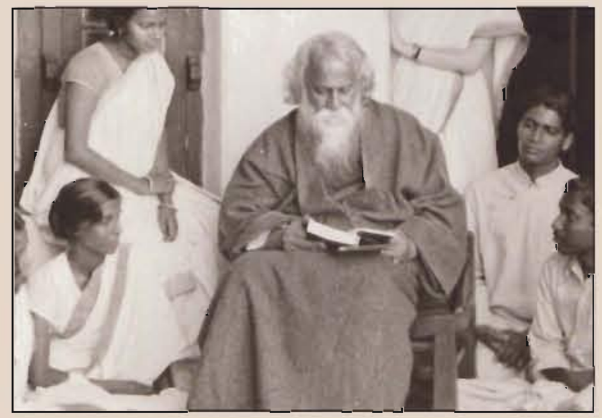

عشق ان پر غالب نظر آتا ہے۔ ٹیگور عشق کی اہمیت سے انکار نہیں کرتے بلکہ اسے اپنے طریقے سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

" To wake up in love is not to wake up in a world of sweetness, but in the world of heroic endeurours where life wins its eternity through death, and joy its worth in suffering . As the most positive affirmation of Truth is in love, it must realize itself trough all that threatens us with deprivation..............love is the wealth of soul and therefore it travells itself in outmost bravery and fortitude"

Principles of Literature,Pg.on 35

ٹیگور اور اقبال کے نظریہ عشق میں ہمیں بڑی حد تک مماثلت نظر آتی ہے۔ لیکن ٹیگور کے مقابلے میں اقبال کے یہاں عشق ایک مضبوط فلسفہ رکھتا ہے۔ عقل و عشق کی جنگ ہر وقت ان کے یہاں چلتی رہتی ہے لیکن وہ عشق کو عقل پر فوقیت دیتے ہیں:

عقل کو افکار سے فرصت نہیں
عشق پر اعمال کی بنیاد رکھ

اقبال عشق کو ازلی و ابدی زندگی کا رہنما تصور کرتے ہیں۔ اقبال کا نظریہ عشق شریعت اسلام کا محافظ ہے۔ مومنوں کی پہچان ہے۔ باعث عالم ایجاد ہے۔ ان کا نظریہ عشق رومی کے درج ذیل شعر کا پوری طرح سے احاطہ کرتا ہے:

در دو عالم ہر کجا آثار عشق
ابن آدم سر از اسرار عشق

اقبال نے اپنی شاعری میں عشق کے تعلق سے کھل کر بحث کی ہے۔ کلیات اقبال میں کل 193 اشعار ایسے ہیں جن میں لفظ عشق و عاشق کا برمحل استعمال ہوا ہے اور اس میں پیش کیا گیا ہر خیال ایک دوسرے سے الگ توجہ کا طالب ہے۔ عشق کے تعلق سے اقبال کے چند شعر ملاحظہ ہوں:

عشق تیری انتہا عشق میری انتہا
تو بھی ابھی نا تمام میں بھی ابھی ناتمام
رلاتی ہے مجھے راتوں کو خاموشی ستاروں کی
نرالا عشق ہے میرا نرالے میرے نالے ہیں
بنایا عشق نے دریائے ناپیدا کراں مجھ کو
یہ میری خودنگہ داری مرا ساحل نہ بن جائے

کہتے ہیں کہ عشق مجازی عشق حقیقی تک پہنچنے کا زینہ ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں اگر ہم ٹیگور اور اقبال کی رومانی زندگی کا مطالعہ کریں تو یہ بات واضح ہو جائے گی کہ ان دونوں نے ایسے کئی زینوں پر

اپنے قدم جمائے تھے اور قدم جماتے بھی کیوں نہیں شاعر تھے اور شاعر کا دل تو یوں بھی ہر شے کو محبت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ ٹیگور کے دل پر جس نے سب سے پہلے قبضہ جمایا وہ کادمبری ہے۔ یہ جیوتندر ناتھ ٹیگور کی بیوی اور رابندر ناتھ ٹیگور کی بھابھی تھیں۔ کادمبری نو برس کی عمر میں ٹیگور خاندان کی بہو بن کر آئیں۔ اس وقت ٹیگور آٹھ برس کے تھے۔ کادمبری کے آنے سے ٹیگور کو اپنے کھیل کود کا ایک ساتھی مل گیا تھا دونوں ہمیشہ ساتھ رہتے لیکن یہ ساتھ زیادہ دنوں تک قائم نہ رہ سکا اور کادمبری نے اچانک خودکشی کر لی۔ شانتی رنجن بھٹا چاریہ لکھتے ہیں:

"کیوں؟ کس لیے؟ جوڑا سانکو کے رئیس ٹیگور گھرانے کی اس بہو نے بھر پور جوانی میں کیوں خودکشی کر لی تھی کا درست جواب دینا مشکل ہے لیکن یہ سب جانتے ہیں کہ کادمبری کی موت ٹیگور کی زندگی کا وہ المناک حادثہ ہے جس نے ان کو تقریباً دیوانہ بنا دیا تھا۔ اس بھیانک واقعہ سے صرف چار ماہ پہلے ٹیگور نے شادی کی تھی"

رسالہ انشاء، ادیبوں کی حیات معاشقہ نمبر، ص 334

ٹیگور کے دل پر جس خاتون نے دوسرا وار کیا وہ 'انا' ہے۔ ٹیگور نے اپنی زندگی کا کچھ حصہ بمبئی میں گزارا جہاں ان کی ملاقات 'انا' سے ہوئی تھی۔ ٹیگور کو ولایت جانے سے قبل ستیندر ناتھ ٹیگور نے انھیں بمبئی میں 'انا' کے پاس بھیج دیا تھا تاکہ انگریزی زبان اور انگریزوں کی روزمرہ کی زندگی سے کچھ واقفیت حاصل کر لے۔ ٹیگور آئے بھی اسی مقصد سے تھے لیکن کسے معلوم تھا کہ 'انا' ٹیگور پر فدا ہو جائے گی اور ٹیگور بھی ان کے عاشق ہو جائیں گے۔ جب تک ٹیگور گھر پر رہے ان کا زیادہ تر وقت 'انا' کے ساتھ گزرتا، خود انا بھی ان کے پاس جانے کا بہانہ ڈھونڈتی رہتی۔ شاید یہ محبت کا ہی اثر تھا کہ ٹیگور نے 'انا' کو ایک خوبصورت نام نلنی بخشا تھا اور اس نام پر انھوں نے کئی گیت بھی لکھے۔ ایک مثال ملاحظہ ہو:

حسن تو بے شمار آنکھوں میں ہے
حسین آنکھیں اور بھی ہیں
لیکن تیری آنکھوں میں بسا ہوا ہے پریم رس
نلنی او نلنی

ٹیگور کی زندگی پر نلنی کی محبت کا جو اثر تھا اس کا ایک بین ثبوت یہ بھی ہے کہ نلنی کی موت کے بعد 1883 میں جب ٹیگور ازدواجی زندگی سے منسلک ہوئے تو انھوں نے اپنی بیوی پھولی کا نام نلنی رکھا جو آگے چل کر مرنالنی کے نام سے مشہور ہوئیں۔ 'انا' یعنی نلنی کے انتقال کے بعد ٹیگور نے کئی دفعہ مختلف ممالک کا سفر کیا جہاں مختلف حسینائیں ان کے دل پر محبت کا تیر چلاتی رہیں ان حسیناؤں میں مس مول، مس وسوالڈ، وکٹوریہ، مس لانگ، مس ویو با اور لوسی اسکاٹ وغیرہ کا نام خاص اہمیت کا حامل ہے۔

ٹیگور کے مقابلے میں اقبال کے پاس محبت کی جو فہرست ہے اس میں حسیناؤں کی تعداد بہت مختصر ہے۔ اس سلسلے میں ہمیں صرف محترمہ ویگے ناست اور عطیہ بیگم کا نام ملتا ہے۔ ویگے ناست سے اقبال کی ملاقات جرمنی میں ہوئی تھی۔ ویگے ناست حسین ہونے کے ساتھ ساتھ فلسفہ کی تعلیم بھی دیا کرتی تھیں۔ اقبال نے ان سے کتنا فلسفہ سیکھا یہ تو پتہ نہیں چلتا

البتہ محبت کا فلسفہ ضرور سیکھ لیا تھا۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:

"آپ کا خط موصول ہوا ہے۔ اور اس سے مجھے بڑی مسرت ہوئی ہے۔ میں ہمیشہ آپ کے بارے میں سوچتا رہتا ہوں اور میرا دل ہمیشہ بڑے خوبصورت خیالوں سے معمور رہتا ہے۔ ایک شرارہ سے ایک شعلہ اٹھتا ہے اور ایک شعلہ سے بڑا الاؤ روشن ہوتا ہے۔ لیکن آپ سرد مہر ہیں غفلت شعار ہیں"

رسالہ انشاء، ادیبوں کی حیات معاشقہ نمبر، ص 199

یہ تو مس ویگے ناست تھی۔ جو کچھ پل کے لیے اقبال کی زندگی میں آئی اور چلی گئی لیکن زندگی بھر اقبال جس خاتون کا دم بھرتے رہے وہ عطیہ بیگم ہے۔ اقبال کی عطیہ سے ملاقات یورپ میں ہوئی اور دل دے بیٹھے۔

حسن کی تاثیر پر غالب نہ آسکتا تھا علم
اتنی نادانی — جہاں کے سارے داناؤں میں تھی

اقبال

اقبال کا عطیہ بیگم سے جو رشتہ تھا اس کا خلاصہ ہمیں ان کے خطوط جو Iqbal's letters to Attiya Begum کے نام سے شائع ہوئے ہیں، میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ان خطوط کے ذریعہ ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اقبال نے اپنی کئی نظمیں عطیہ کو خط کے ذریعے ارسال کی تھیں ان خطوط کو پڑھنے کے بعد ہمارے ذہن میں جو خیال آتا ہے وہ یہی کہ شاید یہ اقبال کا Approaching way of love رہا ہو۔ یوں تو Iqbal's letters to Attiya Begum میں اقبال کے وہ سارے خطوط موجود ہیں جو کبھی انھوں نے عطیہ کو لکھے تھے۔ لیکن ایک خط جس میں اقبال نے بانگ درا میں شامل ایک نظم عطیہ بیگم کی خدمت میں پیش کی تھی اس کے بارے میں کچھ پتہ نہیں چلتا۔ خط میں اقبال نے کیا لکھا تھا یا عطیہ نے اس خط کو مجموعہ میں شامل کیوں نہیں کیا ایک تحقیق طلب امر ہے۔ ڈاکٹر تارا چرن رستوگی اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

نہ معلوم کیوں عطیہ نے کلی کے عنوان سے بانگ درا میں مشمول اشعار کا ذکر نہیں کیا۔ اعجاز احمد نے 'مظلوم اقبال' میں لکھا ہے کہ یہ نظم بھی عطیہ کو پیش کی گئی تھی۔ پہلا شعر ہے:

جب دکھاتی ہے سحر عارض رنگیں اپنا
کھول دیتی ہے کلی سینۂ زریں اپنا

عطیہ نے یہ خط کیوں نہیں شامل کیا۔ غالباً کوئی راز ہوگا۔ ناشنیدہ نغمات شنیدہ نغمات سے زیادہ شیریں ہوتے ہیں۔

رسالہ انشاء، ادیبوں کی حیات معاشقہ نمبر، ص 203

اقبال نے یقیناً عطیہ سے محبت کی ہوگی جس کا اظہار انہوں نے وقتاً فوقتاً اپنے اشعار اور خطوط میں کیا ہے۔ یہاں بحیثیت راقم الحروف اس بات کو صاف کر دوں کہ ٹیگور اور اقبال کی زندگی کے اس پہلو کو ضبط تحریر میں لانے کا مقصد صرف یہ بتانا ہے کہ دوسرے انسانوں کی طرح یہ دونوں بھی چلتے پھرتے انسان تھے۔ فرشتے نہیں۔ ان کے سینے میں بھی دل تھا جو دھڑکنے کے علاوہ محبت کرنا بھی جانتا تھا۔ ٹیگور و اقبال کی رومانی زندگی کا مطالعہ کرتے وقت جو چیز ہمیں سب سے زیادہ متاثر کرتی ہے وہ یہ ہے کہ ذاتی زندگی میں اتنے غم برداشت کرنے کے باوجود دونوں عملی زندگی میں کتنے سرگرم نظر آتے ہیں اور شاید یہی وہ خوبی ہے جس میں ان کی عظمت کا راز پوشیدہ ہے۔

اپنے اس مضمون کو میں اس بات پر ختم کرنا چاہوں گا کہ بلاشبہ ٹیگور اور اقبال شاعر ہی نہیں تھے بلکہ انسان کامل بھی تھے اور اس کامیابی کے پیچھے ان کی اعلیٰ فکر، گہرے تجربات اور ذاتی معاملات کا بڑا دخل ہے۔ ان دونوں نے شاعری کو ایک نئی سمت اور نیا اسلوب عطا کیا۔ تصوف، محبت، عمل و حرکت، ہمدردی اور اخوت انسانی وغیرہ کی مثالیں پیش کیں اور اپنے پیغامات کو اشعار کے قالب میں اتار کر یہ ثابت کر دیا کہ شاعری محض دل بہلانے کا نام نہیں بلکہ اس کے ذریعے پیغمبری بھی کی جا سکتی ہے۔

■

Md. Irshad Ali, MH-K, Room No 217,
University of Hyderabad, Hyderabad.500046

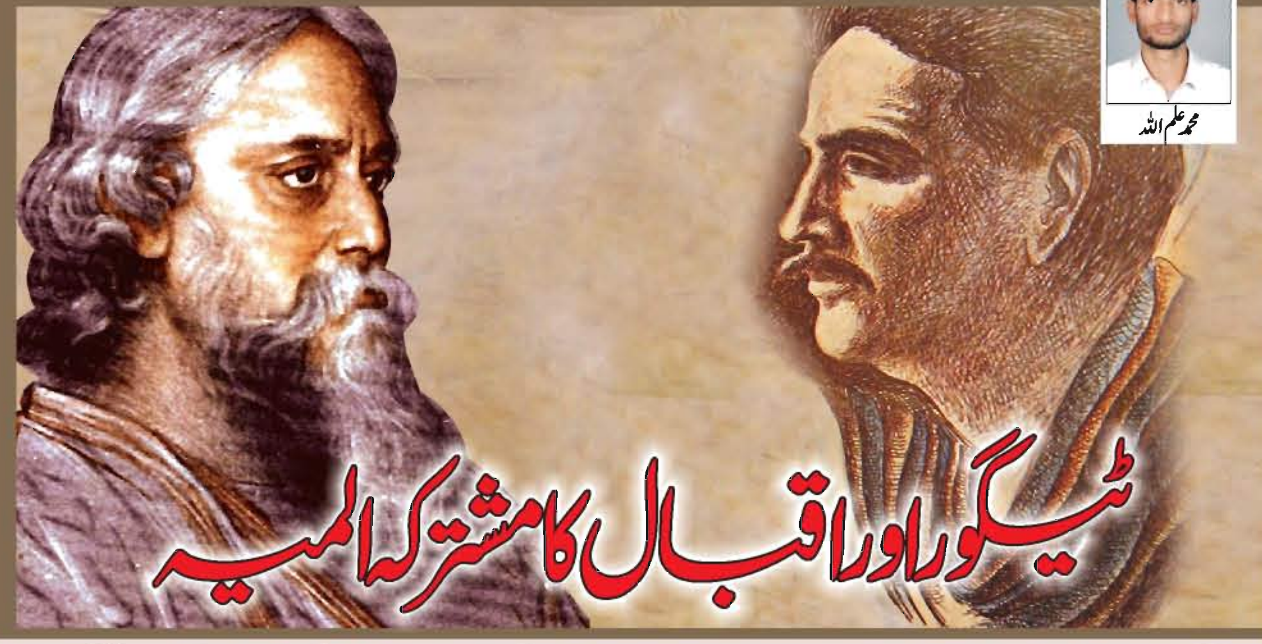

محمد علم اللہ

ٹیگور اور اقبال کا مشترکہ المیہ

ٹیگور اور اقبال دو ایسے فن کار ہیں جن سے برصغیر میں فن اور ادب کے دورِ جدید کا آغاز ہوتا ہے۔ ان دونوں نے محض شاعری ہی نہیں کی بلکہ ان کا فکر و فلسفہ فن کے کئی جہات کا احاطہ کرتا ہے۔ شاید اسی بنا پر جہاں ایک طرف ٹیگور کو گرو دیو کہا گیا تو اقبال کو بھی علامہ کے لقب سے ملقب کیا گیا، دونوں کے معنی کم و بیش ایک ہی ہیں یعنی بہت زیادہ جاننے والا، محترم استاد، عالم فاضل اور دانشور وغیرہ۔

دونوں کی اہمیت کو سمجھنے کے لیے بات کا آغاز 1920 میں ای ایم فاسٹر (بیسویں صدی کے اہم ناول نگار) کے اس اقتباس سے کرتے ہیں:

”یہ ہمارے شہنشاہانہ طرزِ حکومت کا ایک کرشمہ ہے کہ اقبال جیسا شاعر، جس کا نام گزشتہ دس برسوں سے اس کے وطن ہندوستان میں بچے بچے کی زبان پر ہے، اس کے کلام کا ترجمہ اس طویل مدت کے بعد جا کر ہماری زبان میں ہو سکا۔ ہندوؤں میں جو مرتبہ ٹیگور کو حاصل ہے، وہی مسلمانوں میں اقبال کو ہے اور زیادہ صحیح طور پر ہے، اس لیے کہ ٹیگور کو بنگال سے باہر اس وقت تک کسی نے نہیں پوچھا جب تک وہ یورپ جا کر نوبل پرائز نہ حاصل کر لائے۔ برخلاف اس کے اقبال کی شہرت یورپ کی اعانت سے بالکل مستغنی ہے۔“

یہ الفاظ ایڈورڈ مورگن فاسٹر (1879-1970) نے اے آر نکلسن کے ذریعے کیے گئے انگریزی ترجمہ اسرار خودی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھے، جو دسمبر 1920 کے ادبی جریدہ Athanacum میں شائع ہوا اور پھر بعد میں اسی کو رفعت حسین نے اپنی کتاب The Sword and Scepter میں شامل کیا۔ یہ اقتباس وہیں سے ماخوذ ہے جس کا اردو ترجمہ یہاں پیش کیا گیا ہے۔

یہ تو ای ایم فاسٹر کا خیال ہے جو شاید اقبال سے بہت متاثر تھے، لیکن اس سے ٹیگور کی اہمیت کم نہیں ہو جاتی یا صرف ان کے کہنے کی وجہ سے اقبال کی اہمیت بڑھ نہیں جاتی۔ اس اقتباس کو پیش کرنے سے ہمارا مقصد صرف یہ واضح کرنا ہے کہ مشرق کی دو عبقری شخصیات کو مغرب کس زاویہ نگاہ سے دیکھتا ہے، ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ دونوں نے تمام ہندوستان کو حد درجہ متاثر کیا۔ دونوں نے ادب اور شاعری کے علاوہ سماجی، تعلیمی، اور سیاسی فکر کے شعبوں میں جو خدمات انجام دی ہیں ان کی قدر و قیمت بیش از اندازہ ہے۔ دونوں عمدہ انسانی صفات کا ایسا مظہر تھے جنھوں نے بعد کی نسلوں کے ذہنوں کو متاثر کیا اور ان کی صحیح سمتوں کی طرف رہنمائی کی، دونوں کا اہم کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے مشرق و مغرب، جدید اور قدیم، ملک میں جاری قومیت کی لہر اور بین الاقوامیت کے درمیان امتزاج پیدا کیا۔

ٹیگور اور اقبال دونوں ہم عصر تھے دونوں کا ہتھیار ان کا قلم تھا، یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ دونوں کے افکار و خیالات میں مطابقت کے ساتھ ساتھ اختلاف بھی ہے۔ اقبال بیسویں صدی کے شاعر، فلسفی اور حکیم الامت تھے۔ انھوں نے قوم مسلم کو ایک نیا اندازِ فکر دیا، ساتھ ہی بیداریِ نفس اور خودی کی شناخت کا وہ نظریہ دیا جس نے ضمیر کو زندہ کیا اور دلوں کو جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ علامہ اقبال ان احساسات کے نقیب تھے جنھیں اصطلاح کی زبان میں تکوینی اور باطنی آگاہی سے تعبیر کیا جاتا ہے، ایک ایسا احساس جس میں آدمی خود کو خدا کی معرفت کی خاطر گم کر دیتا ہے، فکرِ اقبال کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ اقبال خدا کے تصور میں اگر ایک طرف بے خود ہونے کی کوشش کرتے ہیں تو دوسری طرف خودی کو اعتبار سے حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

وہیں ٹیگور ایک دوسرے کینوس میں جلوہ گر نظر آتے ہیں، وہ شاعر، ناول نگار، افسانہ نگار، گیت کار، موسیقی ساز (میوزک کمپوزر)، مقالہ نویس، سیاستداں، ماہر تعلیم، فلسفی اور مصور کے علاوہ ایک اسٹیج اداکار کی حیثیت سے بھی اپنی پہچان رکھتے ہیں، انھوں نے ایک اچھے تاجر کی حیثیت سے بھی اپنی شناخت بنائی۔ انھوں نے اپنے بھائی کی طرح زمینی حقائق سے منھ موڑنا پسند نہیں کیا۔ بلکہ اکثر و بیشتر تو ایسا ہوا کہ وہ اپنی تلاش، جستجو اور جد و جہد میں کامیاب رہے اور اپنے تمام تر مقاصد کو پا لیا۔ یہاں تک کہ کبیر کے 'انہد ڈھول' سے بھی آگے بڑھ گئے جسے اس فن کا آخری شہ پارہ تصور کیا جاتا تھا۔ انھوں نے غم، مایوسی، امید، آنسو اور خوشی کے نغموں کو نہ صرف لکھنا جاری رکھا بلکہ ان ہی کی زبان میں ”انھوں نے جیسا سوچا ویسا ہی کیا، یعنی کلیوں کو پھول بنا دیا۔“

دونوں کے نظریات کو سمجھنے کے لیے یہاں پر میں دو نظموں کے ایک ایک ٹکڑے نقل کر رہا ہوں، اس سے دونوں کے فکر و فلسفے کا اندازہ لگایا جا سکے گا۔ پہلا ٹکڑا علامہ اقبال کی نظم فلسفۂ غم سے ماخوذ ہے، جبکہ دوسرا ٹیگور کی نظم 'سر تھا کتا' سے۔ دونوں میں محبوب کی موت سے ہونے والے غم اور احساس کا ذکر کیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہوں فلسفۂ 'غم' سے اقبال کے یہ چند اشعار:

ایک بھی پتی اگر کم ہو تو وہ گل ہی نہیں
جو خزاں نادیدہ ہو بلبل، وہ بلبل ہی نہیں
آرزو کے خون سے رنگیں ہے دل کی داستاں
نغمۂ انسانیت کامل نہیں غیر از فغاں
غم جوانی کو جگا دیتا ہے لطفِ خواب سے
ساز یہ بیدار ہوتا ہے اسی مضراب سے
شام جس کی آشنائے نالۂ 'یا رب' نہیں
جلوہ پیرا جس کی شب میں اشک کے کوکب نہیں
ہاتھ جس گل چیں کا ہے محفوظ نوکِ خار سے
عشق جس کا بے خبر ہے ہجر کے آزار سے
کلفتِ غم گرچہ اس کے روز و شب سے دور ہے
زندگی کا راز اس کی آنکھ سے مستور ہے
ہے ابد کے نسخۂ دیرینہ کی تمہید عشق
عقلِ انسانی ہے فانی، زندۂ جاوید عشق
عشق کے خورشید سے شامِ اجل شرمندہ ہے
عشق سوزِ زندگی ہے، تا ابد پائندہ ہے

اور اب ٹیگور کے چند اشعار کا ترجمہ ملاحظہ کریں جو انھوں نے اپنی جوان بیوی کی موت کے بعد لکھے (پھر انھوں نے دوبارہ شادی نہیں کی)۔ قارئین ٹیگور کو پڑھتے وقت ایک ذاتی تجربہ محسوس کریں گے کیوں کہ ٹیگور عام طور پر تجربے کو بنیاد بنا کر بات کرتے ہیں اس لیے اس میں اس کا عکس صاف جھلکتا ہے:

”تم نے میری زندگی کو موت کی خوبصورت لذت سے آشنا کر دیا ہے۔ تم نے میرے قلب کو ابدی فراق کی روشنی سے معمور کر دیا ہے اور میرے خیالات کو آفتاب کی شعاعوں کی طرح رنگین اور روشن کر دیا ہے۔ زندگی کے افق کو ایسی عظمت بخشی ہے جس کا تصور بھی ممکن نہیں۔ اشکوں کی طرح شفاف آسمان پر جنت کے نشاں واضح نظر آ رہے ہیں۔ تم نے میری زندگی کو موت کی خوبصورت لذت سے آشنا کر دیا ہے۔

تم نے اپنی بانہوں میں میری زندگی اور موت قبول کر لی ہے۔ تم نے موت پر اپنی روح کا انکشاف کر کے موت کو دائمی کر دیا ہے۔ تم نے موت کو زندگی کا محبوب بنا دیا ہے۔ تم نے دروازے کھول دیے ہیں اور ابدی پردہ داری کو ختم کر دیا ہے، تم زندگی اور موت کے بیچ میں خاموش کھڑی ہو۔ تم نے اپنی بانہوں میں میری زندگی اور موت قبول کر لی ہے۔“ سمارا صفحہ 250

ٹیگور کے نظریہ کی حقیقت یہ ہے کہ خدا اس کے لیے کوئی بیرونی قوت نہیں ہے۔ گیتانجلی کی ایک نظم میں وہ محسوس کرتے ہیں کہ خدا اپنی تخلیقات کو شاعر کی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا ہے۔ اور وہ شاعر کے کانوں سے ابدی نغموں کو سنتا ہے۔ ایسی منظر کشی ان کی شاعری میں بیشتر مقامات پر ملتی ہے۔ زندگی کی محدودیت کو تسلیم کر کے وہ روح کو اسی زندگی میں آزاد کرانے کی جستجو کرتے ہیں۔ وہ زندگی اور موت دونوں کی حقیقت کو دل سے تسلیم کرتے ہیں۔ حقیقت میں، ایک نظم میں، جو 30 جولائی 1941 کو لکھی گئی، وہ کہتے ہیں کہ انھوں نے اس میں قریب الوقوع موت کا سایہ دیکھا ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ خوف محسوس نہیں کرتے۔ وہ اس کو سلیقے سے لفظوں کا روپ دیتے ہیں۔ اس کے چند ہی ماہ بعد واقعی ان کا انتقال ہو جاتا ہے۔ ان کی نظم کا یہ حصہ ملاحظہ کیجیے:

”میں آج اپنی پیدائش والے دن میں کھویا ہوا ہوں۔ دوستو! میرے قریب آؤ، آؤ مجھے مس کرو، مجھے اس دنیا کو آخری بار چھونے دو آخری بار چھونے دو، زندگی جو مجھے آخری بار دیتی ہے لینے دو، مجھے آخری آشیرواد دو، آج میری جھولی سب خالی ہے۔ جو کچھ مجھے دینا تھا، وہ سب کچھ میں نے دے دیا ہے۔ بدلے میں جو بھی مجھے ملے گا، کچھ پیار، کچھ معافی، وہ سب میں اپنے ساتھ لے چلوں گا۔ جب اس کشتی پہ پاؤں رکھوں گا، جو لے چلے گی مجھے، سب لفظوں کے میلوں کے پار۔“

سگی، آر (2006)، گرودیو رابندر ناتھ ٹیگور اے بایوگرافی، ڈائمنڈ کتب /اشاعت: 1 اکتوبر/-ISBN 978-81-89182-90

اقبال کے نزدیک زندگی اور موت دونوں اپنے اندر

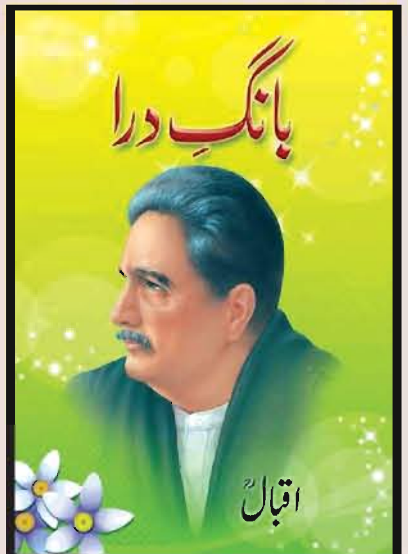

قوّتِ تسخیر رکھتی ہیں:

ہے لحد اس قوّتِ آشفتہ کی شیرازہ بند
ڈالتی ہے گردنِ گردوں میں جو اپنی کمند

بانگِ درا، نظم 'والدہ مرحومہ کی یاد میں'، صفحہ 871

آشکارا ہے یہ اپنی قوّتِ تسخیر سے
گرچہ اک مٹی کے پیکر میں نہاں ہے زندگی

بانگِ درا، نظم 'خضرِ راہ'، صفحہ 991

اقبال اور ٹیگور کے نظریات میں بھی واضح فرق ہے۔ اقبال کے افکار بنیادی طور پر منطقی ہیں۔ اقبال جرمن فلسفی نطشے کے فلسفے سے بے حد متاثر ہیں۔ یہ بات اقبال کے کلام سے اس وقت ثابت ہوتی ہے جب وہ زندگی کے ابدی حقائق سے اختلاف کرتے نظر آتے ہیں:

زمین و آسماں را بر مرادِ خویش می خواہد
غبارِ راہ و با تقدیرِ یزداں داوری کردہ

زبورِ عجم (اقبال)

(انسان زمین و آسماں کو اپنی مرضی کے مطابق کرنا چاہتا ہے۔ وہ اگرچہ غبارِ راہ ہے لیکن خدائی فیصلوں میں دخل اندازی کرنے چلا ہے۔)

اقبال ایک دوسرے ہی کردار کے حامل تھے۔ وہ کوئی صوفی سنت نہیں تھے۔ انھوں نے سوچ سمجھ کر ایک متنازعہ کردار کا انتخاب کیا۔ انھوں نے خوابیدہ مسلم قوم کو بیدار کرنے کی ٹھانی۔ انھوں نے دو معروف نظموں شکوہ اور جواب شکوہ میں خدا سے مباحثہ کیا۔ مگر اس میں جو چیز قابل توجہ ہے وہ یہ ہے کہ انھوں نے روایت پر مبنی اسلامی فکر سے ہٹ کر ایک الگ نظریہ پیش کیا، جس میں انھوں نے اس رول کو بھی نظر انداز کر دیا ہے جس میں اسلامی عقائد کو لے کر عجز پسندی کا رویہ اپنایا گیا ہے۔ اس چیز کو اگر گہرائی سے دیکھیں تو اس میں ایک سیاسی مشق یا تمرین بھی دکھائی دیتی ہے اور خدا کے الفاظ میں اس بات کی وضاحت کی جاتی ہے کہ مسلم قوم کے مسائل کیا ہیں۔ اس میں وہ اللہ، قرآن، محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور کعبہ کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ مسلمان تو ان تمام چیزوں پر یقین رکھتے ہیں اس کے باوجود وہ بٹے ہوئے ہیں، پھر وہ انھیں غیرت دلاتے ہیں اور کہتے ہیں ”کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک۔“

ٹیگور بھی سیاست کی اثر اندازی سے نا آشنا نہیں تھے، اگرچہ وہ بنگال کے بٹوارے کے خلاف احتجاج اور سودیشی تحریک کے لیے فعال بھی رہے، پھر بھی وہ عملی سیاست سے کنارہ کش ہی رہے، انھیں محسوس ہوا کہ سیاسی قوتوں سے نمٹنا آسان نہیں ہے، اس لیے سیاست کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ دیا، تاہم صلح و مشاورت کے لیے ہمیشہ دروازے کھلے رکھے۔ ٹیگور کو یہ بات اچھی طرح معلوم تھی کہ سیاسی زندگی قومی زندگی کا محض ایک ادنیٰ سا حصہ ہے۔ اگر نظامِ معیشت اور دانشورانہ صلاحیتوں پر توجہ مرکوز نہ کی گئی تو یہ تمام تحریکیں اپنی موت آپ مر جائیں گی۔ ان کی پوری زندگی 'اپنا کام آپ کرو' کی مصداق نظر آتی ہے اور یوں وہ اپنے والد کی معیشت میں خود کو مصروف کرنے اور اولین فرصت میں ان تمام مسائل سے نجات کا راستہ تلاش کرنا شروع کر دیتے ہیں، وہ اپنے خیالات کو عملی شکل دینے کے لیے شانتی نکیتن کی بنیاد رکھتے ہیں اور کم و بیش اپنے مقصد میں کامیاب بھی نظر آتے ہیں، جس کے نتیجے کے طور پر وشو بھارتی یونیورسٹی کا قیام اور کم از کم ان کی زندگی میں اس ادارے میں پوری دنیا سے طالبان علم کی اس علمی مرکز پر آمد اس کی حیثیت اور اہمیت کو واضح کرتی ہے۔

اس تناظر میں دوسری طرف اقبال فعال مسلم لیگی سیاست میں اہم کردار بن کر ابھرے۔ اس کے لیے فارسی میں فلسفہ پر مبنی بہت سے علمی و تاریخی مقالہ جات تحریر کیے، محض اس امید پر کہ پوری دنیا میں قوم مسلم ایک ہو جائے۔ وہ انگریزی میں بھی لکھتے تھے اس کی بہترین مثال ”تشکیل جدید

الہیات اسلامیہ نامی کتاب ہے جوانھوں نے پہلے انگریزی میں لکھی تھی۔ اس کے برعکس ہندوستانی رہنماؤں کے اصل نظریاتی دانشور، مولانا ابوالکلام آزاد نے بطور زبان اردو کا انتخاب کیا۔ اردو کو کتنی ترقی نصیب ہوتی اگر اقبال بھی جاوید نامہ اردو میں لکھتے!

ٹیگور نے تجریدی موضوعات پر زیادہ لکھا۔ ان کے اظہار خیال کی زبان بنگالی تھی اور اس وجہ سے اس کے ذریعے بنگالی زبان کو اعلیٰ معیار و وقار حاصل ہوا۔ اقبال نے اپنے نظریہ کو منطقی نتیجہ تک پہنچایا اور ایک عالمی مسلم قومیت کے نظریہ کے علم بردار بن گئے۔

ٹیگور ایک عظیم کہانی کار، موسیقی نواز، مصور اور منتظم تھے۔ اقبال فلسفی شاعر اور کسی حد تک سیاست داں بھی تھے۔ لیکن دونوں کو ایک ہی زاویہ نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اگرچہ دونوں میں کافی تفاوت ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اقبال اقتدار یا بندش کے خلاف سرگرم عمل شخص تھے۔ وہ اس بات کی کوشش کرتے رہے کہ انسان بطور خاص مسلم نوجوان کی سوچ نئے سرے سے ان کی اپنی سوچ کے مطابق ہو جائے۔ جبکہ ٹیگور کے یہاں ایسا کچھ نہیں پایا جاتا۔ وہ جانتے ہیں کہ یہ ایک ازلی و ابدی شے کا حصہ ہے جسے دوسرے لفظوں میں لابدی عنصر بھی کہا جاسکتا ہے۔ یہ چیز ذیل کے نمونۂ کلام سے واضح ہوتی ہے۔

اقبال:

اسے صبح ازل انکار کی جرات ہوئی کیونکر
مجھے معلوم کیا، وہ رازداں تیرا ہے یا میرا
محمد بھی ترا جبریل بھی، قرآن بھی تیرا
مگر یہ حرفِ شیریں ترجماں تیرا ہے یا میرا

بال جبریل

ٹیگور:

میں جا رہا ہوں، غروب ہوتے آفتاب نے کہا
کوئی ہے جو میری ذمہ داریاں اپنے سر لے؟
سارے عالم پر خاموشی چھائی رہی
لیکن ایک زمینی چراغ نے جواب دیا
'میں ہوں نا، میں اپنی پوری کوشش کروں گا'

http://www.gutenberg.org/files/33525/33525-h/33525-h.htm

انھوں نے 1940 میں درج ذیل نظم لکھی اور اس کے ایک سال بعد ہی 1941 میں ان کا انتقال ہو گیا۔

"ہر وہ شے جس کی میں نے شدت سے آرزو کی میری دسترس سے چھوٹ گئی اور کہیں غائب ہو گئی۔ میں ایک آزاد اور ہر ضابطہ سے آزاد شعور محسوس کرتا ہوں۔ صبح صادق مجھ پر اُس کی اصل حقیقت واضح ہوتی ہے، وہ صاف ہے پر خالی نہیں، تب مجھے اُپنشد کے ماہر ایک پنڈت کی بات کا احساس ہوا کہ "اگر آسماں بھی خوشیوں سے خالی ہوتا تو جسم وجاں میں زندگی کا کوئی ہیجان باقی نہ رہتا۔"

Celebrating Tagore By Rama D. Datta, Clinton B. Seely صفحہ نمبر 234

دونوں پر ان کی زندگی میں اور موت کے بعد تنقیدیں کی گئیں۔ دونوں ہی عملاً اپنی زندگی میں ہی اپنے اپنے نظریات کے نمائندہ سمجھے جانے لگے۔ کچھ نوجوانوں نے ان کے خلاف بغاوت بھی کی۔ اس سلسلے میں ٹیگور کا ایک خط نقل کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اس سے بہت زیادہ نہ سہی لیکن بہرحال اس کا اندازہ ہو سکے گا کہ اُس وقت ان کے خلاف کیا کچھ کیا جا رہا تھا یا پھر ان کو بدنام کرنے والے کس طرح کا رویہ اپنا رہے تھے، واضح رہے کہ ڈاکٹر رابندرناتھ ٹیگور نے یہ خط علی خان لمعہ حیدرآبادی کے نام لکھا تھا۔ ایک عظیم شاعر کا ایک عظیم شاعر کے بارے میں یہ مکتوب بے حد اہم ہے۔ چونکہ تنگ نظری سے ہٹ کر وسعت قلب کے ساتھ لکھا گیا تھا اس لیے ہر اقبال اور ٹیگور دوست کو عزیز رکھنا چاہیے۔ اصل خط انگریزی میں تھا اس کا ترجمہ پہلی بار نیرنگ خیال سالنامہ 1936 میں شائع ہوا تھا۔ ملاحظہ ہو:

وشو بھارتی۔ شانتی نکیتن، بنگال

7 فروری 1933

محبی مسٹر خان

آپ کے خط اور نظم نے میرے دل پر خاص اثر کیا۔ یہ سن کر بڑی خوشی ہوئی کہ آپ میری اور اپنے شاعر اعظم سر محمد اقبال کی نظموں کے درمیان ایک خاص اندرونی تعلق پاتے ہیں، چونکہ میں اُس زبان سے نابلد ہوں جس میں وہ اپنا کلام فرماتے ہیں اس لیے میرے لیے ناممکن ہے کہ میں ان کی اپج کی گہرائی یا ان کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ لگا سکوں لیکن ان کی عالمگیر شہرت سے مجھے یقین ہوتا ہے کہ ان میں جاودانی علم و ادب کی عظمت ہے۔

بارہا اس چیز نے مجھے تکلیف پہنچائی ہے کہ نقادوں کی ایک جماعت میری اور سر محمد اقبال کی ادبی کوششوں کو ایک دوسرے کے مقابل رکھ کر غلط فہمیاں پھیلانے کی کوشش کرتی ہے یہ رویہ اس ادب کے متعلق بالکل غلط ہے جو انسانی دل و دماغ کے عالمگیر پہلو سے بحث کرتا ہے اور اس طرح تمام ملکوں اور زبانوں کے شعرا اور اہل فن کو ایک برادری میں منسلک کرنے کا سامان پیدا کرتا ہے۔

مجھے یقین ہے کہ سر محمد اقبال اور میں ادب میں صداقت اور حسن کی خاطر کام کرنے والے دو دوست ہیں اور اس جگہ یک جا ہو جاتے ہیں جہاں انسانی دماغ اپنا بہترین ہدیہ 'جاودانی انسان' کے حضور پیش کرتا ہے۔

خیر اندیش

رابندرناتھ ٹیگور

ص 440۔ 4/اوراق گم گشتہ (علامہ اقبال کے بارے میں غیر مدون تحریریں)/بار اول جنوری 1983/مرتبہ: رحیم بخش شاہین ایم اے مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی

اس خط سے ایک تخلیق کار کے صرف کرب کا اظہار نہیں ہوتا بلکہ اس بات کا بھی علم ہوتا ہے کہ وہ اپنے ایک ہم عصر کو کس نگاہ سے دیکھتا ہے اور اس تناظر میں یہ علم ہوتا ہے کہ بنیادی طور پر علامہ اقبال کو دو وجوہ کی بنا پر تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔ ان کی بابت اول یہ کہا جاتا ہے کہ وہ کیسے مسلم علیٰحدہ قومیت کے نظریہ کے بانی اور ہندوستان کے بٹوارے کی بات کرنے والے ہو سکتے ہیں جنھوں نے ایک زمانے میں 'سارے جہاں سے اچھا' جیسی نظم لکھی، اس بابت گفتگو کرتے ہوئے ڈاکٹر مشیر الحق مرحوم لکھتے ہیں:

"جب اقبال کو اس بات کا یقین ہو گیا کہ سارا جہان مسلمانوں کا وطن نہیں بن سکتا تو انھوں نے الٰہ باد کے خطبے میں کھل کر یہ بات کہہ دی کہ اسلامی تہذیب و روایات کو باقی رکھنے کے لیے جتنی سرزمین بھی مل سکے اس پر قناعت کر لینی چاہیے اور اسے ایک تجربہ گاہ کی حیثیت سے استعمال کر کے دوسروں کو سوچنے کا موقع فراہم کرنا چاہیے کہ کہیں اس نئی تجربہ گاہ سے فائدہ نہ اٹھا کر وہ خود اپنا نقصان تو نہیں کر رہے ہیں۔"

ڈاکٹر مشیر الحق: اقبال ایک مسلم سیاسی مفکر، صفحہ 81.80، ناشر: مکتبہ جامعہ نئی دہلی، سنہ اشاعت 2012

ایک جماعت نے ٹیگور پر نقد کرتے ہوئے کہا کہ وہ تجربات کی بنیاد پر کمزور اقدار کی بات کرتے ہیں، وہیں ایک دوسری جماعت ان کے اوپر اس لیے تنقید کرتی ہے کہ ٹیگور اپنے اثر کی وجہ سے دوسروں کے لیے رکاوٹ بن رہے تھے، منصفانہ طور پر دیکھا جائے تو دونوں نظریے اپنی جگہ پر درست ہیں، انھوں نے ایک نئی زبان کی تخلیق کی اور بول چال والی بنگالی زبان کو اس سے نکال کر ایک ادبی زبان کی حیثیت سے متعارف کرایا، جو سنسکرت اور اس جیسی دوسری زنجیروں میں جکڑی ہوئی تھی۔ مگر 1930 کے بعد بنگال میں نئے لکھنے والوں کی جماعت آئی اور انھوں نے ایک نئے فن پارہ اور ادب کی بات کہی۔ مہیت لال مجومدار نے ان تمام کو مدعو کیا اور ایک راہ نکالنے کی کوشش کی جو زمینی حقائق سے قاری کے ذہن کو موڑنے کے ہتھکنڈے اپنا رہے تھے۔

جب نئے مقابل یا مدعی ان کی تحریر کو فرسودہ اور بے کار قرار دے رہے تھے، تب بھی ٹیگور نے اس کے ردعمل میں کسی قسم کی جھنجھلاہٹ یا بیزاری کا اظہار نہیں کیا بلکہ اپنے کام میں پوری دلجمعی سے جٹے رہے۔ بقول ان کے ان کا وجود اپنشد کے روحانی نظریہ سے متاثر تھا، جسے کچھ تو انھوں نے اپنے وجدان اور وژن سے حاصل کیا تھا اور جو کچھ انھیں موروثی طور پر ملا تھا

انھوں نے اس کا اعتراف بھی کیا ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں:

"وید، اپنشد اور گوتم کی تعلیمات سے میں نے روشنی پائی، میں نے ان خزانوں سے اپنی زندگی اور اپنی تعلیمات میں استفادہ کیا"

تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں: شمیم طارق، ٹیگور شناسی، ناشر: ٹیگور ریسرچ اینڈ ٹرانسلیشن اسکیم، شعبہ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی سنہ اشاعت 2013

اس پر تبصرہ کرتے ہوئے شمیم طارق کہتے ہیں:

"لیکن وید و اپنشد سے عقیدت کے باوجود انھوں نے روایتی ہندوستان کے 'افسانوی دیوتاؤں' کو تسلیم نہیں کیا، 'ادویت واد' پر کامل یقین رکھتے تھے جو قدیم ہندو فلسفے کا بنیادی اصول تسلیم کیا گیا ہے۔ وہ اسی ایک خدا کو مانتے تھے جو کائنات کے ذرہ ذرہ میں موجود ہے۔"

وہ خدا جو آگ میں ہے پانی میں ہے
اور جو تمام دنیا پر چھایا ہوا ہے
میں اسی خدا کو پیہم سجدے کرتا ہوں

سندھیا (شام) سنگیت/ بحوالہ: ٹیگور شناسی، صفحہ نمبر 123

ٹیگور خود کہتے ہیں:

"مذہب کا لمس بھی اس اندیکھے بے نام و نشان راستے سے مجھ تک پہنچتا ہے جس راستے سے نظمیں لکھنے کی تحریک میرے پاس آئی ہے، میری مذہبی زندگی نے بھی اپنی نمو کے وہی پُر اسرار راستے اپنائے ہیں جن خطوط پر میری شاعرانہ زندگی چلتی ہے، ایک طرح سے یہ دونوں چیزیں ایک دوسرے سے لازم و ملزوم ہیں اور اگرچہ ان دونوں کا ملاپ بہت پہلے ہو چکا مگر بہت دنوں تک یہ راز مجھ پر نہیں کھل سکا۔"

رابندرناتھ ٹیگور، از ہیرن مئے بنرجی، صفحہ نمبر 118/119

ٹیگور اور اقبال میں فرق ہے تو بس یہ کہ ٹیگور نے ہندو ہونے کے باوجود کسی جماعت یا نصب العین کے حوالے سے نہیں بلکہ صرف ہندوستانیت اور انسانیت کے حوالے سے رنگ و نسل کی رنگا رنگی میں وحدت کے جلوے دیکھے اور عقیدوں، رنگوں، نسلوں اور بولیوں کے باوجود ہندوستان کی دھرتی کی آغوش میں عہد بہ عہد سما جانے والے مختلف نسلی، لسانی و مذہبی گروہوں کو ہندوستانی تسلیم کیا ہے۔

وہیں اقبال ایک ملت یا جماعت کے حوالے سے ایک کلی تصور حیات پیش کرتے ہیں، ایک طرف اگر وہ ترانۂ ہندی سے ہندوستانیوں کا دل جیتتے ہیں تو دوسری جانب نیا شوالہ پیش کر کے برادران وطن کے جذبات کی عکاسی۔ ان کی شاعری یا تحریروں میں ٹالسٹائی، شیکسپیئر، ہیگل، گوئٹے برگساں، بائرن لینن، آئنسٹائن کے علاوہ رام، گوتم بدھ، شیو، بھرتری ہری، شنکراچاریہ اور گرونانک وغیرہ کا ذکر بھی ملتا ہے، لیکن اس کے باوجود اقبال کو تنقید کا نشانہ بنایا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ اقبال تشدد پسند اور بنیاد پرست تھے جو ادب میں بھی ایک خاص فکر کو ملحوظ رکھتے تھے۔ اس بابت گفتگو کرتے ہوئے علی سردار جعفری کہتے ہیں:

"اقبال کی شخصیت کی تعمیر میں کشمیری برہمن کا دماغ، مسلمان کا دل، قران کریم کی تعلیمات، مغربی علوم، ہندو فلسفہ، جلال الدین رومی اور غالب کی شاعری اور مارکس و لینن کے انقلابی تصورات سب شامل ہیں:

خرد افزود مرا درس حکیمان فرنگ
سینہ افروخت مر اصحبت صاحب نظراں

(مغربی مفکروں کے پڑھائے ہوئے سبق نے میری عقل میں اضافے کیے لیکن میرے سینے کو عارفوں کی نگاہ نے روشن کیا ہے)"

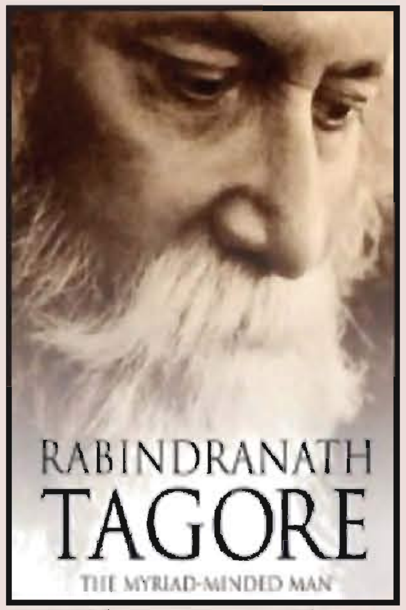

اقبال شناسی/علی سردار جعفری: مکتبہ جامعہ نئی دہلی۔ صفحہ نمبر 29

علی سردار جعفری نے ٹیگور اور اقبال کی مخالفت کے حوالے سے بڑی عمدہ بات کہی ہے:

"ہمارے عہد کے شاعر، ادیب اور قومی رہنما اکثر مختلف قسم کی تاویلوں کے شکار ہوتے رہتے ہیں، اس سے مہاتما گاندھی اور جواہر لال تک محفوظ نہیں ہیں۔ 1948-49 میں بنگال کے کمیونسٹ رہنما بھوانی سین نے اپنی انتہا پسندی میں ٹیگور کو رجعت پرست ثابت کر دیا تھا، اور ایک پورا گروہ اس پر ایمان لے آیا تھا، اسی طرح ہندوستان کے ایک گروہ نے سیاست کے نشے میں اقبال پر مسلم فرقہ پرستی کا الزام لگا کر انھیں قابل مذمت قرار دے دیا اور یہ بات پچیس سال تک مستند سمجھی جاتی رہی، اب اس کی تلافی کسی حد تک اندر کمار گجرال کی رہنمائی میں آل انڈیا ریڈیو نے کی ہے لیکن چند سال کے اندر اقبال کے جشن ولادت پر پورے ہندوستان کو اس نقصان کی تلافی کرنی چاہیے۔"

علی سردار جعفری، اقبال شناسی، صفحہ نمبر 22-23 مکتبہ جامعہ نئی دہلی سنہ اشاعت 2011

ان دو شخصیتوں کو گزرے ہوئے نصف سے بھی زیادہ صدی گزر چکی ہے، تو اب ہم انھیں کس نظر سے دیکھیں یا کس زاویہ سے ناپیں، دونوں نے انسان کی روحانی آزادی کے لیے کام کیا، دونوں کے سوچنے کا نظریہ الگ تھا، ٹیگور جس قسم کی آزادی چاہ رہے تھے اور جیسی آزادی اقبال کو مقصود تھی دونوں میں کافی فرق تھا، ہو سکتا ہے جیسا کہ کچھ لوگوں کا الزام ہے کہ وہ لوگ اپنے معاصرین اور ان کے زمانے کے کامیاب لوگوں کے درمیان حائل رہے ہوں، لیکن ہم نے ٹیگور اور اقبال کا جو نظریہ تھا اسے پس پشت ڈال دیا تاکہ ہم اپنے طریقے سے نظریہ کو لاگو کر سکیں۔

مگر اس کی وجہ سے ان دونوں کی اہمیت ختم نہیں ہو جاتی۔ اقبال کے نظریات سے ہندوستان میں بہت سے لوگ اتفاق نہیں رکھتے ہیں اور ایک بڑا اردو داں طبقہ بھی ان سے دوری اختیار کیے ہوئے ہے اور اسی طرح ٹیگور سے بھی لوگ بہت خوش نہیں تھے اور اب بھی نہیں ہیں، اہل بنگال جن کو ان کا شکر گذار ہونا چاہیے کہ انھوں نے ان سے منسوب ایک نئی زبان کو متعارف کرایا ان کے ساتھ بھی مسئلہ یہ ہے کہ وہ ایک جانب تو انھیں پوجتے تھے اور دوسری جانب رفتہ رفتہ انھیں بھول بھی گئے، مگر محض اہل بنگال پر ہی الزام کیوں عائد کیا جائے؟

یہی حال پاکستان میں اقبال اور فیض کے ساتھ روا ہے، ان کی سال گرہوں پر میٹنگیں ہوتی ہیں، ان کی غزلیں بھی گنگنائی جاتی ہیں، بہت سارے قوال ان کے کلام پر قبضہ جما کر 'خودی کو کر...، 'خودی کو کر...' کی رٹ لگاتے ہیں مگر انھیں وہ مقام دینے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

علامہ اقبال اور ٹیگور ہوش و حواس پر مبنی زندگی گزارتے تھے اور ویسا ہی رہنا چاہتے تھے اور اس ناگزیر حقیقت کو تسلیم کرتے تھے۔ دونوں ایک ایسا جہان آباد کرنا چاہتے تھے جہاں دلوں میں کوئی خوف و دہشت نہ ہو، ان کا ماننا تھا کہ انسانیت کے وجود کا راز احترام انسانیت میں مضمر ہے۔ ان کی عظمت عبارت تھی اس جذبے سے جو ایک ایسے معاشرے کو وجود میں لانے کے لیے اپنی فکر و نظر کی پوری سچائی کے ساتھ مصروف عمل رہے جہاں خیر و شر کی جنگ میں خیر کی فتح ہو۔

نوٹ: ٹیگور کے دستیاب ترجموں کو اصل سے ملانے پر ان میں کافی فرق نظر آتا ہے، اس لیے مضمون میں شامل تمام اشعار کا ترجمہ راقم نے انگریزی زبان سے خود کیا ہے۔

Mohd Alamullah, E-26,Abul Fazal Enclave, Jamia Nagar, Okhla, New Delhi–110025

فرحت زیبا

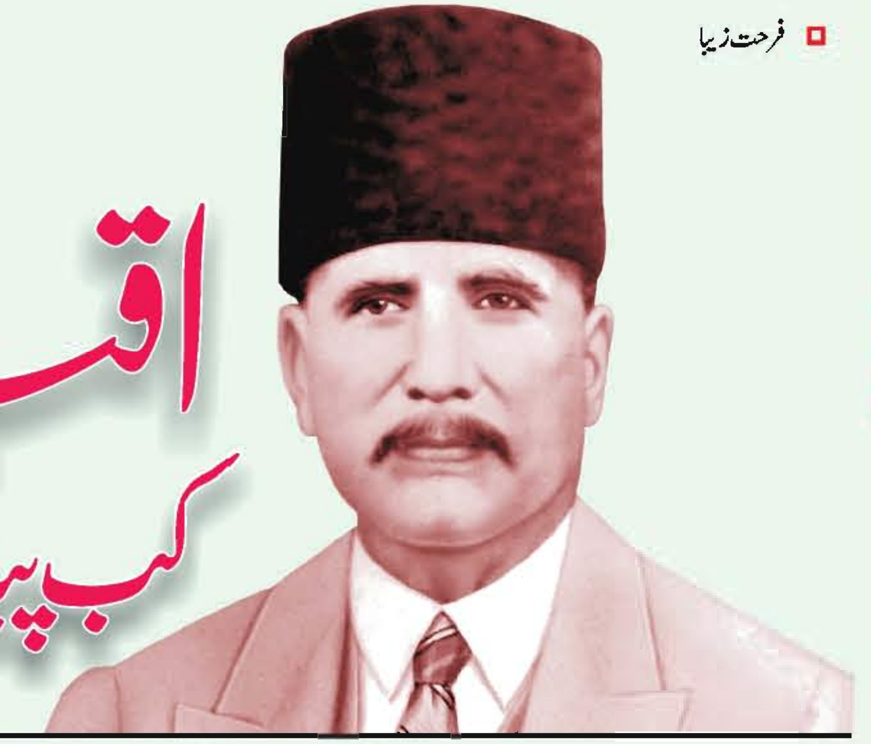

اقبال کب پیدا ہوئے؟

اقبال کا تعلق کشمیری برہمنوں کے ایک قدیم خاندان سے ہے اور گوت ان کی سپرو ہے۔ اقبال نے اسی بنا پر اپنی قومیت سپرو 'کشمیری پنڈت' تحریر کی ہے۔ واضح ہو کہ اقبال نے اپنے جداعلیٰ کے بارے میں اپنے والد کی روایت آنکھ بند کر کے قبول نہیں کی بلکہ اس کی تصدیق کے لیے باضابطہ تحقیق و تفتیش کی اور خاصی دل چسپی لے کر اپنے آبا و اجداد کا سراغ لگایا۔ اپنے برادر شیخ عطا محمد کو اس بابت لکھتے ہوئے انکشاف کرتے ہیں:

"مدت کی جستجو کے بعد آج اپنے بزرگوں کا سراغ مل گیا ہے۔ حضرت بابا لول حاج کشمیر کے مشہور مشائخ میں سے تھے... بارہ سال کشمیر سے باہر رہے بیوی کے ساتھ اچھے تعلقات نہیں تھے، اس واسطے ترک دنیا کر کے کشمیر سے نکل گئے۔ واپس آنے پر اشارہ غیبی پا کر حضرت بابا نصرالدین کے مرید ہوئے... اور اپنے مرشد کے جوار میں مدفون ہیں۔"[1]

"والد مرحوم کہتے تھے کہ یہ نام کشمیر کے برہمنوں نے اپنے ان بھائی بندوں کو دیا تھا جنھوں نے قدیم رسوم و تعصّبات قومی و مذہبی کو چھوڑ کر سب سے پہلے اسلامی زبان و علوم کو سیکھنا شروع کیا تھا جو رفتہ رفتہ ایک مستقل گوت ہو کر مشہور ہو گیا..."[2]

عبدالمجید سالک اقبال کے جداعلیٰ کو بابا صالح کے نام سے موسوم کرتے ہیں، جنھوں نے ایک سید بزرگ کے ذریعے جو کہیں باہر سے تشریف لائے تھے، مشرف بہ اسلام ہونے کے بعد صالح نام پایا اور اپنے تقویٰ اور پرہیزگاری کی وجہ سے بابا صالح کے نام سے پکارے جانے لگے۔[3]

جگن ناتھ آزاد بھی بابا صالح ہی کو علامہ کا جدامجد تسلیم کرتے ہیں۔ انھوں نے اقبال کے شجرۂ نسب کی ابتدا بابا صالح ہی سے کی ہے مگر یہ قرین قیاس نہیں معلوم ہوتا۔ بابا لول حاج جیسا کہ اعجاز احمد کی تحقیق سے ظاہر ہے۔ پندرہویں صدی میں مشرف بہ اسلام ہوئے جبکہ بابا صالح نے ان کے بعد سترہویں صدی میں اسلام قبول کیا (ملاحظہ ہو اقبال کا شجرۂ نسب مرتبہ جگن ناتھ آزاد) اس لیے اقبال کے جداعلیٰ کی حیثیت بابا لول کی بابا صالح پر فوقیت ظاہر ہے۔ یہ تو ٹھیک ہے کہ اقبال ایک کشمیری برہمن خاندان کے چشم و چراغ تھے مگر یہ کہنا (جیسا کہ عبدالمجید سالک صاحب فرماتے ہیں اور جگن ناتھ آزاد بھی اس کی ہم نوائی کرتے ہیں) کہ یہ خاندان ڈھائی تین سو سال پیش تر 17ویں صدی میں مشرف بہ اسلام ہوا، درست نہیں معلوم ہوتا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ کوئی پانچ سو سال قبل ہی یہ خاندان اسلام قبول کر چکا تھا اور کشمیر کے توطن کو نامساعد حالات میں خیرباد کہہ کر سیالکوٹ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ علامہ کے آبا و اجداد کب کشمیر سے ہجرت کر کے سیالکوٹ منتقل ہوئے، اس کے بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔[4] عبدالمجید سالک کے خیال میں 1857 کے ہنگامے فرو ہونے کے بعد بابا صالح کی اولاد کشمیر کے حکمرانوں کی سخت گیری کے باعث دوسرے بے شمار کشمیری خاندانوں کی طرح ہجرت کر کے سیالکوٹ میں مقیم ہوئی۔ معتبر حضرات کا بیان ہے کہ پہلے پہل علامہ اقبال کے دادا نے یہاں سکونت اختیار کی۔ ان کا نام شیخ محمد رفیق تھا لیکن عام کشمیری رواج کے مطابق جس میں رحمانا اور غفارا جیسے عرف مروج ہیں، شیخ رفیقا کہلاتے تھے۔[5]

ڈاکٹر جاوید اقبال جو اس باب میں متعین طور پر کچھ کہنے سے قاصر ہیں، 'روزگار فقیر' کے حوالے سے اس قیاس کا اظہار کرتے ہیں کہ اٹھارہویں صدی کے اخیر میں یا انیسویں صدی کے ابتدائی سالوں میں یہ ہجرت ہوئی ہوگی اور ہجرت کرنے والے بزرگ یا تو علامہ کے دادا کے باپ شیخ جمال الدین تھے یا ان کے چار بیٹے عبدالرحمن، محمد رمضان، محمد رفیق اور عبداللہ۔ یہ تو ثابت ہے کہ انیسویں صدی کے آغاز میں یہ چاروں بھائی سیالکوٹ میں سکونت پذیر تھے۔[6]

اقبال کی یہیں پیدائش ہوئی۔ ان کی تاریخ و سال پیدائش کے باب میں البتہ خاصا اختلاف پایا جاتا ہے۔ محمد طاہر فاروقی مصنف سیرت اقبال اور عبدالمجید سالک مصنف ذکر اقبال نے اقبال کی تاریخ پیدائش 22 فروری 1873 مطابق 24 ذی الحجہ 1989ھ متعین کی ہے۔ فاروقی صاحب کے مطابق پیدائش کی یہ تاریخ سیالکوٹ کے رجسٹر پیدائش سے تصدیق شدہ ہے۔[7] علامہ کا سال پیدائش افغانستان میں ایک مقبرے 'لاپس لازوالی' کے ایک پتھر پر جسے وہاں کی حکومت نے مہیا کیا تھا، 1875 کندہ کیا گیا ہے مگر یہ قیاس آرائی پر مبنی ہونے کی وجہ سے قابل اعتنا نہیں سمجھا جاتا۔[8] محمد دین فوق نے بھی علامہ کا سال پیدائش 1875 قرار دیا تھا مگر اپنی کتب تاریخ اقوام کشمیر میں انھوں نے اس کی تصحیح کرتے ہوئے اسے 1876 قرار دیا ہے۔[9] اس سلسلے میں علامہ کا اپنا بیان زیادہ صحت سے قریب اور معتبر ہے۔ وہ اپنے تحقیقی مقالے 'ایران میں مابعدالطبیعیات کا ارتقا' جس پر انھیں جرمنی کے میونخ یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض ہوئی تھی، کی ابتدا میں اپنے تحریر کردہ تعارفی نوٹ میں اپنی تاریخ پیدائش 3 ذی قعدہ 1294ھ (1876) لکھتے ہیں اور کوئی 23 سال بعد 1931 میں انٹرنیشنل پاسپورٹ کے لیے درخواست دیتے ہوئے اپنی تاریخ پیدائش 1876 ہی درج کرتے ہیں۔ پاسپورٹ کی نقل جاوید اقبال کے پاس محفوظ ہے اور فقیر وحیدالدین نے اس کا عکس 'روزگار فقیر' میں شائع کر دیا تھا۔ فقیر صاحب علامہ کی تاریخ پیدائش 22 فروری 1873 کو، جو میونسپل کمیٹی سیالکوٹ کے رجسٹر میں درج ہے، درست نہیں مانتے، اس باب میں دوسرے شواہد اور قرائن سے قطع نظر ان کی یہ تحقیق بہ طور خاص قابل توجہ ہے کہ 22 فروری 1873 کو علامہ کے والد بزرگوار شیخ نور محمد صاحب (جن کا عرف شیخ نتھو تھا) کے ہاں بالیقین ایک لڑکا پیدا ہوا لیکن اس بات کا کوئی ثبوت نہیں کہ یہ لڑکا علامہ کے علاوہ اور کوئی نہیں یا یہ کہ یہ اندراج علامہ کی ہی پیدائش کے متعلق ہے۔ اس کے برعکس راقم الحروف کی تحقیق کے مطابق یہ اندراج شیخ نور محمد صاحب کے ہاں ایک اور لڑکے کی پیدائش کے متعلق ہے جو علامہ سے تین چار سال پہلے پیدا ہوا اور شیر خواری کی عمر میں وفات پا گیا۔[10] علامہ کے برادرزادہ شیخ اعجاز احمد صاحب بھی اس سے متفق ہیں اور انھوں نے اپنی ایک پھوپھی سے بھی جیسا کہ فقیر صاحب بیان کرتے ہیں،

حیاتِ اقبال: ایک نظر میں

1877	نومبر 9، بروز جمعہ شیخ محمد اقبال شیخ نور محمد کے ہاں سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔	1891	اسکاچ مشن ہائی اسکول سیالکوٹ سے مڈل پاس کیا۔
1893	مئی 4، کریم بی بی سے پہلی شادی ہوئی۔	1893	مئی 4، اسکاچ مشن ہائی اسکول سے میٹرک پاس کیا
1895	اسکاچ مشن ہائی اسکول (جواب کالج بن چکا تھا) سے ایف اے پاس کیا اور اعلیٰ تعلیم کے لیے لاہور منتقل ہو گئے۔		
1895	دسمبر، حکیم شجاع احمد اور دین محمد نے اردو بزمِ مشاعرہ' قائم کی ہوئی تھی۔ اس بزم کے دوسرے اجلاس میں انھوں نے سیالکوٹ سے لاہور منتقلی کے بعد مشاعرے میں پہلی بار شرکت کی اور اپنی غزل 'موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لیے' سنائی۔		
1897	گورنمنٹ کالج لاہور سے بی اے پاس کیا۔	1899	نومبر 12، انجمن حمایت اسلام لاہور کی مجلس انتظامیہ کے رکن منتخب ہوئے۔
1899	انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسے میں نظم 'فریادِ امت' پڑھی۔	1899	گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم اے (فلسفہ) پاس کیا۔
1899	مئی 13، یونیورسٹی اورینٹل کالج میں میکوڈ عریبک ریڈر مقرر ہوئے۔	1901	جنوری 1، اسلامیہ کالج لاہور میں انگریزی کے استاد مقرر ہوئے۔
1900	فروری 14، انجمن حمایت اسلام کے سالانہ اجلاس میں 'نالۂ یتیم' پڑھی۔ اس اجلاس کی صدارت ڈپٹی نذیر احمد نے کی تھی۔		
1911	جولائی 7، عطیہ فیضی کو خط لکھا		
1930	دسمبر 29، مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ الہ آباد کی صدارت فرمائی۔		
1935	اکتوبر 13، وصیت نامہ لکھوایا۔		
1936	جولائی گورنمنٹ کالج لاہور کے مشاعرے میں شرکت کی جہاں انھوں نے فیض احمد فیض کو 'مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ' پڑھنے پر فیض احمد فیض کو بلا کر بہت داد دی۔		
1938	اپریل 20، صبح ناشتے میں دلیے کے ساتھ چائے پی۔ میاں محمد شفیع نے اخبار پڑھ کر سنوایا۔ حجام سے شیو بنوائی۔ شام 4:30 بجے بیرن جان والتھا ئیم ملنے آئے ان کے ساتھ ڈیڑھ گھنٹے تک بات چیت کرتے رہے۔ شام کو اپنا پلنگ خواب گاہ سے اٹھوا کر دالان میں بچھوایا۔ ایک گھنٹے بعد پلنگ گول کمرے میں لانے کو کہا۔ وہاں حسبِ عادت منیزہ ان کے بستر میں گھس کر ان سے لپٹ گئی۔ اس رات معمول سے ہٹ کر زیادہ دیر ان کے ساتھ رہی۔ جب اس کو ہٹنے کے لیے کہا گیا تو وہ نہ ہٹی۔ اس پر انھوں نے انگریزی میں کہا "اسے اُس کی حس آگاہ کر رہی ہے کہ شاید باپ سے یہ آخری ملاقات ہے۔" اس کے وہاں سے چلے جانے کے بعد فاطمہ بیگم، پرنسپل اسلامیہ کالج برائے خواتین نے ملاقات کی۔ رات تقریباً 8 بجے چودھری محمد حسین، سید نذیر نیازی، سید سلامت اللہ شاہ، حکیم محمد حسن قرشی اور راجہ حسن اختر آ گئے۔ ڈاکٹروں کے بورڈ نے ان کا معائنہ کیا۔ اس رات وہ زیادہ ہشاش بشاش نظر آ رہے تھے۔ 11 بجے رات انھیں نیند آ گئی لیکن گھنٹہ بھر سونے کے بعد شانوں میں درد کے باعث جلد بیدار ہو گئے۔ ڈاکٹروں نے خواب آور دوا دینے کی کوشش کی تو انھوں نے کہا کہ "دوا میں افیون کے اجزا ہیں اور میں بے ہوشی کے عالم میں مرنا نہیں چاہتا۔" رات 3 بجے کے قریب ان کی حالت اچانک پھر خراب ہو گئی۔ انھوں نے اپنا پلنگ گول کمرے سے واپس خواب گاہ میں رکھوایا۔		
1938	اپریل 21، بروز جمعرات صبح ڈاکٹر عبدالقیوم اور میاں محمد شفیع فجر کی نماز ادا کرنے مسجد گئے ہوئے تھے تو انھیں پھر سے شدید درد ہوا جس پر انھوں نے 'اللہ' کہا اور پھر... 5 بج کر 14 منٹ پر... اللہ کو پیارے ہو گئے... انا للہ و انا الیہ راجعون۔ 5 بجے شام جاوید منزل سے جنازہ اٹھایا گیا۔ اسلامیہ کالج کے گراؤنڈ میں نمازِ جنازہ ادا کی گئی۔ سیالکوٹ سے شیخ عطا محمد رات نو بجے کے بعد لاہور پہنچے۔ پونے دس بجے رات سپردِ خاک کر دیے گئے۔		
کتابیں	(نثر): علم الاقتصاد: 1903)، (فارسی شاعری): اسرار خودی: 1915، رموزِ بیخودی: 1917، پیام مشرق: 1923، زبور عجم: 1927، جاوید نامہ: 1932، پس چہ باید کرد اے اقوام شرق: 1936، ارمغان حجاز: 1938، (اردو): بانگ درا: 1924، بالِ جبریل: 1935، ضربِ کلیم: 1936، (انگریزی): The Development of Metaphysics in Persia (1908), The Reconstruction of Religious Thought in Islam (1930)		

اس کی تصدیق کرائی تھی۔ فقیر صاحب کا واضح خیال ہے کہ مذکورہ تاریخ پیدائش (22 فروری 1873) علامہ سے متعلق نہیں جسے بلا کسی تحقیق کے تسلیم کرلیا گیا ہے۔ (واضح ہو کہ میونسپل کمیٹی سیالکوٹ کے متعلقہ سرٹیفکیٹ میں جس کا عکس فقیر وحیدالدین صاحب نے اپنی کتاب میں شامل کردیا ہے، درخواست دہندہ کے صحیح نام کا پتہ نہیں چلتا)۔ فقیر وحیدالدین صاحب مزید لکھتے ہیں کہ میونسپل کمیٹی سیالکوٹ کے رجسٹر پیدائش میں 22 فروری 1873 کے اندراج کے بعد 1877 تک علامہ کے والد کے ہاں کسی اور لڑکے کی پیدائش کا اندراج نہیں۔ اس عدم اندراج کی بنا پر، اس لیے کہ رجسٹر پیدائش میں آج کی طرح ہر ایک پیدائش کے اندراج کا اہتمام نہیں کیا جاتا تھا، علامہ کے اپنے بیان کردہ سنہ پیدائش 1876 کو رد نہیں کیا جاسکتا۔ فقیر وحیدالدین صاحب علامہ کے اپنے متعین کردہ سنہ پیدائش 1876 کی توضیح و تنقیح کرتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ علامہ کا صحیح سنہ پیدائش 3 ذیقعدہ 1294ھ کے مطابق عیسوی تاریخ 9 نومبر 1877 ہے، 1876 نہیں۔ معلوم ہوتا ہے حضرت علامہ کو اپنی پیدائش کی تاریخ، مہینہ اور سنہ ہجری کے حساب کے مطابق تو وثوق سے یاد تھے لیکن تحقیقی مقالے کا تعارفی نوٹ لکھتے وقت جو وطن سے باہر لکھا گیا اس کی عیسوی تاریخ، مہینہ اور سنہ سے مطابقت نہ کی جاسکی اور ہجری تاریخ ماہ و سنہ کو زبانی عیسوی تاریخ، ماہ و سال میں منتقل بھی نہیں کیا جاسکتا، لہٰذا انھوں نے سرسری اندازہ کرکے عیسوی سنہ 1876 درج کردیا اور ان کے ذہن میں عیسوی سن پیدائش یہی قائم رہا۔ بہرحال ہجری کے حساب سے انھوں نے تاریخ، مہینے اور سنہ کا تعین کردیا ہے۔ چونکہ ان کی بیان کردہ تاریخ پیدائش 3 ذی قعدہ 1294ھ مطابق 9 نومبر 1877 ہے۔ لہٰذا عیسوی سنہ کے مطابق تاریخ پیدائش 9 نومبر 1877 ہی صحیح ہونی چاہیے نہ کہ 22 فروری 1873۔ علامہ کی وفات پر سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور نے جو نوٹ شائع کیا تھا، اس میں بھی عیسوی سنہ پیدائش 1877 ہی لکھا ہے۔[11]

فقیر صاحب نے یہ بھی واضح کردیا ہے کہ محکمۂ آثار قدیمہ نے علامہ کی لاہور اور سیالکوٹ کی رہائش گاہوں پر جو کتبے نصب کیے ہیں، جن میں سنہ پیدائش 1873 لکھا گیا ہ وہ صریحاً غلط فہمی پر مبنی ہے اور کسی طرح قابل قبول نہیں۔ فقیر صاحب اس سلسلے میں فیصلہ کن انداز میں لکھتے ہیں:

''چونکہ صحیح تاریخ (علامہ کی تاریخ پیدائش) کا تعین ضروری ہے لہٰذا عزیز جاوید اقبال اور شیخ اعجاز احمد (برادرزادہ علامہ اقبال) نے مجھے مشورہ دیا کہ 'روزگار فقیر' کے نقش ثانی میں اس موضوع کا جائزہ لے کر اس غلط فہمی کو رفع کردینا چاہیے اور واضح حقائق کی بنا پر شائع کردینا چاہیے کہ علامہ مرحوم کی اصل تاریخ پیدائش 3 ذی قعد 1294ھ مطابق 9 نومبر 1877 بہ روز جمعہ ہے اور انھوں نے 61 سال کی عمر پائی۔''[12]

پروفیسر آل سرور نے اپنی گراں قدر تصنیف 'دانشور اقبال' شائع شدہ 1994 میں اقبال سے متعلق اہم موضوعات و مباحث کا احاطہ کرتے ہوئے اقبال کی تاریخ ولادت (9 نومبر 1877) کی طرف بھی متوجہ کیا ہے اور اس پر سوالیہ نشان لگاتے ہوئے، اسے نظر ثانی کی محتاج بتایا ہے۔ سرور صاحب درانی کی کتاب 'اقبال یوروپ میں' کے حوالے سے اس رائے کا اظہار کرتے ہیں کہ اقبال 1876 کو اپنی پیدائش کا سال مانتے تھے۔ ان کے خیال میں وحید قریشی اور مالک رام نے اقبال کی پیدائش کے سال کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اسے بھی نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ سرور صاحب کے نزدیک

اقبال اپنے فرزند جاوید اقبال کے ساتھ

اقبال کی پیدائش کا جو سال لکھا گیا ہے (مراد 1876 سے ہے) وہ اس زمانے کے عام دستور کے مطابق اصل سال سے مختلف تھا۔ شمالی ہند میں یہ رواج تھا کہ تعلیم کی مدت اور سرکاری ملازمت کے مطالبات کی روشنی میں عمر چند سال کم لکھائی جاتی تھی۔ یہ دستور اب بھی چلا آتا ہے... لہٰذا اگر درانی کے حساب سے 1876 سال پیدائش ٹھہرتا ہے تو قرین قیاس یہ ہے کہ اصل سال پیدائش 1873 ہونا چاہیے۔ وہ یہ سوال بھی اٹھاتے ہیں کہ آخر جاوید اقبال نے بکھرے خیالات کے پہلے ایڈیشن میں ولایت جاتے وقت اقبال کی عمر بتیس 32 سال کیوں لکھی جسے انھوں نے بعد میں غلطی قرار دیا۔ سرور صاحب اگرچہ 9 نومبر 1877 کی تاریخ کو نظر ثانی کی متقاضی سمجھتے ہیں مگر اسے بالکل مسترد نہیں کرتے۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ فقیر وحیدالدین کے علامہ کی ولادت کے باب میں پیش کردہ دلائل اور شواہد کی بنا پر جن میں کوئی ابہام نہیں 1873 کو ان کا سال پیدائش قرار دینے کا کوئی جواز پیدا نہیں ہوتا اور 9 نومبر 1877 ہی ان کا صحیح سال پیدائش قرار پاتا ہے۔

ڈاکٹر جاوید اقبال کی اس باب میں یہ قطعی رائے بھی ملاحظہ ہو:

''راقم کی رائے میں اقبال کی اپنی بیان کردہ تاریخ ولادت کی مطابقت ان کے تعلیمی ریکارڈ سے 1873 کے مقابلے میں زیادہ سہولت سے ہوئی ہے۔ مزید برآں واقعاتی شہادت اور خاندان اقبال کے بزرگ اور معتبر افراد کے بیانات بھی بہ مقابلہ 1873 اسی سنہ ولادت کی تائید کرتے ہیں۔ ان شواہد کی روشنی میں کہا جاسکتا ہے کہ اقبال کی تاریخ ولادت 3 ذی قعد 1294ھ ہے جو 9 نومبر 1877 کے برابر ہوتی ہے۔[13]

حواشی

(1) زندہ رود، جاوید اقبال، ص 6

(2) ایضاً، ص 1، مکتوب بہ نام محمد دین فوق محررہ 1، جنوری 1934

(3) ذکر اقبال، عبدالمجید سالک، پہلی فصل، ص 7

(4) ملاحظہ ہو زندہ رود، ڈاکٹر جاوید اقبال

(5) ذکر اقبال، عبدالمجید سالک، ص 8-7

(6) یہ تحریر روزگار فقیر مصنفہ وحیدالدین ص 20 کے حوالے سے 'زندہ رود' میں شامل کی گئی ہے۔ (ف۔ز)

(7) سیرت اقبال، محمد طاہر فاروقی، ص 34

(8) اقبال صدی نمبر 'ہما' اردو ڈائجسٹ، ص 34

(9) ملاحظہ ہو روزگار فقیر مصنفہ وحیدالدین ص 232-231

فقیر صاحب کا توضیحی بیان یہ ہے 'اگست 1930 میں منشی محمد دین صاحب نے ایک کتاب 'مشاہیر کشمیر' شائع کی تھی جس میں علامہ کا سنہ پیدائش 1875 درج کیا تھا۔ دو سال بعد 1932 کے آخر میں رسالہ 'نیرنگ خیال' لاہور نے ایک خصوصی شمارہ اقبال نمبر شائع کیا جس میں منشی محمد دین صاحب فوق نے ایک مضمون 'اقبال کے مختصر سوانح حیات' کے عنوان سے لکھا اور مشاہیر کشمیر میں بیان کردہ سنہ پیدائش کی تصحیح کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب کا سنہ پیدائش وہی بیان کیا جو خود انھوں نے 1908 اور 1931 میں بیان کیا ہے یعنی 1876۔ فوق صاحب کے علامہ اقبال سے گہرے تعلقات تھے۔ یہ امر قرین قیاس ہے کہ سنہ پیدائش کی تصحیح فوق صاحب نے خود علامہ کی ہدایت اور ایما پر کی ہے۔

(10 روزگار فقیر، فقیر وحیدالدین، ص 231

(11) ایضاً، ص 234

(12) ایضاً، ص 237

(13) زندہ رود، ڈاکٹر جاوید اقبال، ص 49

Dr. Farhat Zeba, Lane No 1, Sattar Colony,
Bariatu, Ranchi - 834009 (Jha)

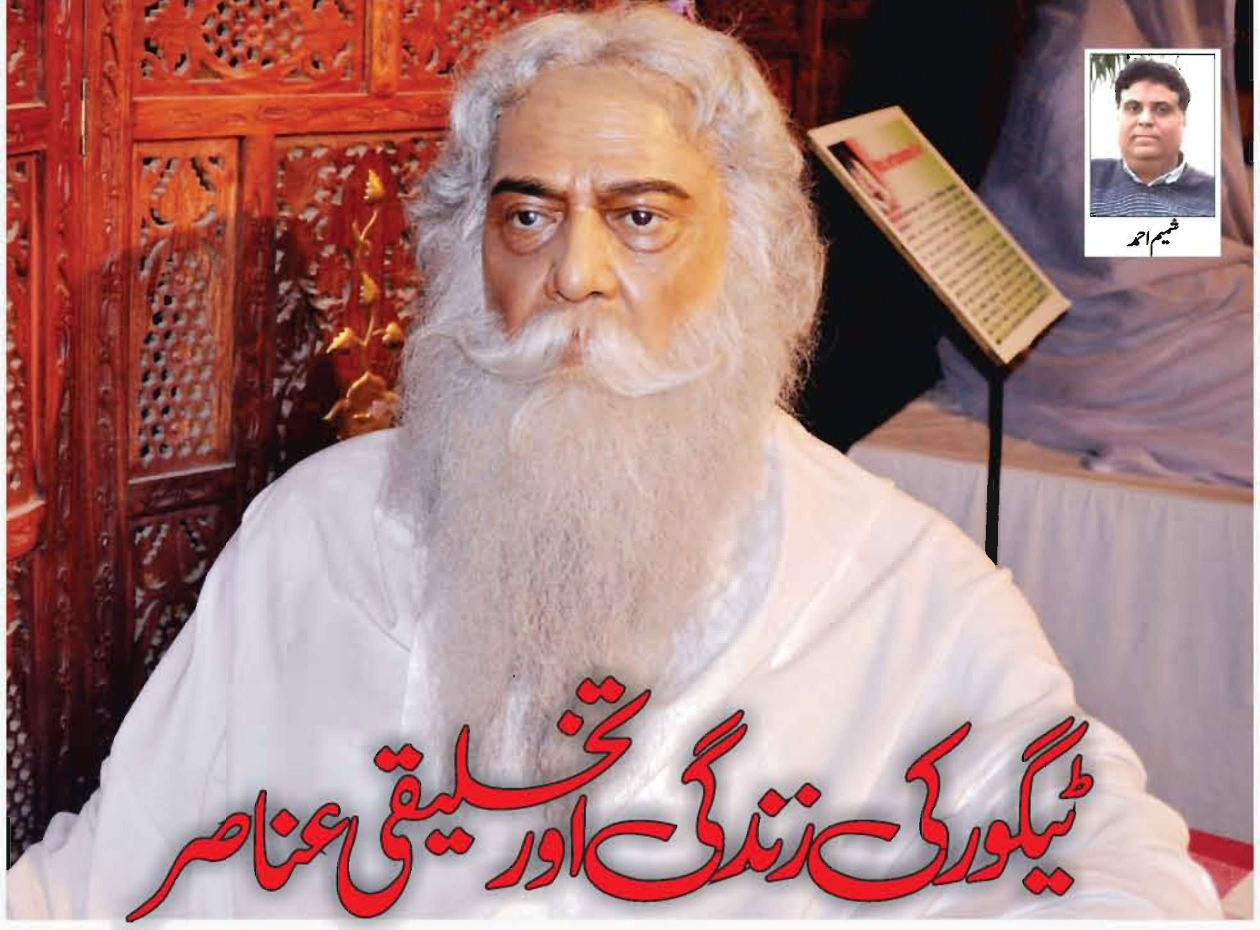

شمیم احمد

ٹیگور کی زندگی اور تخلیقی عناصر

رابندر ناتھ ٹیگور کی واقعات سے پُر زندگی اتنی ہی متنوع اور پرکشش ہے جتنی ان کی فراواں تخلیقی نگارشات۔ وہ شاعر، ناول نگار، ڈرامہ نگار، موسیقار اور مصور ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے عہد کے غیر معمولی ماہر تعلیم بھی تھے۔ مختلف النوع جہات سے وابستہ ان کے تابندہ تخلیقی جوہر آج بھی رہنما ہیں۔

ادب:

ٹیگور ہندوستان کے ایک ایسے ادیب ہیں جنھیں ادب کے لیے دنیا کے سب سے بڑے انعام، نوبل انعام سے سرفراز کیا گیا۔ ٹیگور کو یہ انعام ان کی کتاب گیتانجلی پر ملا۔ بنگالی نظموں پر مشتمل یہ کتاب 1910 میں شائع ہوئی تھی۔ گیتانجلی کی اشاعت کے تقریباً ڈیڑھ برس بعد 1912 کے اوائل میں وہ سخت علیل ہوگئے۔ تبدیلی آب و ہوا کی خاطر ٹیگور اپنے آبائی وطن سلائدہ چلے گئے۔ یہاں انھوں نے اپنی کچھ نظموں کے انگریزی ترجمے کیے۔ صحت یاب ہونے کے بعد ڈاکٹروں کی صلاح پر عمل کرتے ہوئے وہ مئی 1912 میں انگلینڈ کے لیے روانہ ہوئے۔ غالب گمان یہ ہے کہ دور دور تک روابط قائم کرنے اور وسیع افق پر نمودار ہونے کی خواہش دل میں جاگزیں تھی۔ چنانچہ اس طویل سمندری سفر کے دوران انھوں نے اپنی نظموں کے انگریزی ترجمے کا سلسلہ جاری رکھا۔

انگلینڈ میں ٹیگور کے واقف کار ولیم روتھنسٹائن نے ٹیگور اور ان کی شاعری کو اپنے معروف و ممتاز حلقۂ احباب سے متعارف کرایا جن میں ڈبلیو بی ییٹس، تھامس اسٹرج مورے، ایزرا پاؤنڈ اور کئی دیگر ادب شناس شامل تھے۔ یہ لوگ ٹیگور کی شاعری کے عارفانہ تصور اور شانِ خطابت سے بے حد متاثر ہوئے اور خوب داد و تحسین دی۔ گیتانجلی کی سحر انگیزی کے متعلق ییٹس نے اپنے تعارف میں لکھا ہے:

''......ان نثری تراجم نے میرے خون کو ایسے گرما دیا کہ کئی برسوں سے کوئی چیز یہ کام نہیں کر پائی تھی۔ میں ان تراجم کے مخطوطے کئی دن تک اپنے ساتھ لیے گھومتا رہا۔ ریلوے اسٹیشنوں میں یا اومنی بسوں کے اوپری حصے میں یا ریستوراں میں بیٹھ کر اس کا مطالعہ کرتا رہا اور اکثر مجھے اس کو بند کردینا پڑا کہ مبادا ایسا نہ ہو کوئی اجنبی دیکھ لے کہ اس ترجمے نے مجھ میں کس قدر جوش بھر دیا ہے۔''

ولیم روتھنسٹائن کی کوششوں سے انڈیا سوسائٹی آف لندن نے ان تراجم کو کتابی صورت میں شائع کیا۔ کتاب کو برطانیہ میں زبردست پذیرائی ملی اور مارچ تا نومبر 1913 کے درمیان اس کتاب کے متواتر دس ایڈیشن شائع ہوئے۔ برطانوی ادیب تھامس اسٹرج مورے نے برطانیہ کی رائل سوسائٹی آف لٹریچر کے فیلو کی حیثیت سے سوئیڈش اکادمی میں ادب کے نوبل انعام کے لیے رابندر ناتھ کا نام تجویز کیا جس کی کئی دیگر ارکان نے تائید کی۔ اس میٹنگ میں کل 28 نامزدگیوں میں سے ٹیگور کے نام کو انعام کے لیے منظور کرلیا گیا۔ ٹیگور اس اعزاز کو حاصل کرنے والے پہلے ایشیائی تھے۔

تاہم وہ بوجوہ انعام لینے کے لیے سویڈن نہ جاسکے اور ان کا پیغام تقریب میں پڑھ کر سنایا گیا جس میں لکھا تھا:

''میں سویڈش اکادمی کی تفہیم کی وسعت پر دل کی گہرائیوں سے مبارک باد پیش کرتا ہوں جس کے سبب دوریاں نزدیکیوں میں بدلیں اور اجنبی کو بھائی بنایا گیا۔''

گیتانجلی اور نوبل پرائز نے ٹیگور کے لیے عالمی اسٹیج تیار کیا اور وہ عالمی شاعر کے بلند مرتبے پر فائز ہوئے۔ ایک ایسا مرتبہ جس پر متمکن ہونے والا سرحدوں سے ماورا ہوکر اپنی زندگی کا جشن منا سکتا ہے۔ گیتانجلی ہی کے ایک گیت کے بول ہیں:

اس دنیا کے جشن میں مجھے مدعو کیا گیا
اور اس طرح میری زندگی معرضِ وجود میں آئی
میری آنکھوں نے دیکھا اور میرے کانوں نے سنا

رابندر ناتھ کا مشن انسان کو خدا کے قریب کرنا اور خدا کو انسانوں کے قریب لانا ہے۔ اس لیے وہ دنیا کا احترام کرتے تھے اور دنیاوی زندگی کو ایک جشن کے مترادف خیال کرتے تھے۔ ان کا ماننا تھا کہ دنیا سے لاتعلق ہوکر نجات کی جستجو کرنا انسان کے تخلیق جوہر سے میل نہیں کھاتا۔ وہ بے شمار وابستگیوں کے درمیان آزادی کا لطف لینا چاہتے تھے۔ ٹیگور کے ایک گیت کے بول ملاحظہ ہوں:

اے میرے ذہن
تم اس وقت بیدار نہیں ہوئے جب تمھارے دل کا انسان

تمھارے دروازے پر آیا
تم اندھیرے میں جاگے
اس کے لوٹتے ہوئے قدموں کی کی چاپ سے
میری تنہا راتیں زمین پر بچھی چٹائی پر بسر ہوتی ہیں
اس کی نے کی آواز اندھیرے میں گونجتی ہے
افسوس میں اسے دیکھ نہیں سکتا

یہاں گیت کار اور خدا کے مابین تعلق انتہائی فطری نوعیت کا ہے۔ ٹیگور کا ماننا تھا کہ خدا ہر انسان کے دل میں ہے اور اس کی موجودگی کا احساس صرف سچی لگن اور عقیدت سے ہی ہوسکتا ہے۔ ٹیگور کے گیت اپنے پڑھنے والوں اور سننے والوں کے لیے محض وقت گزاری کا کوئی مشغلہ یا خوشی و انبساط حاصل کرنے کی کوئی کوشش نہیں ہیں بلکہ یہ ایک ایسے شاعر کی آواز ہیں جس کی شخصیت اپنے قارئین اور سامعین کے لیے تشفی کا سامان مہیا کرتی ہے، دلاسا دیتی ہے، زندگی کی دشواریوں کا سامنا کرنے کا حوصلہ عطا کرتی ہے۔ جب ہم رات کے اندھیرے میں آسمان کی اتھاہ خلاؤں کا بغور مشاہدہ کرتے ہیں، جب ہم وقت کے وسیع تر پھیلاؤ کا تصور کرتے ہیں جو کہ پہلے گزر چکا ہے اور جو ہمارے سامنے ہے تو ایک عجیب سا خوف ہم پر طاری ہو جاتا ہے اور اس خوف کی شدت رابندر ناتھ جیسے شاعر کے الفاظ سے کم ہوتی ہے۔ ٹیگور کی شاعری کی اسی ہمہ گیر آفاقی خصوصیت کی وجہ سے دنیا کی تمام بڑی زبانوں میں ان کے گیتوں اور نظموں بالخصوص گیتانجلی کے ترجمے کیے گئے ہیں۔ ہماری زبان اردو میں بھی گیتانجلی کے کئی تراجم ہوئے ہیں۔ کئی لوگوں نے ٹیگور کا موازنہ اردو کے بڑے شاعروں جیسے غالب اور اقبال سے بھی کیا ہے۔ بالخصوص اقبال اور ٹیگور کے درمیان فکری اور ذہنی مماثلتیں تلاش کرنے کی کوششیں کی گئی ہیں۔

اقبال ایک مفکر شاعر ہیں اور ان کے کلام میں خدا، انسان اور کائنات کو مرکز بنا کر دنیا کے تمام انسانوں کو ایک دوسرے سے جوڑنے کی بات کہی گئی ہے۔ یہی پیغام ٹیگور نے بھی دیا ہے اور لطف کی بات یہ ہے کہ دونوں ایک ہی عہد کے بڑے شاعر ہیں اور دونوں ہی دنیا بھر میں مشہور ہیں۔ ٹیگور کے ایک گیت 'آکاش بھروسور جوتارا' کا اردو ترجمہ ملاحظہ ہو:

آسمان میں سورج اور تاروں کی میخیں گڑی ہیں، کائنات زندگی سے مرتعش ہے
ان تمام مظاہروں کے مابین کیا مجھے میرا مقام مل پایا
کیا اسی تحیر خیزی سے میرے گیت پھوٹ پڑے ہیں
میری رگوں میں دوڑنے والا خون اس کشمکش کو محسوس کرسکتا ہے
گزرتے وقت اور کائناتی مدوجزر کو جس سے یہ دنیا مرتعش ہے
کیا اسی تحیر خیزی سے میرے گیت پھوٹ پڑے ہیں
جنگل سے گزرتے ہوئے گھاس پر خراماں اٹھتے میرے قدم
پھولوں کی منفرد خوشبوؤں سے میرا ذہن معطر
مسرت و انبساط کی فیاضی تمام اطراف بکھری ہوئی ہے
کیا اسی تحیر خیزی سے میرے گیت پھوٹ پڑے ہیں
میں نے اپنی سماعتوں کو پوری طرح کھول لیا ہے
بصارتوں کو وسعت دی ہے اور دل نکال کر زمین پر ڈال دیا ہے
میں نے معلوم میں نامعلوم کو تلاش کرلیا ہے
کیا اسی تحیر خیزی سے میرے گیت پھوٹ پڑے ہیں

اس گیت میں ٹیگور نے استفہامیہ انداز میں کائنات کے اسرار کھولنے کی کوشش کی ہے اور انسان کی باطنی قوت اور اپنی خودی میں یقین کی اہمیت کو اجاگر کیا ہے۔ وہ انسان کو فطرت کے زیادہ سے زیادہ قریب کرنا چاہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ٹیگور نے جو تعلیمی ادارے قائم کیے ان میں اسی بات پر زور دیا گیا کہ بچوں کی صحیح تعلیم و تربیت کے لیے انھیں فطرت کے نزدیک پھلنے پھولنے کا موقع دیا جائے۔

تعلیم:

بیسویں صدی کے اوائل میں جب کہ ہندوستان میں مغربی تعلیم کا دور دورہ تھا، کسی نے ایسی مکمل تعلیم کے بارے میں سوچا بھی نہیں تھا جو آموزش کا ایسا موقع فراہم کرسکے جس میں انسان اور فطرت کے مابین، استاد اور شاگرد کے درمیان، لبرل آرٹ اور رقص و موسیقی اور فنونِ لطیفہ کے مابین عملی اشتراک ممکن ہو اور جہاں کائنات کا مرکزی نقطہ انسان ہو۔ ٹیگور کے نزدیک تعلیم آسودگی کے ساتھ سامانِ زندگی فراہم کرنے والا کوئی وسیلہ نہیں تھا بلکہ یہ فرد کی صلاحیتوں بالخصوص دانشورانہ، جذباتی، روحانی اور جسمانی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کا وسیلہ تھا۔ تعلیم کا مقصد کائنات میں موجود زیریں ہم آہنگی تک انسان کی رہنمائی کرنا ہے۔ ٹیگور کا ماننا تھا کہ مسرت و انبساط کی حالت میں آموزش ممکن ہے اس لیے کلاس روم جیل کی کوٹھری نہیں ہونے چاہئیں اور کسی غیر ملکی زبان میں تعلیم دینے کے بجائے بچوں کو ان کی مادری زبان میں تعلیم دینا زیادہ ثمر آور ہے۔ ٹیگور نے شانتی نکیتن کے نام سے جو تعلیمی ادارہ قائم کیا وہ ان کے تصور تعلیم کا عملی نمونہ ہے۔ یہ پر ہجوم شہروں سے دور ایک پرفضا مقام ہے جہاں انسان اور فطرت کے مابین کوئی بندش نہیں تھی۔ بچے مختلف موسموں کے اثرات کا احساس کرسکتے تھے، وہ بارش میں بھیگتے، دھوپ سینکتے اور چاندنی راتوں کا لطف لیتے۔ کلاسیں درخت کے نیچے کھلے میدان میں ہوتیں۔ عام تعلیمی مضامین کے ساتھ ساتھ بچوں کو موسیقی اور رقص، مختلف دستکاریاں اور ڈراموں میں اداکاری کرنا سکھایا جاتا۔ ٹیگور کا ماننا تھا کہ انسان دنیا میں خدا کی صرف ایک صلاح لے کر آیا ہے اور وہ ہے اپنا اظہار کرو، اسی لیے بچوں کو یہاں اپنی صلاحیتوں کے اظہار کا پورا پورا موقع حاصل تھا۔

ایک نایاب رنگین فوٹو میں ٹیگور کے بائیں ان کی بیٹی بیلا اور دائیں بہو پرتیما

ٹیگور کا خیال تھا کہ اپنے ماحول کے ساتھ بچوں کا تین جہتی تعلق ہے۔ سب سے پہلی سطح بچوں کو اپنا ماحول استعمال کرنے کا طریقہ سکھانا تھا۔ یہ کرم (عمل) کی سطح تھی۔ دوسری سطح حقیقی گیان یا علم کا حصول تھا اور تیسری اور بلند ترین سطح پریم یعنی عشق تھا۔ ٹیگور کا ماننا تھا کہ انسان کی مکمل ترقی کے لیے کرم، گیان اور پریم (عمل، علم، عشق) میں سے ہر ایک کی اپنی اپنی ذمے داریوں کو پورا کرنا ضروری ہے۔

تھیٹر:

رابندر ناتھ ٹیگور کے ذہن میں ایک ایسی جدید ہندوستانی قوم کا تصور تھا جو اپنی کھوئی ہوئی قدیم شان و شوکت کو دوبارہ حاصل کرسکے۔ ان کی کئی نظموں، گیتوں اور مضامین میں اسی فکر پر اصرار نظر آتا ہے۔ عملی اعتبار سے انھوں نے شانتی نکیتن میں ایک اسکول قائم کرکے انگریزی نظامِ تعلیم کو خیرباد کہنے کی شعوری کوشش کی۔ وہ تقسیمِ بنگال کی انگریزی پالیسی کے خلاف سیاسی احتجاجوں میں سرگرم طور پر شریک ہوئے۔ اسی کے ساتھ ساتھ وہ ایک نئے قسم کے تھیٹر کے بارے میں بھی غور و فکر کرتے رہے جو نوآبادیاتی نقالی سے مختلف ہو اور جسے عوامی اسٹیج پر پیش کیا جاسکے۔ ٹیگور نے مغربی طرز کے تھیٹر بالخصوص حقیقت پسندانہ نوعیت کے تھیٹر کو مسترد کرنے کی بات کہی اور اپنی دیسی ثقافتی روایتوں کی جانب رجوع کرنے کا مشورہ دیا۔ شانتی نکیتن کی کھلی فضاؤں میں منتقل ہونے کے بعد ٹیگور کو نئے یا متوازی تھیٹر کے اپنے نظریے پر عملدرآمد کا موقع ملا۔ یہاں انھوں نے سرود اتسو اور پھالگنی نام کے ڈرامے اسٹیج کیے جس میں انھوں نے خود بھی ایک سنیاسی کا کردار نبھایا۔ اس کے بعد ان کے کئی ڈرامے منظرِ عام پر آئے جن میں راجہ، ڈاک گھر، مکت دھارا اور شیاما خاص ہیں۔ رابندر ناتھ نے رقص پر مبنی ڈرامے کی ہیئت کے ذیل میں بھی کئی تجربات کیے۔ ان ڈراموں کی تکنیک کچھ اس نوعیت کی تھی کہ مکالمے پس منظر سے جاری موسیقی سے ہم آہنگ ہوجاتے اور ایسا معلوم ہوتا کہ گویا گیت کے بول پیش کیے جارہے ہوں۔ ٹیگور کہانی کار، اداکار اور پروڈیوسر کے طور پر تھیٹر سے وابستہ رہے۔ انھوں نے ایک ایسے تھیٹر کا تصور پیش کیا جو آزادانہ طور پر جامع ہو۔ انھوں نے دیسی تھیٹر کے تئیں اپنی پسندیدگی کو برقرار رکھا تاہم کسی مخصوص نمونے کی آنکھ بند کر کے نقالی کرنے پر کبھی یقین نہیں کیا۔ اسی لیے انھوں نے مغربی اسٹیج کی برآمدات کی موٹے طور پر نکتہ چینی کے باوجود اسے قطعی طور پر مسترد نہیں کیا۔ وہ ایسے تھیٹر کے حق میں تھے جس میں حقیقت پسندانہ، شہری اور دیہی، غیر ملکی اور ملکی، مغربی اور مشرقی اجزا بیک وقت موجود ہوں۔

مصوری:

رابندر ناتھ کی متنوع شخصیت تخلیقی اظہار کے مختلف میدانوں کا احاطہ کرتی ہے تاہم مصوری کی دنیا میں انھوں نے اپنی زندگی کے آخری وقت میں قدم رکھا۔ نیز اس کا آغاز بھی انتہائی حیرت انگیز طریقے سے ہوا۔ ہوا یوں کہ ٹیگور نے اپنی نظموں کی بیاض میں متن کی درستگی اور اصلاح کے لیے کاٹے گئے لفظوں کو شکستہ خط میں ہم آہنگ نقوش کے طور پر ایک دوسرے سے جوڑنا شروع کردیا۔ جس کے نتیجے میں کاٹے ہوئے حروف کے باہم پیوست نشانات آزادانہ شناخت اختیار کرگئے اور قابل دید بصری خاکوں کی صورت میں نمودار ہوئے۔ اس عمل کے بارے میں انھوں نے بعد میں لکھا:

"مجھے معلوم ہوا کہ ہم آہنگی ان کو حقیقت کا روپ دے دیتی ہے جو بے ربط ہوں، جو اپنے آپ ہی غیر اہم ہوں اور اس لیے جب میرے مخطوطے میں تنسیخی خطوط نجات کے لیے گناہ گاروں کی طرح تڑپ رہے تھے اور اپنی غیر معنویت کی بدنمائی کے ساتھ میری آنکھوں کو جھنجھوڑ رہے تھے، میں اکثر اپنے اصل ہدف کو جاری رکھنے کے مقابلے انھیں ہم آہنگی کی رحم دلانہ صورت بخشنے کے لیے ان کے بچاؤ میں زیادہ وقت بتانے لگا۔" (مائی پکچرز-1)

صفحۂ قرطاس پر بغیر منصوبہ بندی کے نمودار ہوئی اشکال کا یہ تقریباً نیم شعوری جنم ہم آہنگی کے ساتھ شاعر کے خلقی لگاؤ کا منطقی نتیجہ ہے۔ یہ پیچ در پیچ نقوش کی مسرت بخش دلآویزی نہیں تھی جس نے شاعر کو متوجہ کیا بلکہ پیش بینی کے بغیر ابھرے ہوئے نقوش نے انھیں مسرور کردیا۔ اس طرح تخلیقی اظہار کا وہ سفر شروع ہوا جس نے شاعر ٹیگور کو دنیا کے سامنے مصور ٹیگور کے طور پر پیش کیا۔ چنانچہ 1930 میں انھوں نے اپنی تصویروں کی نمائش کا سلسلہ شروع کیا اور ابتدائی نمائشیں ہندوستان کے بجائے بیرونِ ملک منعقد ہوئیں۔

ٹیگور نے ماضی کی تصویری روایتوں کے نقشِ قدم پر چلنے سے انحراف کیا اور ایک نئی روایت کا ڈول ڈالا۔ ان کی تصویریں ناظرین کے سامنے ایسے بیانیہ کا انکشاف کرتی ہیں جو خصوصی طور پر بصری زبان کے ذریعے بیان کیا جاتا ہے اور جو اس بات کا تقاضا بھی کرتا ہے کہ اسے پڑھا جائے۔ ان کی تصویریں شخصیات کے پھیر میں نہیں پڑتیں بلکہ امتیازی شخصی طرزِ عمل کی حامل ہوتی ہیں اور یہ طرزِ عمل افسردگی اور متانت سے لے کر سکون اور ضبط تک کے مختلف تاثرات کا حامل ہوتا ہے اور بعض نایاب مثالیں جوش و خروش یا خوش طبعی کی بھی ملتی ہیں۔ البتہ خواہ مخصوص تاثر کوئی بھی ہو، مصور کردہ چہرہ غیر متغیر طور پر ان کہے اسرار کے احساس کو اس طرح پورے شد و مد سے بیان کرتے ہیں جیسے کسی شخصیت کا کُل مکمل ادراک سے ماورا ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ ٹیگور ایک ایسی جدت پسند شخصیت تھے جنھوں نے صرف فن پاروں ہی کی تخلیق نہیں کی بلکہ زندگی بسر کرنے کا ایک نیا طریقہ بھی تخلیق کیا، ایک ایسا طریقہ جو معاشرتی تناظر میں ان کے تخلیقی محرکات کے جوہر کی ترجمانی کرتا ہے۔

ٹیگور کہانی کار، اداکار اور پروڈیوسر کے طور پر تھیٹر سے وابستہ رہے۔ انھوں نے ایک ایسے تھیٹر کا تصور پیش کیا جو آزادانہ طور پر جامع ہو۔ انھوں نے دیسی تھیٹر کے تئیں اپنی پسندیدگی کو برقرار رکھا تاہم کسی مخصوص نمونے کی آنکھ بند کر کے نقالی کرنے پر کبھی یقین نہیں کیا۔

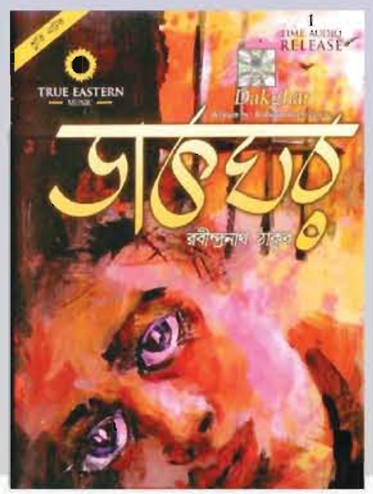

Dr. Shamim Ahmed, Dept of Urdu and Farsi, St. Stephen's College, Dehli University, Delhi - 110007

محمد عارف

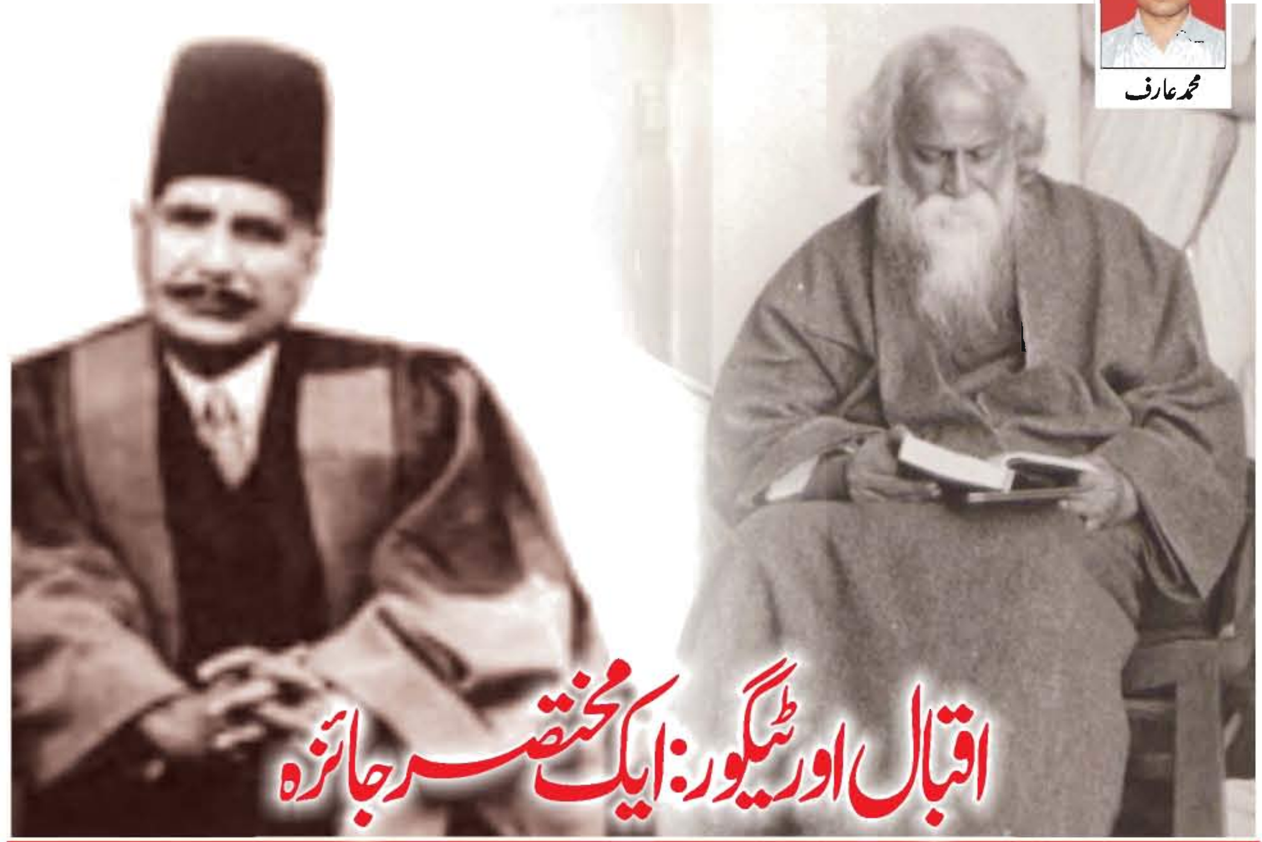

اقبال اور ٹیگور: ایک مختصر جائزہ

ٹیگور اور اقبال ایک ہی عہد کے دو بڑے شاعر اور مفکر ہیں جن کے اثرات نہ صرف برصغیر بلکہ عالمی سطح پر پوری دنیا میں نمایاں ہوئے۔ دونوں بیک وقت شاعر بھی تھے اور فلسفی بھی دونوں فنون لطیفہ کے دلدادہ تھے۔ ان کا مقصد علوم وفنون کو فروغ دینا تھا جس کے ذریعے انسان کی فلاح و بہبود ممکن ہوسکے۔ ادیبوں کی ہی یہ ذمے داری ہوتی ہے کہ تڑپتی ہوئی انسانیت کے قلب ونظر کو اطمینان وسکون بخشیں۔ ان کی سرشت میں ہے کہ وہ اپنے عہد سے مطمئن نہیں ہوتے بلکہ ایک نئے عہد کی تعمیر میں مسلسل جدوجہد کرتے رہتے ہیں۔ عمر کے ساتھ ساتھ ان کے تخیلات میں تبدیلیاں بھی ہوتی رہتی ہیں مختلف علوم وفنون کے ذریعے انسانیت کے دردوغم اور ان کے مسائل کو سمجھنے اور انھیں حل کرنے کے لیے ایک لائحہ عمل تیار کرتے ہیں، کچھ اصول وضوابط مرتب کرتے ہیں، جس میں زندگی کے تئیں امید کی کرن نظر آتی ہے۔ اس عہد میں نہ جانے کتنے شعرا وادبا اپنی تخلیقات میں مستغرق رہے ہوں گے۔ اپنے خیالات کو بہتر سے بہتر بنانے کی کوشش میں لگے ہوں گے۔ انھیں اپنے زمانے میں بہت شہرت بھی ملی ہوگی۔ آخر وہ کون سے افکار ونظریات ہوں گے، وہ کون سے مضامین ہوں گے، آخر کس اسلوبِ نگارش نے اقبال کو علامہ اقبال اور ٹیگور کو رابندرناتھ ٹیگور بنادیا آخر" کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے"

ٹیگور اور اقبال کا وطن تقریباً ایک ہی تھا فرق صرف مشرق ومغرب کا تھا۔ عمر میں تھوڑا سا فرق ضرور تھا، مگر فن کسی عمر کا محتاج نہیں ہوتا فنکار کو اس کے افکار وخیالات اسے اعلیٰ وارفع بناتے ہیں۔ خیالات کی بلندی انسان کو اس کے ماحول اور مطالعہ کائنات سے نصیب ہوتی ہے۔ جس ماحول میں اس کی تربیت ہوگی اسی اعتبار سے اس کی شخصیت میں نکھار پیدا ہوگا۔ جغرافیائی، تاریخی اور تہذیبی ماحول کا بھی اس کی زندگی پر اثر پڑتا ہے۔ کم وبیش یہی معاملہ اقبال اور ٹیگور کا بھی رہا ہوگا "دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک"

اقبال اور ٹیگور کی شاعری کی ابتدا میں تقریباً یکسانیت ہے۔ انھوں نے عشق حقیقی کا سفر عشق مجازی کے راستے طے کیا ہے۔ ٹیگور کی 'گارڈنز' (باغبان) نظموں کا مجموعہ جو نوجوانی میں لکھا گیا عشق مجازی کی داستان بیان کرتا ہے۔ یہ حسن وعشق کا بہترین ودلکش مرقع ہے۔ بالکل یہی معاملہ اقبال کا بھی ہے۔ ان کی شاعری ارتقائی انداز کی معلوم ہوتی ہے۔ جیسے جیسے ذہن اپنی بلندی پر پہنچتا ہے اسی طرح ان کے افکار وخیالات بلند سے بلند تر ہوتے جاتے ہیں۔ اقبال کی ابتدائی شاعری میں اردو شاعری کا عکس نظر آتا ہے جو اس زمانے میں رائج تھا۔ یعنی گل وبلبل کی باتیں، عشق ومحبت کا اظہار، رومانیت، وطن پرستی اور حب الوطنی کا جذبہ بھرپور انداز میں نمایاں طور پر موجود ہیں:

تجھ کو دُزدیدہ نگاہی یہ سکھا دی کس نے
رمز آغازِ محبت کی بتا دی کس نے
نہ آتے ہمیں اس میں تکرار کیا تھی
مگر وعدہ کرتے ہوئے عار کیا تھی
جان دے کر تمھیں جینے کی دعا دیتے ہیں
پھر بھی کہتے ہو کہ عاشق ہمیں کیا دیتے ہیں
سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا
سونی پڑی ہوئی ہے مدت سے دل کی بستی
آ اک نیا شوالہ اس دیس میں بنا دیں
پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے
خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے

اسی عہد میں ٹیگور اور اقبال نے بچوں سے متعلق بہت سی نظمیں لکھیں مثلاً ٹیگور کی 'کرسنٹ مون (ماہِ نو)' میں بچے کی مختلف حیثیتوں کو دکھایا گیا ہے کہ بچہ ہماری زندگی پر کس طرح اثرانداز ہوتا ہے، اس کی بھولی صورت اور معصومانہ انداز سب کو بھاتا ہے۔ عہدِ طفلی کا اندازہ عہدِ جوانی میں ہوتا ہے۔ اقبال نے بچوں پر بہت سی نظمیں لکھی ہیں مثلاً عہد طفلی، بچہ اور شمع، طفل شیر خوار، ایک مکڑا اور مکھی، ایک پہاڑ اور گلہری، ایک گائے اور بکری، ہمدردی، ماں کا خواب، پرندے کی فریاد، بچے کی دعا، ایک پرندہ اور جگنو، اقبال کو بچپن سے کس قدر لگاؤ تھا اس کا اندازہ ان نظموں سے ہوجاتا ہے۔

ٹیگور اور اقبال نے اعلیٰ تعلیم کے حصول کی خاطر یورپ کا رخ کیا، جہاں مطالعۂ کائنات کی ابتدا ہوئی، تخیل کی پرواز میں بلندی آئی، ذہن ودل نے بڑے بڑے قلعے سر کیے، انسانوں کی انسانیت اور ان کی روح کے اوراق الٹے، زندگی کے فلسفے سے واقفیت حاصل ہوئی، قدرتی نوادرات سے باخبر ہوئے، دروغم سے نجات کا راستہ تلاش کیا، قوم وملت کی احیا کے راز سے آشنا ہوئے، فنون لطیفہ سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ اس کا اظہار اقبال نے اشعار کے ذریعے کیا تو ٹیگور نے اپنے فن کو شاعری، ناول، افسانہ، کہانی، موسیقی، مصوری کے ذریعے پیش کیا۔ ٹیگور اور اقبال دونوں اپنے فکر وخیال کے بلندی پر ہیں۔

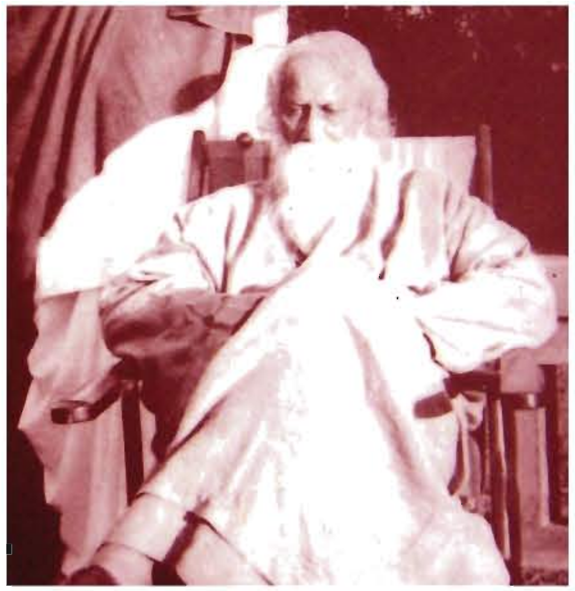

رابندرناتھ ٹیگور جہاں بہت سارے علوم وفنون میں مہارت رکھتے ہیں وہیں وہ اپنے آپ کو ایک شاعر کہلانا زیادہ پسند کرتے تھے۔ ان کا شاعرانہ مزاج عام شاعروں کی طرح ہی تھا۔ ٹیگور نے تین ہزار سے زیادہ نظمیں کہی ہیں۔ ان کی نظموں میں ہندوستانی مناظر، قدیم ہندوستانی تصورات، ہندو دیومالا اور معنی خیز کتھاؤں کا عکس ملتا ہے۔ بنگالی زبان میں نکلنے والا رسالہ 'گیانکر' میں ان کی زیادہ تر نظمیں شائع ہوتی تھیں۔ ان کے بڑے بھائی جیونندراناتھ نے 'بھارتی' نام سے ایک ماہنامہ جاری کیا اس میں ٹیگور کی نظمیں مستقل شائع ہوتی تھیں۔ ٹیگور آہستہ، آہستہ فطرت سے قریب ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان کی شاعری کے متعلق فراق گورکھپوری لکھتے ہیں:

"ان کی نظموں میں ہندوستان کے کھیتوں کی لہلہاہٹ، یہاں کے دریاؤں کا ساز روانی ہے۔ یہاں کے شبنمستان میں کھنک ہے۔ یہاں کے موسموں کے جلوے ہیں، یہاں کے دن ورات کی آئینہ بندی ہے۔ یہاں کے پہاڑوں کی حشمت وہیبت ہے۔ یہاں کے رنگارنگ مناظر کی ایسی جھلک جو ان سے ایک ہزار برس پہلے تک کی شاعری میں ہمیں نہیں ملتی۔ کالی داس کے بعد مناظر فطرت کا اتنا عظیم عکاس ایشیا میں پیدا نہیں ہوا تھا۔" (رابندرناتھ ٹیگور کی شاعری پر طائرانہ نظر: فراق گورکھپوری، ص319)

ٹیگور نے اپنی شاعری کے ذریعے قدیم ہندوستانی تہذیب کو دوبارہ زندہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی داخلی اور خارجی زندگی پر ویدوں اور اپنشدوں کا اثر دکھائی دیتا ہے جس نے ہندو مذہب کے رسم ورواج کو شعور سے لاشعور تک پہنچا دیا ہے۔ ٹیگور سنسکرت کے علوم سے باخبر تھے اس کے باوجود ان کی شاعری میں مظاہر فطرت کی حسین بولتی تصویر نظر آتی ہے۔ جو انسانی روح کو وحدت کا احساس دلاتی ہے۔ گویا فطرت کے جلوؤں میں انسانی روح کو تلاش کر رہے ہوں۔ ان کی شاعری میں ایک ماورائی کیفیت پیدا ہوگئی ہے۔ ٹیگور کے متصوفانہ خیالات قدرت کے حسن کے ذریعے اپنے مالک حقیقی کی تلاش میں بھٹک رہے ہیں۔ ٹیگور نے اپنی شاعری کے ذریعے انسانی زندگی کے خارجی وداخلی مسائل کے دکھ درد کو سمجھنے اور اسے حل کرنے کی کوشش میں ہم آہنگی پیدا کردی ہے۔ مرد اور عورت کی زندگی کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ طبقۂ نسواں کی حقیقت بیانی، اس کی ماہیت کی جانب اشارہ کرنا، اس کے ہر روپ کو ٹیگور نے اپنی نظموں میں بیان کیا ہے۔ اس سلسلے میں فراق گورکھپوری رقمطراز ہیں:

"رابندرناتھ کی نظموں میں بچپن سے بڑھاپے تک عورتوں اور مردوں کے کردار ملتے ہیں اور ہر طبقے کے مردوں اور عورتوں کے کردار شاعر ہمیں کامیابی سے محسوس کرادیتا ہے کہ آج کی عورتوں میں بھی ظاہری رسم ورواج اور لباس میں تبدیلی کے باوجود سیتا، رادھا، درگا، اروشی، اہلیا، دامینتی، گارگی اور ساوتری رچی اور بسی ہوئی ہیں۔ اسی طرح لڑکوں، جوانوں، بڑی عمر کے مردوں کی کردارنگاری بھی اس انداز سے کی گئی ہے کہ ہم ان کرداروں کو بھول نہیں سکتے۔"

رابندرناتھ ٹیگور کی شاعری میں طائرانہ نظر: فراق گورکھپوری، ص323

ٹیگور نے انسانیت کے ساتھ ساتھ انسانی عظمت کو برقرار رکھا ہے۔ زندگی قدرت کا بہترین عطیہ ہے جو انسان کی افضلیت ثابت کرتی ہے۔ ٹیگور کو زندگی سے محبت ہے اور زندگی کو سب سے بڑا راز تسلیم کرتے ہیں۔ اس سے بڑی حقیقت اور کچھ نہیں ہوسکتی ہے کہ ان کی نظمیں انسان کے انداز زندگی کا احساس پیدا کراتی ہیں۔ زندگی کا مقصد بتاتی ہیں۔ جینے کے نئے نئے روپ دکھاتی ہیں۔

اقبال 1905 میں انگلینڈ گئے تو ان کے اندر ایک انقلاب پیدا ہوگیا۔ یورپ کی تہذیب کا مطالعہ کیا ان کی زندگی اور نظام حکومت کا جائزہ لیا۔ انگلینڈ میں اقبال پر بہت سارے راز افشاں ہوئے۔ ان تمام سوالوں کے جواب انھیں ملنے لگے جو ان کے ذہن میں گردش کر رہے تھے۔ انگلینڈ ہی میں انھیں یہ بات معلوم ہوئی کہ "فرنگ کی رگ جاں پنجہ یہود میں ہے" یہاں پر اقبال کی قلبِ ماہیت ہوئی اب وہ اقبال نہیں تھے جو حب الوطنی کا گیت الاپتے تھے۔ اب ان پر یہ راز افشاں ہوا کہ "مسلماں کو مسلماں کردیا طوفان مغرب نے" اب اقبال ایک نئی دنیا سے متعارف ہو رہے تھے ایک نئی تہذیب، ایک نیا تمدن، نئے لوگ نظر آئے جہاں مادہ پرستی کے علاوہ اور کچھ تھا ہی نہیں۔ اب اقبال نے اپنے اشہبِ قلم کی باگیں موڑنی شروع کردیں اور کائنات کی گوناگوں خوبیوں سے لطف اندوز ہونے اور باریکی سے ان کا مطالعہ کرنے کی کوشش شروع کردی۔ وہ مسلسل غور وفکر کرتے ہیں حتیٰ کہ اپنے من میں ڈوب جاتے ہیں تب انھیں زندگی کا سراغ نصیب ہوتا ہے۔ کائنات کی حقیقت عیاں ہوتی ہے۔ انھیں فلسفہ خودی کا عطیہ نصیب ہوتا ہے۔ یورپ میں ہی اقبال خودی و بے خودی، عقل وعشق، جبریل وابلیس، خیر وشر، فنا وبقا، حیات وموت، زمان ومکاں کی اصطلاحیں وضع کرتے ہیں۔

ادیب اور شاعر اپنی ذات کے نہاخانوں میں اپنے تخلیقی فن کی پیکر تراشی کرتے ہیں۔ انسان اور اس کا وجود ہی ان کا موضوع ہوتا ہے۔ اقبال نے خودی کے ذریعے انسان کے اندر

ایک نئی روح پھونکی۔ ماضی سے رشتہ استوار کرایا۔ ذوقِ حیات کو ماضی کی ان عظمتوں سے باخبر کرایا جو وہ بھول چکی تھی۔ ماضی سے جذباتی تعلق پیدا کرایا۔

''اقبال نے تعقل کی نارسائیوں کو بھی سمجھا اور انسانی عروج و زوال کے معمے کو جذباتی، روحانی اور نفسیاتی سطح پر بھی حل کرنے کی سعی کی۔'' نئی شعری روایت: شمیم حنفی، ص25

اقبال نے ہر فلسفیانہ فکر کے انجام کو اپنی ذات کے تجربے سے تعبیر کیا۔ فنا کے تناظر میں بقا کی معنویت کا سراغ لگایا، اس لیے وہ انا کے عاشق ہیں۔ انسان کی ذات میں خیر اور شر دونوں ہیں۔ اقبال اپنے عہد کے نظام زندگی کو پھونک کر اپنے خاکستر سے اپنا جہاں تعمیر کرنے پر زور دیتے ہیں۔ وجود کو متحرک اور سکون وثبات کو فریب سمجھتے ہیں ان کا خیال ہے کہ انسان ہر لمحہ اپنی تخلیق کرتا رہتا ہے۔ وہ مادی دنیا کے جبر کا پابند نہیں ہوتا۔ ہمہ وقت وہ حیات کے طلسمی حصار سے باہر نکلنے کی کوشش کرتا رہتا ہے:

کھو نہ جا اس سحر و شام میں اے صاحب ہوش
اک جہاں اور بھی ہے جس میں نہ فردا ہے نہ دوش
خودی پرورش و تربیت پہ ہے موقوف
کہ مشت خاک میں پیدا ہو آتش ہمہ سوز
خودی ہے زندہ تو ہے فقر میں شہنشاہی
نہیں ہے سنجر و طغرل سے کم شکوہِ فقیر

ٹیگور نے انسانیت کا درس صرف مذہب تک ہی محدود نہیں رکھا، بلکہ اس دائرے سے باہر نکل کر خالق کی تخلیق کی ہوئی کائنات کو آگے بڑھانے اور خالق نے اسے جو خوبی عطا کی ہے اسے استعمال میں لاتے ہوئے دنیا میں مالک حقیقی کی ندرت کو اہل دنیا سے روشناس کرائے تاکہ وہ مالک کی قربت حاصل کر سکے۔ خاکی عبادت گاہ جو فراق گورکھپوری کا ترجمہ کردہ ہے، میں لکھتے ہیں:

بھجن، پوجا، سادھنا، دعا سب کچھ پڑا رہے
بند دروازے والے مندر کے کونے میں کوئی بیٹھا
تاریکی میں چھپ کر اپنے دل سے
کس کی تو پوجا کرتا ہے پوشیدہ جذبات کے ساتھ
آنکھیں کھول دھیان سے دیکھ تو - دیوتا گھر میں نہیں ہے
وہ وہاں گئے ہیں جہاں مٹی توڑ کر کسان کھیتی کرتا ہے
جہاں پتھر توڑ کر مزدور راستہ بنا رہا ہے بارہو مہینے محنت کرتا ہے
دھوپ اور بارش میں (وہ) ہے سب کے ساتھ
خاک دھول ان کے دونوں ہاتھوں میں لگی ہے
ان کی طرح صاف کپڑے اتار کر آجا دھول میں
نجات؟ ارے نجات کہاں پائے گا تو، نجات ہے کہاں
بھگوان خود سنسار کے بندھن میں سب کے ساتھ بندھے ہوئے ہیں

ٹیگور کا بھگوان انسان کے ساتھ ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلتا ہے وہ جہاں چاہے اس کو محسوس کر سکتا ہے۔ نجات تو اسی دنیا میں ہے جو اپنے عمل کے مطابق حاصل کرے گا۔ ٹیگور کی داخلی اور خارجی زندگی سے قدیم ہندوستانی تہذیب کی تعمیر نو ہوئی۔ مذہبی اقدار جو مغلوں اور زیادہ تر انگریزی حکمراں کی چابک دستی سے معدوم ہوتے جا رہے تھے، ایک بار پھر ٹیگور نے اس میں مذہبی روح پھونکی۔ فکر ونظر کی وسعتوں سے ہمکنار کیا۔ اس سلسلے میں شمیم طارق اپنی کتاب ٹیگور شناسی میں رقمطراز ہیں:

''ٹیگور کی مذہبی فکر اور عقیدہ میں بڑی وسعت تھی اس کے باوجود بنیادی طور پر وہ ہندو مذہب، خاص طور سے، قدیم ویشنوی شاعروں کے حال وقال سے متاثر جو تصور پرست واقع ہوئے تھے۔'' ٹیگور شناسی: شمیم طارق، ص146

ٹیگور نے انسان کو اس دنیا میں جینے کی ترغیب دلائی ہے، نہ کہ مرنے کی۔ زندگی کو نئے ڈھنگ سے دیکھا ہے۔ جس سے زندگی کی وسعت عیاں ہوگئی ہے۔ دنیائے فانی میں انسانی وجود کو لافانی بنانے کی کوشش کی ہے یعنی روح کو خوب سے خوب تر بنا ڈالا:

میں نہیں ہوں گا تپسوی تمھاری قسم
اگر اس تپسیا کے بل سے
کوئی نئی دنیا نہ بنا سکوں
کسی کے دل میں
اگر جگا کے بینا کے تاروں کو
کسی کے حقیقی راز کے دروازے توڑ کر
کسی نئی آنکھ کے اشارے کو نہ پہچان لوں
میں نہیں ہوں گا تپسوی، نہیں ہوں گا، نہیں ہوں گا
بغیر تپسوی کے پائے ٹیگور شناسی: شمیم طارق، ص148

ٹیگور کے یہاں ماورائی ادراک کثرت کے ساتھ دیکھے جا سکتے ہیں۔ انسان اپنے اعمال کے مطابق جزا وسزا کا مستحق ہوگا۔ دنیا میں ہی اس کا حساب وکتاب ہوگا۔ اسی اعتبار سے اگلے جنم میں اچھی وبری روح کا سزاوار ہوگا۔ انسان اپنی روح کو بہتر بنانا چاہتا ہے تو اسے مذہب کے سائے میں پناہ لینی پڑے گی انسانوں کے ساتھ حسن سلوک کرنا ہوگا۔

اقبال نے اسلام کا سفر خودی کے راستے طے کیا ہے۔ انسانی حقیقت کو مالک حقیقی سے روشناس کرایا ہے۔ اقبال نے اس طریقے سے اسلام نہیں پیش کیا جس طرح ملاؤں یا فقیہوں نے پیش کیا تھا کچھ نام نہاد مولویوں نے اسلام کو محدود اور تنگ نظر بنا دیا تھا۔ اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ ان کے یہاں مشاہدات وتجربات ناقابل یقین حد تک ہیں ان کے تجربات صرف کتابی ابواب تک ہی محدود ہیں۔ اقبال نے اسلام کی وسعت پر نظر ڈالی اور امت مسلمہ میں ایک نئی روح پھونکی۔ اقبال کا یہی انداز انھیں منفرد بنا دیا۔

زاہد تنگ نظر نے مجھے کافر جانا اور کافر یہ سمجھتا ہے مسلمان ہوں میں

کاروانِ حیات وکائنات ہنوز رواں دواں ہے۔ ارتقائے حیات کبھی ختم نہیں ہوتا بلکہ رواں دواں رہتا ہے۔ زندگی کے کامل ہونے کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ انسانی حیات مکمل ہوگئی یا اس کی کوئی آخری صورت معین ہوگئی ہے۔ اس میں ہر لمحے کن فیکون کی صدا آرہی ہے۔ اقبال نے یہ آفاقی تصور دیا:

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید کہ آرہی ہے دمادم صدائے کن فیکون

زندگی حرکت وعمل کا نام ہے۔ انسان کے اندر جب حرکت وعمل کا فقدان ہوتا ہے تو وہ جمود کا شکار ہو جاتا ہے۔ جہاں بازو سمٹتے ہیں وہیں صیاد ہوتا ہے۔ اقبال ایک ایسے عمل کے جانب ہماری توجہ مبذول کرانا چاہتے ہیں جس کی جزا کچھ اور ہے۔ دنیا وآخرت کی نعمتیں مومن کا حق ہیں۔ ایک سچے مومن کو خدا نے اپنی ساری نعمتوں سے نوازا ہے۔ اس کے لیے دنیا کو مسخر کر دیا۔ اسی لیے اقبال ان قوموں پو رشک کرتے ہیں۔ جو خدا کی نعمتوں سے لطف اندوز ہو رہی ہیں۔

فردوس جو تیرا ہے کسی نے نہیں دیکھا افرنگ کا ہر قریہ ہے فردوس کی مانند

جواب شکوہ میں اقبال نے ان تمام سوالوں کا جواب دیا ہے جس کا کبھی وہ شکوہ کیا کرتے تھے۔ یعنی خدا کی رحمتیں صرف اغیار کے کاشانوں پر ہیں اور برق گرتی ہے تو بےچارے مسلمانوں پر۔ اقبال نے ان کے اندر خودی کی روح پھونکی اور یہ احساس پیدا کرایا کہ ''بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے، اسلام ترا دین ہے تو مصطفوی ہے'' اقبال نے یہ بھی جواب دیا کہ علوم وفنون کی حصول یابی کے ذریعے ہی ہم اپنی کھوئی ہوئی عظمت دوبارہ حاصل کر سکتے ہیں۔ اقبال نے ملت اسلامیہ کے احیا کے لیے جدوجہد کی امت مسلمہ کو راہ راست پر لانے کی کوشش کی۔ اقبال نے 1930 میں الہ آباد مسلم لیگ کے اجلاس کے صدارتی خطبے میں مسلمانانِ ہند کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ اب وہ وقت قریب آرہا ہے کہ یہ ملک آزاد ہوگا۔ اور جلد ہی شمال مغرب میں ایک ملک تعمیر ہوگا جہاں ہمیں موقع مل جائے گا کہ اسلام پر عہد ملوکیت میں جو بدنما داغ لگ گئے تھے ہم اسے مٹا سکیں گے۔

بال گنگا دھر تلک

اروند گھوش

تو اگر کوئی مدبر ہے تو سن میری صدا
ہے دلیری دست ارباب سیاست کا عصا
عرض مطلب سے جھجک جانا نہیں زیبا تجھے
نیک ہے نیت اگر تیری تو کیا پروا تجھے
گزر اس عہد میں ممکن نہیں بے چوب کلیم
عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کار بے بنیاد
سبق پھر پڑھ صداقت کا عدالت کا شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کم دنیا کی امامت کا
نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو الٹ دیا تھا
سنا ہے یہ قدسیوں سے میں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہوگا
کتاب ملت بیضا کی پھر شیرازہ بندی ہے
کہ شاخ ہاشمی کرنے کو ہے پھر برگ و بر پیدا

نوا پیرا ہو اے بلبل کہ ہو تیرے ترنم سے
کبوتر کے تنِ نازک میں شاہیں کا جگر پیدا

پہلی عالمی جنگ کے بعد جو نتائج برآمد ہوئے تھے اقبال اس سے اچھی طرح واقف تھے۔ 1922 میں 'خضر راہ' اور '1924 میں طلوع اسلام' کے ذریعے اسلامی فلسفے کا تصور پیش کیا، تشکیل جدید الٰہیات کی بنا ڈالی۔ ایک ولولۂ تازہ دیا ایک خوش خبری سنائی۔

ٹیگور بنیادی طور پر شاعر تھے اگر شاعری میں موسیقیت داخل ہو جائے تو اس میں نغمگی پیدا ہو جاتی ہے۔ ٹیگور شاعری اور فکشن کے علاوہ موسیقی اور مصوری کا بھی شغف رکھتے ہیں۔ ہندو مذہب میں مصوری اور موسیقی کو زبردست اہمیت حاصل ہے۔ اس کے ذریعے ٹیگور نے ہندو مذہب کی ماورائی قدروں کو بحال کرنے کی کوشش کی ہے جس میں روحانیت کا پہلو داخل ہو گیا ہے۔

اروند گھوش اور بال گنگا دھر تلک کی قومیت سے ان کو تقویت ملی اور اپنی موسیقی سے قومیت کا جو راگ چھیڑا تھا اس نے تحریک آزادی کو مزید قوت بخشی۔ قومی شعور کی بیداری کا عمل تیزی سے بڑھنے لگا۔ ٹیگور نے قومیت کا جو تصور بیان کیا ہے وہ تلک اور گھوش سے علیحدہ تھا اس لیے جو مزاج کے مطابق تھا اسے اختیار کر لیا۔

''اقبال اور ٹیگور جیسا کہ عرض کیا گیا دونوں قومیت کے اس تصور کو سرے سے رد کرتے ہیں۔ اقبال نے یہ موقف عقیدہ توحید کی سربلندی کے حق میں اختیار کیا جبکہ ٹیگور نے یونیورسل ہیومنزم کے حق میں کیا۔ یوں اقبال صرف کسی حد تک، تو ٹیگور پوری طرح قومیت کے جدید دبستان کے فکر کے آواں گارد وپیش رو کی حیثیت اختیار کر جاتے ہیں جس کی رو سے یہ تصور اپنی اصل کے اعتبار سے جمہور دشمن اور جمہوریت مخالف ہے۔'' قومیت کا تصور اور ٹیگور: معین الدین جینابڑے، ص274

ٹیگور پر اپنشدوں کے ساتھ بھگتی تحریک اور قدیم ہندوستانی فلسفے کا گہرا اثر تھا اس کے ذریعے ٹیگور عہد حاضر سے ہم آہنگی پیدا کرانا چاہتے تھے۔ دونوں کو وجود کی وحدت کا روپ دینے کی کوشش کی ہے۔

ٹیگور اور اقبال نے فنونِ لطیفہ کے ذریعے جو ساز چھیڑا تھا اس کی بازگشت عالمی سطح پر پوری دنیا میں سنائی دیتی ہیں۔ انھوں نے علوم وفنون میں جدت وشدت پیدا کی، علومِ جدید کی تشکیل نو کی۔ ان کے پیش نظر نفس انسانی اور زمانے کی رفتار کو ہم آہنگ کرنا تھا تاکہ انسان کو یہ قدرت حاصل ہو کہ وہ کائنات طلسمی حصار سے آزاد ہو سکے۔ ان کا مقصد انسان کے روحانی تجربے اور تاریخ میں ربط پیدا کرانا تھا۔ ٹیگور نے روحانی گوشے کو فطری حسن سے پرنور کر دیا، مادّہ کو ماورائی پیکر میں ڈھال دیا تو اقبال نے عملی زندگی میں وجودِ انسانی کو بلند وبالا کر دیا، انسانِ خاکی کو نوری وناری کے تصور سے پرے جہدِ مسلسل اور عمل پیہم کے بندھن میں باندھ دیا ہے۔

Mohd Arif, Research Scholar, Dept of Urdu, Jamia Millia Islamia, New Delhi - 110025

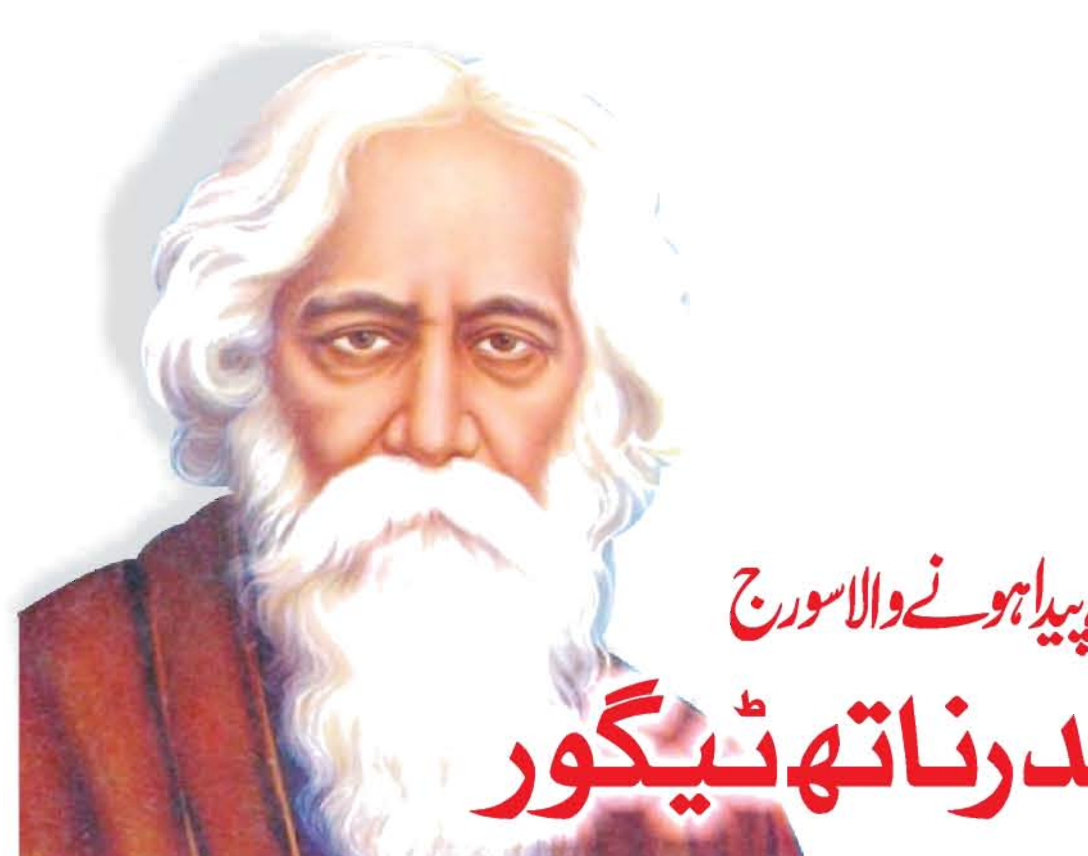

منظر اعجاز

زمین سے پیدا ہونے والا سورج

رابندر ناتھ ٹیگور

رابندر ناتھ ٹیگور کے بلند خیالات اور لطیف جذبات میں حب الوطنی کا جذبہ بھی ودیعت ایزدی تھا جس کی تہذیب وتربیت میں خاندانی اور گھریلو ماحول نے اہم کردار ادا کیا تھا اور نہایت کم عمری میں ہی ان میں شاعری کے انکھوے پھوٹنے لگے تھے۔ لیکن جب ان کی عمر 14 سال کی تھی تو افراد خاندان نے ہی ملک کے باشندوں میں حب الوطنی کے جذبات کو ابھارنے اور سودیسی مال کی فروخت کو بڑھانے کے لیے کلکتے میں ہندو میلے کا اہتمام کیا اور اسی میلے میں ٹیگور کو پہلے پہل وطن سے اپنی محبت کے منظوم اظہار کا موقع ملا۔ ان کی نظم کافی پسند کی گئی۔ والد نے پانچ سو روپیہ بطور انعام دیا۔ اگلی صبح کے اخبارات میں اس تقریب کی رپورٹیں شائع ہوئیں۔ اس نظم میں ہندوستان کی عظمت رفتہ کی جھلک موجود تھی۔ ماضی بعید اور ہندوستان کے حال کے موازنے پر یہ نظم مشتمل تھی۔ اظہار کا بالواسطہ پیرایہ اختیار کیا گیا تھا۔ اس میں دکھایا گیا تھا کہ ویاس ہمالہ پر بیٹھے ہیں اور ہندوستان کی عظمت رفتہ کو یاد کر رہے ہیں اور موجودہ دور کی پست صورت حال سے ماضی کے ہندوستان اور اس کی شان وشوکت کا موازنہ کر رہے ہیں اور یہ سوال کر رہے ہیں کہ:

ہند کی شوکت رفتہ آخر خاک ہوئی
کیا اس راکھ سے اب چنگاری اٹھ سکتی ہے؟
کیا چنگاری اب بھی شعلہ بن سکتی ہے؟
کیا یہ شعلے دنیا کو پھر سے روشن کر سکتے ہیں؟[1]

رابندر ناتھ ٹیگور کے وجود کی خاک میں ہندوستان کی عظمت رفتہ کا احساس راکھ میں دبی ہوئی چنگاری کی مانند اسی وقت سے سلگنے لگا تھا جب ان کا بچپن نوکروں کی دیکھ ریکھ میں پروان چڑھ رہا تھا اور انھیں محسوس ہوتا تھا کہ وہ غلام بادشاہوں کی رعایا میں ہیں۔ شام کے وقت ایک پڑھے لکھے نوکر سے وہ رامائن اور مہابھارت کے قصے سنا کرتے تھے۔ ان قصوں کے اثرات ان کے دل ودماغ پر مرتسم ہوتے رہتے تھے۔ اسی کم عمری کے زمانے میں جب ان کی عمر تقریباً آٹھ سال کی تھی، ان میں شاعری کے انکھوے پھوٹنے لگے تھے جس کی آبیاری میں ان کی نوبیاہتا بھابھی کادمبری دیوی نے خصوصی

رابندر ناتھ ٹیگور کو بچپن کے زمانے میں اسکول کا بند بند ماحول پسند نہیں تھا۔ گھر میں جو ملازم ان کی دیکھ ریکھ کے لیے رکھے گئے، ان کا رویہ بھی آمرانہ تھا۔ گویا ان کی زندگی قید و بند میں بسر ہورہی تھی جب کہ ان کی روح پرندوں کی مانند کھلے آسمان میں پرواز کرنا چاہتی تھی۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ مروجہ نظام تعلیم سے وہ بیزار رہے۔ والد گیان دھیان والے آدمی تھے اس لیے ان کی صحبت بھی نصیب نہ ہوتی تھی لیکن کسی نہ کسی مرحلے میں والد نے ان کے مزاج کو بے کم و کاست پہچان لیا اور اپنے ساتھ کہستانی علاقوں کی سیر کے لیے لے گئے۔

دلچسپی لی تھی۔ تتو بودھنی میں جب پہلی بار ان کی نظم پکی سیاہی میں آئی تو اس سے بھی حوصلہ افزائی ہوئی۔ اس کے بعد قلم کی جولانگاہ میں وسعت اور رفتار میں تیزی آئی۔ شعور پختہ تر ہوتا گیا۔ شعور کی پختگی کی واضح جھلک ان کی تصنیف 'مانسی' میں نمایاں ہوئی۔ باوجود اس کے ان کا تخیل جہان نو کی تلاش میں سرگرداں رہا۔ اتفاق سے مواقع بھی ملتے رہے۔

رابندر ناتھ ٹیگور کو بچپن کے زمانے میں اسکول کا بند بند ماحول پسند نہیں تھا۔ گھر میں جو ملازم ان کی دیکھ ریکھ کے لیے رکھے گئے، ان کا رویہ بھی آمرانہ تھا۔ گویا ان کی زندگی قید و بند میں بسر ہورہی تھی جب کہ ان کی روح پرندوں کی مانند کھلے آسمان میں پرواز کرنا چاہتی تھی۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ مروجہ نظام تعلیم سے وہ بیزار رہے۔ والد گیان دھیان والے آدمی تھے اس لیے ان کی صحبت بھی نصیب نہ ہوتی تھی لیکن کسی نہ کسی مرحلے میں والد نے ان کے مزاج کو بے کم وکاست پہچان لیا اور اپنے ساتھ کہستانی علاقوں کی سیر کے لیے لے گئے۔ اسی سفر کے دوران شانتی نکیتن کے پرسکون ماحول سے بھی اور کہستانی علاقوں کی سیر سے بھی ان کی روح سرشار ہوئی۔ وہ آزادی کی نعمتوں سے بہرہ ور ہوئے۔ فطرت کے مظاہر اور قدرت کے مناظر نے انھیں گھر سے باہر قدم نکالنے کے بعد ایک نئی دنیا سے آشنا کیا تھا۔ شادی بیاہ اور بال بچوں کے بعد انھیں پھر ایک نئی دنیا سے روبرو ہونے کا موقع ملا۔ یہ نئی دنیا ہندوستان کے کہستان اور بیابان سے مختلف تھی جس کی سیر انھوں نے ایام طفولیت میں اپنے والد کے ساتھ کی تھی۔ یا بنگال کے اس شہری ماحول سے بھی الگ تھی جس میں انھوں نے بچپن سے جوانی تک کے ایام گزارے تھے۔ اس دنیا میں انگلستان کا وہ شہر بھی آباد نہیں تھا جہاں وہ اپنے بڑے بھائی کے ساتھ حصول تعلیم کی غرض سے تھوڑے دنوں تک رہے تھے۔ یہ دنیا شمالی اور مشرقی بنگال کے گاؤں دیہات پر مشتمل تھی۔

انیسویں صدی کی نویں دہائی اختتام کے قریب تھی کہ ٹیگور پر موروثی جائداد کی دیکھ بھال کی ذمے داری ڈال دی گئی تھی۔ یہ جائداد شمالی اور مشرقی بنگال کی کئی زمینداریوں پر مشتمل تھی، جس کی دیکھ ریکھ کے لیے شیلائی داہ میں دفتر قائم تھا، رہائشی مکان بھی تھا اور ملازمین میں ہندو اور مسلمان بھی تھے۔ برہمن اور غیر برہمن بھی تھے۔ برہمنوں نے مسلمانوں کے ساتھ جو سلوک اور رویہ اختیار کر رکھا تھا، اُسے دیکھ کر رابندر ناتھ ٹیگور تکلیف دہ احساس سے دوچار ہوئے تھے اور اس روایت کو توڑنے کے سلسلے میں انقلابی قدم اُٹھایا تھا۔

رابندر ناتھ ٹیگور نے جب مختلف دیہی علاقوں میں آنا جانا شروع کیا تو انھوں نے ہندوستان کی کریہہ اور قبیح تصویریں دیکھیں۔ ظلم واستبداد اور جبر واستحصال کی داستانیں ہر طرف بکھری ہوئی تھیں۔ ان کا دل درد سے بھر آیا اور اس درد نے اظہار کے مختلف پیرائے اور بیان کے مختلف اسالیب اختیار کرنا شروع کر دیے۔ ان کے خیال میں اصل ہندوستان گاؤں میں بستا تھا جو کسانوں، مزدوروں، مستحصلوں اور مظلوموں کی درد بھری کہانیاں سینے سے لگائے سسک رہا تھا۔ اس کا ہمدرد، اس کا غمگسار کوئی نہ تھا۔ رابندر ناتھ ٹیگور نے اس دھرتی اور اس کے باشندوں کی صدائے بے آواز گوش دل سے سنی تو دل کے ساز سے درد بھرے سنگیت ابھرنے لگے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے 'سونے کی ناؤ' اور 'دو بیگھہ زمین' جیسی نظموں کا ذکر نامناسب نہ ہوگا۔

'سونے کی ناؤ' ایک بیانیہ نظم ہے جس میں محنت کش غریب کسان کی خون پسینے سے اگائی ہوئی فصل کی لوٹ کا قصہ بیان ہوا ہے۔ اس کا راوی واحد متکلم ہے جس کے پردے سے خود شاعر کی درد بھری آواز ابھرتی ہے:

"آسمان میں بادل گرج رہے ہیں۔ گھٹا، بارش
ندی کنارے اکیلا بیٹھا ہوں بے سہارے
دھان ڈھیر کا ڈھیر کٹ چکا ہے اور تولا جا چکا ہے۔"[2]

یہ پہلے بند کی ابتدائی تین سطریں ہیں۔ بعد کے مصرعوں اور بند سے ابھرنے والے منظر میں ندی کے اُس پار سے ایک ناؤ آتی دکھائی دیتی ہے جو ندی کے اِس پار آ کر لگتی ہے۔ ناؤ جانی پہچانی ہے۔ ناؤ میں دھان بھر لیا جاتا ہے اور پوچھا جاتا ہے اور ہے؟' جواب ملتا ہے، 'نہیں اور نہیں ہے۔'

"سب ہی دے دیا تمھیں سہیج سہیج کر
اب مجھ پر رحم کھا کر مجھے ساتھ لے لو۔"[3]

لیکن دوسری طرف سے جواب ملتا ہے کہ جگہ نہیں ہے۔ یہ ناؤ چھوٹی ہے۔ کسان سوچتا ہے کہ میرے ہی سونے کے دھان سے ناؤ بھر گئی ہے۔ اور احساس کے گھنے بادلوں میں گھرا کسان سوچتا رہ جاتا ہے:

"ساون کے آکاش کو گھیر کر گھنے بادل گھومتے پھرتے ہیں
سنسان ندی کے کنارے میں پڑا رہ گیا
جو کچھ تھا، لے گئی سونے کی ناؤ۔"[4]

'سونے کی ناؤ' اور 'دھان' استعارے ہیں بدیسی حکومت اور دیسی دولت کے۔ ہندوستان کی غربت وافلاس کا بنیادی سبب دیسی دولت کی لوٹ ہے۔ اس بدیسی حکومت کے ٹوڈی یا کاسہ لیس دیسی جاگیر دار اور زمیندار ہیں جو ہوس زر اور جوع

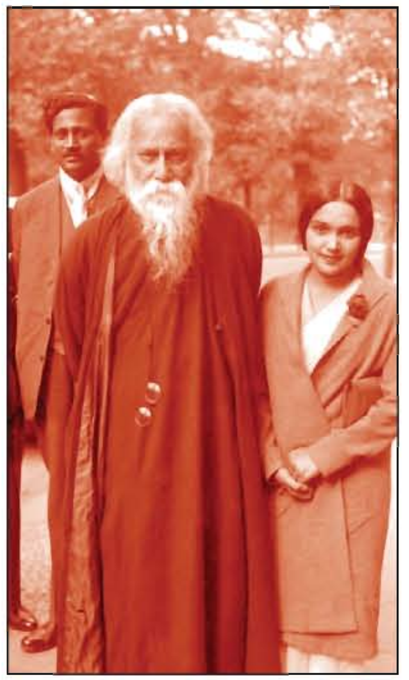

الارض میں مبتلا ہیں۔ دو بیگہ زمین کا اصل موضوع یہی ہے۔

اس نظم میں جو قصہ بیان کیا گیا ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ مہاجنوں کے قرض کی ادائیگی میں لٹ پلٹ کر ایک غریب کسان کے پاس صرف دو بیگہ زمین رہ گئی ہے، اس پر بھی اس علاقے کے زمیندار کی نظر ٹیڑھی ہے۔ وہ اپنے باغ کو چوگوشہ کرنے کے لیے زمین کے اس ٹکڑے کو حاصل کرنا چاہتا ہے لیکن بات سے بات نہیں بنتی تو جھوٹا مقدمہ کر کے آخر کار اس زمین کو ہڑپ لیتا ہے۔ اس کے بعد بے سہارا اور بے یارو مددگار کسان سادھو بن کر گاؤں سے نکل جاتا ہے۔ ایسے موقع پر شاعر واشگاف الفاظ میں زمینداروں اور سرمایہ داروں اور رئیسوں کی لوٹ کھسوٹ کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے:

"ہائے رے دنیا
اس دنیا میں وہی اور زیادہ دولت کا طالب ہے
جس کے پاس پہلے ہی ڈھیر کا ڈھیر موجود ہے
راجا کا ہاتھ ہی وہ ہاتھ ہے
جو سب غریبوں کی پونجی ہڑپ کر لیتا ہے
چرا لیتا ہے۔"[5]

رابندر ناتھ ٹیگور نے جیسا کہ ان کے سوانح نگاروں اور نقادوں کا خیال ہے، خود زمیندار ہوتے ہوئے بھی اس طبقے کے خلاف باغیانہ تیور اختیار کیا۔ یہ ان کا نہایت ہی انقلابی اور جرأتمندانہ قدم تھا۔ اور یہ کارنامہ انھوں نے اشتراکی نظریے کی تشہیر اور ترقی پسند تحریک سے بہت پہلے انجام دیا۔ انھوں نے کمزور اور معذور ومظلوم طبقے میں ہمت وحوصلے کی نئی جوت جگائی۔ ظلم اور استحصال کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کی تلقین کی۔ اپنی ایک اور نظم 'اکیا تان' میں رابندر ناتھ ٹیگور نے دنیا بھر کے کسانوں اور مزدوروں کی فتح مندی کا ساز چھیڑا ہے۔

ان کی بعض تحریروں سے واضح ہوتا ہے کہ انھوں نے ہندوستان کی معاشی حالت کا نہایت ہی گہرائی سے مطالعہ کیا تھا۔ وہ آنے والے انقلاب کی آہٹ محسوس کر رہے تھے۔ اس کی سمت کو معین اور رفتار کو تیز کرنے کے لیے کسانوں اور مزدوروں کی روزمرہ زندگی کی جیتی جاگتی تصویریں اپنے کئی ڈراموں میں پیش کیں۔ انھوں نے نظم 'عصاء حکومت' میں بے انصافیوں کے خلاف صدائے احتجاج اس طرح بلند کی کہ بے انصافی کرنے والے اور بے انصافی سہنے والے دونوں کو ایک ہی صف میں کھڑا کر دیا۔ ان کے خیال میں یہ حق بات تھی جس کے کہنے میں انھوں نے تامل محسوس نہیں کیا۔ 'عصاء حکومت' ہر چند کہ دعائیہ نظم ہے لیکن اس کا اختتام کلمات بددعا پر ہوا ہے جب کہ ابتدائی بند کے چند جملے متاسفانہ لہجے میں ادا ہوئے ہیں:

"اپنا عصاء شاہی ہر ایک ہاتھ، میں
خود ہی سونپ دیا ہے ، ہر ایک کے اوپر
تم نے حکومت کا بار رکھ دیا ہے، اے شہنشاہ!

دوسرے بند میں شاعر ہدایت کا طلبگار نظر آتا ہے کہ حق و انصاف کا معیار ووقار قائم کر سکے:

"معافی جہاں ایک کمزوری ہے
اے پُر جلال، وہاں بے مروت بن سکوں
تمھاری ہدایت سے۔ میری زبان میں
حق بات تیز تلوار کی طرح جھل مل کر اٹھے
تمھارے اشارے پر تمھاری شان قائم رکھوں
تمھارے انصاف کی کرسی پر تمھارا مقام لے لوں

اور اس کے بعد درج ذیل اختتامیہ سطروں میں ایک مخصوص تیور نظر آتا ہے:

جو بے انصافی کرتا ہے اور جو بے انصافی سہتا ہے
تمھاری نفرت اسے تنکے کی طرح
جلائے۔"[6]

یہاں 'خلیفۃ اللہ فی الارض' کا تصور واضح طور پر نظر آتا ہے جس کی رو سے اصل بادشاہ خدا ہے۔ کائنات اسی کی ملکیت ہے اور اس کائنات میں، اس روئے زمین پر انسان ہی خدا کی مشیت کا نگراں ہے، اس کا دستِ راست ہے۔ اس روئے زمین پر حق و انصاف کا نظام قائم کرنا اس کا فرض منصبی ہے۔ وہ اپنی ذمے داریوں اور کارگزاریوں کے لیے خدا کے آگے جوابدہ ہے اور اس کی ہدایتوں کا پابند ہے۔ خدا کی جملہ صفات میں ایک صفت یہ ہے کہ وہ عادل ہے چنانچہ ٹیگور کے نزدیک عدل پروری اور عدل گستری بنیادی اہمیت کی حامل ہے۔ اس لیے وہ انصاف کے معاملے میں بے مروت بن جانے کی تمنا کا اظہار کرتے ہیں تاکہ فیصلہ غیر جانبدارانہ ہو سکے۔ اور فیصلے کے نفاذ کے لیے وہ حق کی تلوار بن جانا چاہتے ہیں۔ وہ خدا کی مسندِ عدل پر متمکن ہونے کی تمنّا کا اظہار اس لیے نہیں کرنا چاہتے ہیں کہ جوع الارض میں مبتلا ہوکر، اس روئے زمین پر اپنی حاکمیت قائم کریں بلکہ اس لیے کہ خدا کی حاکمیت کا پایہ مستحکم ہو، اس کی شانِ بے نیازی اور بندہ نوازیوں کا ظہور ہو سکے۔ ٹیگور کے محولۂ بالا اقتباس میں بے رحمی یا بے مروتی کے عزم کا جو بے باکانہ اظہار ہے وہ بھی جذبۂ ترحم کی ہی پیداوار ہے۔

رابندر ناتھ ٹیگور کا حکومت کا یہ تصور الوہی نظریے کا حامل ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ وہ از اول تا آخر مذہب پسند رہے۔ حکومت کا الوہی تصور تقریباً تمام بڑے مذہبوں اور عظیم ثقافتوں میں ازمنہ قدیم سے چلا آتا ہے۔ ٹیگور کا نسلی اور آبائی تعلق جس مذہب اور جس ثقافت سے تھا، اس کی قدامت و عظمت بفتوائے تاریخ ثابت ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ٹیگور کے عہد میں عالمی سطح پر مذہب کی اصل معنویت جو اس کے روحانی پہلو سے متعلق تھی، گم ہو چکی تھی جس کی بازیافت کی کوشش انھوں نے مخلصانہ جذبے سے کی تاکہ لادین سیاست اور گم کردۂ راہ انسانی معاشرت کو حق و صداقت کی راہ دکھائی جاسکے۔ جہاں تک زیر نظر نظم کے موضوع اور مسائل کا تعلق ہے، اسے اردو میں خواجہ الطاف حسین حالی ربع صدی قبل "مناظرۂ رحم وانصاف" کے عنوان سے برت چکے تھے۔[7]

رابندر ناتھ ٹیگور نے مذہب سے بیزاری اور مادیت پسندی کے رجحان اور اس سے پیدا ہونے والے انتشار و بحران کے زمانے میں انسانی دردمندی اور محبت و اخوت کی بنیاد مذہب کو بنایا اور ہم جانتے ہیں کہ مذہب کا جوہر ایمان ہے جس میں تعقل کا ایک عنصر (Cognitive Content) شامل رہتا ہے اسی وجہ سے مذہب کو بے منت عقل رہزن قرار

دیا گیا ہے جو دل کی مخفی دولت کو چھین لیتا ہے اس لحاظ سے مذہب کے لیے تفکر لازمی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رابندر ناتھ ٹیگور کے مطالعے کے دوران ہم محسوس کرتے ہیں کہ وہ ایک ایسے شاعر ہیں جن کا ایک باضابطہ اور مربوط نظام فکر ہے جس میں انسان کو مرکزی حیثیت حاصل ہے، ان کی سیاسی فکر ہو یا معاشی اور تعلیمی نظریہ ہو، سماجی تفکر ہو یا وطن کا تصور ہو، یہ سب ان کی انسان دوستی کے بنیادی تصور سے منسلک اور مربوط ہیں اور یہ بنیادی تصور کو تقویت اور استحکام عطا کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے ان کی مذہب پسندی محض اعتقادی، روایتی، اور رسمی و رواجی نہیں ہے۔ مذہب کی تعریف پروفیسر وھائیٹ ہیڈ (Whitehead) نے ان الفاظ میں کی ہے:

ٹیگور کا نسلی اور آبائی تعلق جس مذہب اور جس ثقافت سے تھا، اس کی قدامت و عظمت بفتوائے تاریخ ثابت ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ٹیگور کے عہد میں عالمی سطح پر مذہب کی اصل معنویت جو اس کے روحانی پہلو سے متعلق تھی، گم ہو چکی تھی جس کی بازیافت کی کوشش انھوں نے مخلصانہ جذبے سے کی تاکہ لادین سیاست اور گم کردۂ راہ انسانی معاشرت کو حق و صداقت کی راہ دکھائی جاسکے۔

"یہ (مذہب) عام حقائق کا وہ نظام ہے جسے اگر خلوص سے مانا جائے، اور جیسا کہ اس کا حق ہے سمجھ لیا جائے، تو اس سے سیرت و کردار بدل جاتے ہیں۔"[8]

یہ طے ہے کہ ارابندر ناتھ ٹیگور نے مذہب کو نہایت خلوص اور دل کی گہرائیوں سے مانا تھا اور اسے جہاں تک سمجھا تھا، وہ عام لوگوں کی سمجھ سے بالاتر تھا۔ اور عام لوگ تو کیا ہندوستان کی آزادی کے معاصر تحریک کاروں اور سیاسی رہنماؤں کی فہم و فراست سے بھی ٹیگور کے افکار و تصورات بالاتر تھے۔ ٹیگور کے بلند ترین نصب العین تک ان کی رسائی نہیں تھی۔ رابندر ناتھ ٹیگور نے سوراج، تعاون وعدم تعاون، نیشنلزم (Nationalism)، پیٹریوٹزم (Patriotism) جیسے سلگتے سوالوں پر جس جرأت و بیباکی کے ساتھ اظہار خیال کیا، وہ جرأت و بیباکی سیاسی رہنماؤں میں بھی نہیں تھی یہاں تک کہ جلیانوالہ باغ کا جو سانحہ پیش آیا، اس پر امرتسر ہی میں کانگریس کے سیشن میں چون و چرا تک کو خلاف مصلحت سمجھا گیا، احتجاج کیا کیا جاتا! جبکہ احتجاج کی تجویز کے ساتھ ٹیگور نے چارلی فریئر انڈریوز کو اپنا خاص قاصد بنا کر گاندھی جی کے پاس بھیجا تھا، جو مایوس لوٹے تھے۔ ٹیگور نے کلکتہ میں بھی احتجاجی جلسہ منعقد کرانے کی کوشش کی تھی۔ لیکن بلی کے گلے میں گھنٹی کون باندھتا۔ ٹیگور کو اس صورت حال سے مایوسی ہوئی۔ لیکن خود ان میں جرأت و حوصلے کی کمی نہیں تھی۔ ان کا عقیدہ تھا کہ جب تیری آواز پر کوئی لبّیک نہیں کہتا تو، تو، خود آگے بڑھ۔ اور ایسا ہی ہوا۔ انھوں نے 'سر' کا خطاب واپس کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ وائسرائے کے نام اس سلسلے میں جو خط لکھا، اسے پڑھ کر انڈریوز سہم اٹھے تھے۔

بہر حال اس سلسلے میں اور بہت سی باتیں ہیں لیکن تفصیل میں جانے کا یہ موقع نہیں۔ البتہ نیشنلزم اور پیٹریوٹزم پر گفتگو ضروری ہے۔ اس سلسلے میں نامناسب نہ ہوگا اگر سبیا سچی بھٹا چاریہ کے خیال پر ہی پہلے نظر ڈالی جائے۔ وہ لکھتے ہیں:

It is well known that Tagore although an ardent and articulate proponent of Nationalism during the Swadeshi agitation in the first decade of the twentieth century, began to be increasingly critical of the kind of nationalism he saw at work in the process of Japan's growth into an aggressive imperialistic power, the synergistic thrust in Europe towards the global conflict of 1914-18, and the emergence of nationalistic terrorism in Bengal"[9]

یعنی قوم پرستی اور سودیشی تحریک کا حامی ہونے کے باوجود وہ جاپان جیسی قوم پرستی کے حق میں نہیں تھے جس نے اسے ایک سامراجی طاقت میں تبدیل کر دیا تھا۔

رابندر ناتھ ٹیگور پکے اور سچے قوم پرست اور وطن دوست تھے اور آخر آخر تک اپنی راہ سے نہیں بھٹکے۔ وہ اگر سودیشی تحریک کے حلقہ بگوش، حمایتی اور پرجوش و سرگرم رکن رہے تو اس میں کوئی حیرت کی بات نہیں۔ کیونکہ سودیشی کا تصور تو خود ان کا خانہ زاد تھا۔ انھیں کے خاندان کے لوگوں نے تین دہائی قبل کلکتے میں ہندو میلے کا اہتمام کیا تھا۔ جس میں خود ٹیگور بھی شامل تھے۔ لیکن اس میلے کا مقصد ثقافتی تھا۔ اس کے ذریعے ہندوستانی آرٹ اور کرافٹ یا گھریلو صنعت کو فروغ دینے کی کوشش کی گئی تھی۔ اس کا ایک پہلو معاش اور معیشت سے متعلق تھا یعنی اس کے فروغ سے بے کاری، بے روزگاری اور غربت و افلاس پر قابو پایا جا سکتا تھا۔ اس میلے کا اہتمام بعد میں بھی کیا جاتا رہا۔ ٹیگور نے پہلی بار جب میلہ منعقد کیا تھا تو حب الوطنی کے جذبات سے سرشار اپنی نظم سنائی تھی۔ کسی عوامی جلسے میں نظم خوانی کا یہ ان کا پہلا تجربہ تھا۔ وہ بعد کے میلے میں بھی شریک ہوئے اور اس میں بھی اپنی نظم سنائی اور آگے چل کر تو انھوں نے دیسی مال کی باضابطہ تجارت ہی کر لی تھی۔ لیکن سبیا سچی بھٹا چاریہ کا یہ خیال درست نہیں کہ جاپان کی جارحانہ قوم پرستی کی وجہ سے ٹیگور نیشنلزم کے مخالف ہو گئے تھے۔ یہ مخالفت بہت بعد کی بات ہے۔ دراصل چین ابھی آزاد ہی ہوا تھا اور اس نے ٹھیک سے سنبھالا بھی نہیں لیا تھا کہ اس کے خلاف جاپان کا رویہ جارحانہ ہو گیا تھا۔

ہندوستان میں سودیشی تحریک جو شروع ہوئی اس کا مقصد سیاسی تھا۔ اس نے قوم پرستی کے جذبے کو ابھارا۔ اس کے عزائم وہ تھے جو ٹیگور کے افکار و تصورات سے میل نہیں کھاتے تھے۔ وہ اچھی طرح سمجھ رہے تھے کہ حصول آزادی کے لیے تلوار پر سان چڑھانے اور ہتھیار تیار کرنے کا یہ کارخانہ بن جائے گا۔ ٹیگور نے مخلصانہ طور پر اس سمت گاندھی جی کی توجہ مبذول کرائی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ یہ ہتھیار اگر غلط ہاتھ میں آ گیا تو اس کا انجام برا ہوگا۔ اور ہوا بھی یہی جس کا انھیں اندیشہ تھا۔ مغرب سے مستعار نیشنلزم کے زیر اثر جس کی بنیاد نسلی تعصب پر تھی، سودیشی تحریک کے بطن سے جو قوم پرستی پیدا ہوئی، وہ دہشت گرد ہو گئی۔ اس کے اثرات بنگال تک ہی محدود نہیں رہے۔ بہار کے چوراچوری کا واقعہ اسی دہشت گردانہ رجحان کا نتیجہ تھا۔ اور 1908 میں کھودی رام بوس نے جو مظفر پور کے ڈی ایم پر بم پھینکا اور دو معصوم انگریز ہلاک ہو گئے۔ یہ افسوسناک واقعہ بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھا۔ ٹیگور ان واقعات سے نہایت ہی بد دل ہوئے اور انھوں نے اس بددلی کا اظہار بھی کیا۔

عرض کیا جا چکا ہے کہ ٹیگور مذہب پسند واقع ہوئے تھے اور خدا اور اس کی ملکیت اور حاکمیت پر غیر متزلزل یقین رکھتے تھے اس لیے انھوں نے مغرب کی لادین سیاسی اصطلاح 'نیشنلزم' کو نہ صرف اجنبی بلکہ اپنے وطن عزیز ہندوستان کے لیے گمراہ کن سمجھا بلکہ اسے نہایت ہی جرأت مندی اور بیباکی کے ساتھ رد کر دیا۔ انھوں نے لکھا:

We have no word for Nation in our language When we borrow this word from other people, it never fits us. For we are to make our language with NARAYNA, and our victory will not give us anything but victory itself: victory for God's world."[10]

ٹیگور نے پہلی بار جب میلہ منعقد کیا تھا تو حب الوطنی کے جذبات سے سرشار اپنی نظم سنائی تھی۔ کسی عوامی جلسے میں نظم خوانی کا یہ ان کا پہلا تجربہ تھا۔ وہ بعد کے میلے میں بھی شریک ہوئے اور اس میں بھی اپنی نظم سنائی اور آگے چل کر توانھوں نے دیسی مال کی باضابطہ تجارت ہی کرلی تھی۔ لیکن سبیا سچی بھٹاچاریہ کا یہ خیال درست نہیں کہ جاپان کی جارحانہ قوم پرستی کی وجہ سے ٹیگور نیشنلزم کے مخالف ہوگئے تھے۔ یہ مخالفت بہت بعد کی بات ہے۔ دراصل چین ابھی آزاد ہی ہوا تھا اور اس نے ٹھیک سے سنبھالا بھی نہیں لیا تھا کہ اس کے خلاف جاپان کا رویہ جارحانہ ہوگیا تھا۔

مہاتما گاندھی کے تعاون اور عدم تعاون کے سیاسی موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے رابندر ناتھ ٹیگور نے یہ باتیں کہی تھیں۔ ٹیگور کے سامنے قابل افسوس پہلو یہ تھا کہ جس ہندوستان نے اِلٰہیاتی تفکر میں سب سے پہلے قدم بڑھایا اور معرفت حاصل کی اور اس کی بنیاد پر تہذیب و ثقافت کی عظیم الشان عمارت تعمیر کی اور ساری دنیا کی رہنمائی کا کارنامہ انجام دیا، 'وشوگرو' کہلایا اسی ہندوستان میں مغرب کے لادین فلسفے کو رامائن اور مہابھارت کی تعلیمات پر اہمیت اور سبقت حاصل ہو رہی ہے۔ ایسے کسی بھی اقدام یا عمل کو ٹیگور مادر وطن ہندوستان کی توہین پر محمول کرتے تھے۔ اسے دھرتی کی ناقدری مانتے تھے۔ اور اس سے ان کا دل کڑھتا تھا۔ مادر وطن کے حال زار پر ان کا دل رو اٹھتا تھا۔ اپنی نظم 'جنت کو الوداع' میں وہ جنت کی خوش حالیوں اور اس کے آب نشاط انگیز پر، دھرتی کو، جو مادر وطن ہے ان کی اور تمام انسانوں کی، ترجیح دیتے ہیں تاکہ بے قدر بے چاری دھرتی، دکھ درد کی ماری دھرتی کی آنکھوں سے بہنے والی آنسوؤں کی دھارا کو، پونچھ سکیں۔ وہ دھرتی سے اس طرح ہم کلام ہوتے ہیں:

"اے بے قدر بے چاری دھرتی
آنسوؤں بھری، آنکھوں والی دکھ سے بے چین
اے مادر وطن آج بہت دنوں بعد
رو اٹھا ہے میرا دل تمھارے لیے۔"[11]

یہاں مادر وطن، ہندوستان کسی جغرافیائی اور سیاسی سرحدوں میں قید نہیں، پوری دھرتی، یعنی ارضی کلیت ہی مادر وطن ہے۔ اپنے چہار سمتوں کے ساتھ۔ پورب، پچھم، اتر، دکھن اس کے حدود اربعہ ہیں۔ ان کی نظم 'وسن دھرا' میں بھی بنیادی تصور یہی ہے۔

رابندر ناتھ ٹیگور نے نظم 'وسن دھرا' بتیس سال کی عمر میں کہی تھی، اس میں انسانیت نوازی اور انسانیت سازی کے جس جذبے کا اظہار ہوا ہے۔ مشرق تا مغرب اقوامِ عالم کے احترام کا جو جذبہ ابھرا ہے، دنیا کے ہر ملک اور ہر گھر میں جنم لینے کی آرزومندی جس انداز و اسلوب میں ہمارے سامنے آئی ہے، مذاہب عالم کی تحریم و تعظیم کے ساتھ جس رواداری اور وسیع المشربی کے ساتھ اقوام عالم میں گھل مل جانے کی تمنا کا اظہار ہوا ہے، اسے دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ بطن گیتی سے کوئی آفتاب تازہ پیدا ہوا ہے جس کی روشنی عالم انسانی کے سارے نشیب و فراز پر پڑ رہی۔ ہر گوشۂ خلوت و جلوت یکساں طور پر منور ہو رہا ہے۔

رابندر ناتھ ٹیگور اپنی لامحدود اور پراسرار قوت مدافعت کے ساتھ نامساعد حالات کا مقابلہ کرتے ہوئے انسانیت نوازی اور انسانیت سازی کی مہم میں سرگرم کار رہنے کے جذبے سے سرشار نظر آتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں:

"اپنی لامحدود ہاتھ نہ آنے والی رمزیت میں بِراجوں
کڑی چٹانوں کی گود میں، تیکھی برفیلی ہواؤں میں
میں چھپے چھپے انسان بناؤں"[12]

یہ حوصلہ نہایت ہی انہماک، اعتکاف ذات یا کسی سادھو کی سچی سادھنا ہی سے پیدا ہوتا ہے۔ کسی ظاہر بیں اور ظاہر پرست کو باطن کی یہ دولت نایاب حاصل نہیں ہو سکتی۔ اور اس میں یہ حوصلہ پیدا نہیں ہو سکتا کہ وہ ٹیگور کی طرح اپنے احساسات و جذبات، اپنے خیالات، اور اپنے افکار و تصورات کا اظہار، ترسیل کے اس پیرائے اور ابلاغ کے اس اسلوب میں کر سکے۔ ٹیگور 'وسن دھرا' میں ہی اپنا تسلسل خیال برقرار رکھتے

ہوئے آگے فرماتے ہیں:

””نئی نئی قوموں کو — دل ہی دل میں چاہتا ہوں
سب قوموں کے ان کا ہم قوم ہو کر رہوں
دیس بدیس میں، اونٹنی کا دودھ پی کر
ریگستان میں انسان بنوں عرب، سنسان ہو کر
جو کسی سے نہ دبے آزاد! تبت کے پہاڑوں کے کنارے
پتھروں سے بنی الگ تھلگ نگری کے بیچ بدھ (دھرم) مٹھوں (خانقاہوں) میں
گھومتا پھروں جو ہر انگور پینے والے ایرانی
جو گلاب کے باغوں میں بستے ہیں تاتار جو نڈر
گھوڑ سوار ہیں، جاپانی جو آداب و تہذیب کے پتلے اور تابندہ شخصیت، رکھتے ہیں،
واقف کار اور قدیم چین جو دن رات
کام میں لگا ہوا ہے ہر ملک میں، گھر گھر میں
جنم لوں ایسی آرزو رکھتا ہوں“[13]

طویل نظم 'وسن دھرا' کی ان چند سطور سے بھی واضح ہے کہ وہ ایسے قوم پرست ہیں جو دوسری قوموں کا احترام اقدارِ عالیہ کی بنیاد پر کرتے ہیں، وہ ایسے وطن دوست یا محب وطن ہیں جو دوسری قوموں اور اوطان کو بھی اپنا ہم قوم و ہم وطن سمجھتے ہیں۔ وہ وطن کے جغرافیائی حدود کو ناعاقبت اندیش مغربی سیاست کے زائیدہ و پروردہ 'نیشنلزم' کے تصور سے منافرت کی دیوار نہیں بننے دیتے۔ مجھے تو یہ بھی کہنے میں کوئی تامل اور تکلف نہیں کہ جب ساری دنیا کے پیغمبرانِ سیاست اس باطل خدا کے آگے سجدہ ریز تھے، اس وقت ٹیگور براہیم بت شکن بن کر ابھرے۔ انھوں نے نہایت ہی جرأت و بیباکی کے ساتھ ہندوستان کی حیثیت و عظمت کا اعلان کیا۔ انھوں نے کہا:

'I feel that India is an ideal and not mere geografical fact' [14]

اور اسی آئیڈیل کو روشناس عالم کرانے کے لیے انھوں نے بنگالی زبان کی گیتانجلی اور دوسرے مجموعوں کی منتخب نظموں کو Song Offerings میں منتقل کیا اور اس کی اشاعت کی طرف خصوصی توجہ کی۔ اس سلسلے کی پیش رفت میں ان کے آرٹسٹ بھانجے کے ایک آرٹسٹ دوست ولیم روتھین اسٹائن (William Rothen Staien) کا تعاون حاصل ہوا۔ روتھین اسٹائن کے توسط سے ہی ولیم بٹلر ئیٹس (William Butler Yeats) اور چارلی فریئر انڈریوز Charli Fraeer Endrews اور انگلستان کے دوسرے اکابر ادب و فن ٹیگور کے حلقۂ اثر میں آئے اور ان کے حق میں نوبیل انعام کے لیے زمین ہموار اور فضا سازگار ہوئی۔ انھیں نوبل انعام سے نوازا گیا۔ اس کے بعد سارے عالم کے طوفانی دورے کا دور شروع ہوا اور وہ اپنے خاص مشن یعنی اپنے آئیڈیل 'انڈیا' کو روشناس عالم کرانے میں کامیاب ہوئے۔ اس سے صرف ہندوستان ہی کی عظمت میں چار چاند نہیں لگے بلکہ یہ پورے ایشیا کے لیے تمغۂ افتخار ثابت ہوا۔ ٹیگور ہند کے روحانی سفیر قرار دیے گئے۔ اگر میں انھیں امن عالم کا مشیر کہوں تو شاید غلط نہ ہوگا۔ انھوں نے انسانی محبت و اخوت کے جذبے کو جس سوز و ساز سے ابھارا، اس کا معترف آج بھی سارا عالم ہے۔ انھوں نے خدا کی ملکیت اور حاکمیت کے استحکام کے لیے محبت کے حربے سے جنگ لڑی اور فتح و ظفر نے ان کے پاؤں چوم لیے۔ لیکن انھوں نے اپنے عزم و حوصلے کے مطابق تادم آخر یہ جنگ جاری رکھی جس کی علامت کے طور پر 'وشو بھارتی' کو دیکھا جا سکتا ہے جس میں دنیا کی تمام تہذیب و

ثقافت کی اعلیٰ قدروں کو فروغ دینے کا کام شروع کیا گیا۔ یہ ٹیگور کی قوم پرستی اور وطن دوستی کے تصور کی عملی تصویر تھی۔ انھوں نے ساری دنیا کو اپنا گھر مانا اور ساری دنیا کے باشندوں کو اپنا قریبی عزیز قرار دیا۔ انھوں نے کہا:

"My home is everywhere
I seek it desperately
My country is everywhere
I shall fight to win it
In every home there dwells
My closest of kin
I seek him everywhere [15]

بطور مجموعی اس کا مفہوم وہی ہے جو اقبال نے مغرب کے جارحانہ سیاسی تصور وطن کو رد کرتے ہوئے کہا تھا:

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا
مسلم ہیں ہم، وطن ہے سارا جہاں ہمارا[16]

اقبالیات کے نام نہاد ماہرین جو وطن کی محبت کے جذبے اور وطن کے تصور میں فرق کرتے ہیں اور اس بنا پر اس عقیدے کا بت پالے ہوئے ہیں کہ کسی زمانے میں اقبال کے تصورِ وطن میں تبدیلی آ گئی تھی، انھیں از سر نو اپنے نظریے پر نظر ثانی کرنی چاہیے۔

رابندر ناتھ ٹیگور اور اقبال کے افکار و تصورات میں مماثلت کے آیات و آثار بے شمار ہیں لیکن یہاں ان دو عظیم شاعروں اور مفکروں کا موازنہ مقصود نہیں۔ البتہ اس پہلو پر نظر رہنی چاہیے کہ مذہب پسندی اور روحانی اقدار کی طرف داری کے باوجود ان میں سے کوئی بھی مغضب روحانیت یعنی افیونی خواص کی حامل روحانیت کا قائل نہیں تھا۔ اقبال بھی مغرب کی مادی قوت اور سائنس اور ٹکنالوجی میں اس کی برتری کے منکر نہیں تھے۔ انھیں اس کی قوت و صلاحیت کے غلط استعمال پر اعتراض تھا اور یہی اعتراض مشرق کی مغضب روحانیت پر تھا جس کا نتیجہ مشرق کی بے عملی تھی اس لیے انھوں نے مغرب و مشرق دونوں پر اعتراض کیا اور کہا:

خودی کی موت سے مغرب کا اندروں بے نور خودی
کی موت سے مشرق ہے مبتلائے جذام[17]

دراصل وہ ان دونوں کا امتزاج چاہتے تھے۔ ٹیگور کا بھی یہی خیال تھا جس کا اظہار گیتانجلی کے سلسلے میں انگلستان میں ہونے والے دوسرے جلسے کے موقع پر انھوں نے چارلی فریئر انڈریوز سے کیا تھا۔ یعنی مغرب کی مادی قوت و صلاحیت مشرقی روحانیت سے ہم کار ہو کر امتزاج قائم کر لے تو اس سے انسانیت کی خدمت کا اہم کارنامہ انجام پا سکتا ہے، ساری دنیا میں محبت و اخوت اور امن کی فضا بحال ہو سکتی ہے۔ ان کی ساری فکری، فنی اور عملی کاوشیں اسی تصور کے زیر اثر تھیں۔ یہی ان کا بنیادی مقصد تھا جس کی تکمیل کے لیے وہ ملکوں ملکوں پھرے اور در در اپنا پیغام پہنچانے کی کوشش کی۔ ان کے اس سلسلے کے سفر کی طویل فہرست ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ نیوزی لینڈ (Newzealand) اور آسٹریلیا (Australia) نہ جا سکے لیکن انھوں نے تقریباً تمام بڑے ممالک کے دورے کیے۔

ٹیگور جہاں بھی گئے، وہاں کے باشندوں اور ان کے ملکوں کے احوال و آثار اور تہذیب و ثقافت کو سمجھنے میں گہری دلچسپی لی۔ ان کے خطوط، ڈائری اور شاعری میں اس سلسلے کے حوالے موجود ہیں۔ انھوں نے اجنبی ملکوں کے اجنبی باشندوں سے شناسائی کی اور دور افتادگان کی قربت اس طرح حاصل کی جیسے وہ انھیں کے خاندان، انھیں کے ملک اور وطن کے فرد

حیاتِ ٹیگور - ایک نظر میں

1861	:	(7 مئی) کلکتہ میں پیدا ہوئے۔ ٹیگور اپنے والدین کی چودھویں اولاد اور آٹھویں بیٹے تھے۔			
1868	:	کلکتہ کے 'اورینٹل سیمنری' میں اور پھر 'نارمل اسکول' میں داخل کیے گئے۔ گھر پر زبان، موسیقی، ڈرائنگ، کسرت اور پہلوانی کی تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا۔			
1871	:	گھر کی لائبریری میں جانے لگے۔ بنگالی ادب کے مطالعے میں دلچسپی بڑھنے لگی۔	1872	:	ایک نئے اسکول 'بنگال اکادمی' میں داخل کیے گئے۔
1873	:	مذہبی تقریب منعقد ہوئی اور اس میں 'جنیو' یعنی برہمنوں کا مقدس دھاگا پہنایا گیا۔	1874	:	'سینٹ زیویئرس اسکول' میں داخل کیے گئے۔
1875	:	والدہ کا انتقال	1876	:	اسکول ریکارڈ کے مطابق حاضری کم رہتی تھی۔ بالآخر اسکول بھی چھوڑ دیا۔
1875-77	:	شعر موزوں کرنے لگے تھے۔ بعض نظمیں شائع بھی ہوئیں۔	1877		(ستمبر): بیرسٹری کی تعلیم کے لیے بڑے بھائی کے ساتھ لندن گئے
1878-79	:	Brighton کے اسکول میں اور پھر لندن یونیورسٹی کالج میں داخل کیے گئے۔	1880		(فروری) کوئی ڈگری لیے بغیر لندن سے واپس آئے۔ گھر والوں میں ناراضگی
1883	:	(9 دسمبر) مرنالنی دیوی سے شادی ہوئی۔ اصل نام بھبھتارینی تھا۔	1884	:	'آدی برہما سماج' کے سکریٹری مقرر ہوئے۔
1885	:	'فیملی جرنل بالک' کی ادارت سنبھالی۔ گیتوں کا پہلا مجموعہ 'ربی چھایا' شائع کیا۔			
1886	:	کلکتہ کے کانگریس سیشن میں شریک ہوئے اور ایک افتتاحی نظم خود پڑھی یا ان کی نظم دوسروں نے پڑھ کر سنائی۔ کانگریس کا یہ اجلاس دادا بھائی نوروجی کی صدارت میں منعقد ہوا تھا۔			
1890	:	دوسری مرتبہ انگلستان کا سفر کیا۔ اٹلی اور فرانس بھی گئے۔			
1896	:	رابندر ناتھ ٹیگور نے جاگیر کا انتظام اتنی عمدگی سے سنبھالا کہ والد خوش ہو گئے اور تمام اختیارات انھیں کو سونپ دیے۔			
1898-99	:	'بھارتی' کے اڈیٹر مقرر رہے۔			
1901	:	مستقل طور پر بال بچوں کے ساتھ شانتی نکیتن میں قیام کیا اور اسی سال وشو بھارتی کا قیام عمل میں آیا۔			
1910	:	'گیتانجلی' مکمل ہو گئی۔ کلکتہ میں ٹیگور کی جوبلی منائی گئی۔ تیسری بار انگلستان کا سفر کیا۔			
1911	:	کانگریس کے کلکتہ سیشن میں 'جن من گن...' گایا گیا۔			
1912	:	اپنے بچوں کو لے کر انگلستان گئے اور وہیں سے امریکہ کے دورے پر چلے گئے۔ 16 نومبر 1913 کو انھیں 'گیتانجلی' کی تخلیق پر 'نوبیل پرائز' ملا۔			
1913	:	کلکتہ یونیورسٹی نے ڈی لٹ کی ڈگری دی۔			
1915	:	حکومت ہند (انگریزوں) نے Knighthood کے خطاب سے نوازا۔			
1917	:	چین اور جاپان کا دورہ کیا۔ سی آر داس، بی سی پال اور فضل الحق نے ٹیگور سے درخواست کی کہ وہ کلکتہ کانگریس کی استقبالیہ کمیٹی کی صدارت قبول کریں۔ ٹیگور نے کلکتہ کانگریس میں شرکت کی اور نظم سنائی۔			
1919	:	جلیان والا باغ کے المیہ سے متاثر ہو کر احتجاجاً 'Knighthood' کا خطاب واپس کر دیا۔			
1920	:	گاندھی جی کی دعوت پر احمد آباد آئے۔	1921-22	:	ہندوستان کے مختلف شہروں کا دورہ کیا۔
1924	:	دوسری بار جاپان اور چین گئے اور وہیں سے اٹلی چلے گئے جہاں موسیلینی سے ملاقات کی۔			
1925	:	ہندوستانی فلاسوفیکل کانگریس کے صدر منتخب ہوئے۔	1926	:	ملایا، کینیڈا، جاپان اور ہند چین کا دورہ کیا۔
1930	:	مصوری شروع کی۔ اسی سال آپ کی تصویروں کی نمائش فرانس اور امریکہ میں ہوئی۔ اسی سال روس کا دورہ بھی کیا۔			
1931	:	آکسفورڈ یونیورسٹی کی دعوت پر انگلستان گئے پھر وہاں سے جرمنی بھی گئے۔	1932	:	ایران کے دورہ پر گئے اور شاہ ایران کے مہمان رہے۔
1934	:	زلزلے کے سلسلے میں گاندھی جی کے بیان سے اختلاف کیا۔ نہرو ٹیگور سے ملے تاکہ اندرا گاندھی کو شانتی نکیتن میں داخل کریں۔			
1935	:	بنارس ہندو یونیورسٹی نے ڈی لٹ کی ڈگری دی۔	1938		جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد نے ڈی لٹ کی ڈگری دی۔
1939	:	پنڈت نہرو نے شانتی نکیتن میں 'ہندی بھون' کا افتتاح کیا۔	1940	:	آکسفورڈ یونیورسٹی نے ڈی لٹ کی ڈگری دی۔
1941	:	تریپورہ کے راجہ نے 'بھارت بھاسکر' کا خطاب دیا۔			
1941	:	(7 اگست) کلکتہ میں انتقال ہوا۔ (ٹیگور شناسی: شمیم طارق، سنہ اشاعت: جون 2013، ناشر: ٹیگور ریسرچ اینڈ ٹرانسلیشن اسکیم، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی			

ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ اندرون ملک اور بیرون ملک انھیں بے پناہ محبت و عزت اور شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی۔ غالباً وہ پہلے ایشائی مصنف ہیں جن کی بہت سی کتابیں دنیا کی تقریباً تمام بڑی زبانوں میں ترجمہ ہوئیں جن کے وسیلے سے ان کے احساسات و جذبات اور افکار و تصورات ساری دنیا میں پھیلے۔ اس طرح ٹیگور نے دنیا کی مختلف اقوام و ملل کے دلوں کو چھو لیا اور جہاں ان کے دلوں میں اپنی جگہ بنائی، وہیں عالمی ادب میں بھی اپنی نمایاں شناخت قائم کرنے میں کامیاب ہوئے۔

رابندر ناتھ ٹیگور نے اپنے آخری ایام زندگی میں جب ماضی پر نظر ڈالی تو کہا:

"East and West joined hands in friendship in me, in my own person. In my spirit I have realised the meaning of my name Rabi(or the Sun)." (18)

رابندر ناتھ ٹیگور 7 مئی 1961 کو کلکتے کے جوڑا سانکو میں اپنے آبائی مکان میں پیدا ہوئے تھے۔ انھیں گھر کے لوگ 'ربی' کہہ کر پکارتے تھے جو ان کے نام کا مخفف تھا اور جس کا معنیٰ 'آفتاب' ہے۔ وہ واقعی آفتاب کی مانند بطن گیتی سے طلوع ہوئے تھے اور 7 اگست 1941 کو ساری دنیا میں اپنے فکر و فن کی روشنی بکھیر کر اپنے اسی پیدائشی مکان میں غروب ہو گئے۔ لیکن انھوں نے جو روشنی بکھیری تھی، اس کی تابندگی اب تک ماند نہیں پڑی ہے بلکہ اس کی درخشانی اور تابانی روز افزوں بڑھتی ہی جا رہی ہے۔

ٹیگور ایک عظیم انسان اور ایک عظیم شاعر تھے جنھوں نے اپنی شاعری میں پیغمبری کی شان پیدا کر لی تھی۔

پروفیسر میکنزی کے اس خیال کی روشنی میں ربندر ناتھ ٹیگور کی شخصیت کا مطالعہ اور شاعری کا تجزیہ ہمیں ایک ایسے شاعر سے متعارف کراتا ہے جسے اقبال کی زبان میں 'محرم راز درونِ میخانہ' قرار دیا جا سکتا ہے لیکن اس اجمال کی وضاحت کے لیے نامناسب نہ ہوگا اگر پروفیسر اجتبیٰ حسین رضوی کی نظم 'شاعر' کا ایک بند پیش کر دیا جائے۔ وہ 'قوم' سے خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

قوم! شاعر ہے وہ اک محرم اسرارِ عظیم
جس کے سینہ سے نبی اٹھتے ہیں اور سر سے حکیم
جس کی سرحد میں گلے ملتے ہیں سقراط و کلیم
لے حیات اس سے کہ وہ شعلۂ تابش تقسیم
کبھی صدیوں میں تجلّی سا چمک جاتا ہے زندگی گورِ غریباں پہ چھڑک جاتا ہے [21]

رابندر ناتھ ٹیگور فی الحقیقت ایسے ہی شاعر تھے جو صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں اور مردہ قوم میں زندگی کی نئی روح پھونک دیتے ہیں۔ ٹیگور نے اپنی شاعری کے پیمانے سے آبِ حیات لنڈھایا ہے اور فکر و فن سے مسرت و بصیرت کے جام چھلکائے ہیں۔

حواشی

(1) رابندر ناتھ ٹیگور، ہیرن مے بنرجی، پبلی کیشنز ڈویژن نئی دہلی 1996، ص 64
(2) ایک سو ایک نظمیں، رابندر ناتھ ٹیگور، مترجم: فراق گورکھپوری، ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی، دوسری بار 1983، ص 63
(3) ایضاً، ص 64
(4) یضاً، ص 64
(5) رابندر ناتھ ٹھاکر: حیات و خدمات۔ شانتی رنجن بھٹاچاریہ، مغربی بنگال اردو اکادمی، کلکتہ 1990 ص 95
(6) ایک سو ایک نظمیں، رابندر ناتھ ٹیگور، مترجم: فراق گورکھ پوری، ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی، دوسری بار 1983، ص 250-51
(7) مجموعہ نظم حالی، خواجہ الطاف حسین حالی، مطبع مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ 1929، ص 32 تا 38
(8) تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ۔ علامہ اقبال مترجم: سید نذیر نیازی۔ اسلامیہ بک سنٹر، نئی دہلی، ترمیم شدہ ایڈیشن، 1992، ص 42
(9) The Mahatma and the poet. Sabyasachi Bhattacharya, N.B.T1997,p.28,
(10) Ibid. p.55
(11) ایک سو ایک نظمیں، رابندر ناتھ ٹیگور، مترجم: فراق گورکھپوری، ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی۔ دوسری بار 1983، ص 150
(12) ایضاً، ص 112
(13) ایضاً، ص 112-113

رابندر ناتھ ٹیگور فی الحقیقت ایسے ہی شاعر تھے جو صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں اور مردہ قوم میں زندگی کی نئی روح پھونک دیتے ہیں۔ ٹیگور نے اپنی شاعری کے پیمانے سے آب حیات لنڈھایا ہے اور فکر و فن سے مسرت و بصیرت کے جام چھلکائے ہیں۔

(14) The Mahatma and the poet, Sabyasachi Bhattacharya. N.B.T1997 p.61
(15) Rabindranath Tagore. A Life Story. Kshitis Roy, Translated by Lila Roy, from the original in Bengali, Publications Division, New Delhi- 2012, p.74
(16 کلیات اقبال۔ علامہ اقبال (ترانۂ ملی) کتب خانہ حمیدیہ، دہلی، چوتھا ایڈیشن 1987 ص 18

اسلام کی رو سے کسی بھی انسان کو اس دھرتی کے کسی بھی خطے میں بود و باش اختیار کرنے، اس سے رزق حاصل کرنے اور مرنے کے بعد تدفین کے لیے زمین کا حق حاصل ہے۔ اس لحاظ سے یہ ساری دھرتی انسان کا وطن ہے۔ سارا جہان اس کا ہے۔ اور تمام انسان چونکہ آپس میں بھائی بھائی ہیں اس لیے ساری دنیا کے انسانوں سے انسان کی عزیز داری اور رشتے داری ہے۔ اسے نظریۂ پاکستان کے تناظر میں نہیں۔ مغربی سیاسی رجحان (امپیریلزم، نیشنلزم، پیٹریوٹزم) وغیرہ کے تناظر میں دیکھا جانا چاہیے۔ اس کا ایک جواز یہ بھی ہے کہ 'ترانہ ملی' کے بعد ہی علامہ کی متنازع نظم 'وطنیت' (بحیثیت سیاسی تصور کے) ہے۔ اسی فکر سے مربوط 'ضرب کلیم' (یعنی اعلانِ جنگ' دور حاضر کے خلاف) بھی ہے۔ جس کا افتتاحیہ قطعہ ہے:

نہیں مقام کی خوگر طبیعتِ آزاد
ہوائے سیر مثالِ نسیم پیدا کر
ہزار چشمہ ترے سنگِ راہ سے پھوٹے
خودی میں ڈوب کے ضرب کلیم پیدا کر

کلیات اقبال۔ص:388

ظاہر ہے کہ یہ اقبال کے کلیدی تصور خودی یا فلسفہ سخت کوشی سے مربوط ہے۔ ضرب کلیم ہی میں شروع کے چند اوراق کے بعد غزل نما نظم ہے لا اِلٰہ اِلاَّ اللّٰہ یعنی اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ (کلیات اقبال: ص: 397) اور خدا پر یہی غیر متزلزل ایمان ٹیگور کا بھی ہے۔ انھوں نے مہاتما گاندھی کے نام 12 اپریل 1919 کو جو خط لکھا تھا، اس کے اخیر میں نظم کے کچھ بند تحریر کیے تھے۔ نظم دعائیہ ہے جس میں ایک جگہ وہ کہتے ہیں کہ: ''اے بادشاہوں کے بادشاہ (خدا) مجھے اس ایمان کی بدولت اپنا سر اونچا رکھنے دے کہ تو ہی میری پناہ گاہ ہے اور اگر خوف ہے تو اس کا مطلب ہے کہ تجھ پر یقین نہیں۔ اقبال 'لا الٰہ الا اللہ' میں اسی ایمان و یقین اور بے خوفی کی تعلیم دیتے ہیں۔

محولہ شعر 'ضرب کلیم' کی چار اشعار پر مشتمل نظم 'مرگ خودی' سے ماخوذ ہے۔ اس میں جو مشرق مبتلائے جذام ہے اس مشرق میں عرب، عراق، عجم، ہندوستان، چین سب شامل ہیں۔ مجموعی طور پر یہ تاثر ابھرتا ہے کہ مشرق بے عملی میں مبتلا ہے اور سب سے الم ناک پہلو یہ ہے کہ خودی کی موت سے پیر حرم اس قدر مجبور ہے کہ جامۂ احرام تک بیچ کھاتا ہے۔

(17 کلیات اقبال: علامہ اقبال، کتب خانہ حمیدیہ، دہلی، چوتھا ایڈیشن 1987، ص 446
(18) Rabindranath Tagore, A Life Story- Kshitis Roy Publications Divisions New Delhi,2012, p-75.
(19) اقبال نامہ (مکاتیب اقبال) مرتبہ: شیخ عطاء اللہ، کشمیری بازار لاہور ص 462-63
(20) ایضاً، ص 463-64
(21) شعلۂ ندا، اجتبیٰ رضوی، مرتب و ناشر سید حسین احمد ایڈوکیٹ۔ پٹنہ 1954، ص 67

■

Dr. Manzar Aijaz, Head, P.G. Dept. of Urdu, A.N. College, Patna (Bihar)

□ اسامہ شعیب علیگ

ٹیگور اور اقبال کا شخصی و نظریاتی مطالعہ

یورپ میں بیداری کا دور انقلابِ فرانس سے شروع ہوا اور پھر یورپی اقوام نے دنیا میں اپنے قدم جمانے کے لیے 'مختلف بہانوں' سے مشرق کا رخ کیا۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی 'ایسٹ انڈیا کمپنی' کا برّ صغیر میں آنا ہے، جس کے ذریعے انگریزوں نے رفتہ رفتہ پورے اس خطّے پر اپنی حکومت قائم کر دی۔

اس وقت گنگا جمنی تہذیب اپنے عروج پر تھی اور مسلم ہندو دونوں میں بہت حد تک اتحاد و اتفاق ہوا کرتا تھا۔ انگریزوں کو ملک بدر کرنے، وطن کو آزاد کرانے اور ان کے تہذیب و تمدن سے اپنے مذہب، تہذیب و تمدن، عقیدے، اور معاشرے کو بچانے میں دونوں قوم کی شخصیتوں نے بھرپور حصہ لیا۔

اس وقت برصغیر میں دو طرح کے ذہن پائے جاتے تھے۔ ایک وہ جو انگریز اور ان کے افکار و نظریات کو پسند کرتے تھے اور ان ہی کے رنگ میں رنگ جانا چاہتے تھے۔ دوسرے وہ جو انگریز اور ان کے تہذیب و تمدن کو ناپسند کرتے تھے اور اپنے مذہبی افکار و نظریات کو اپنے سینوں میں آباد رکھنا چاہتے تھے۔ انیسویں صدی میں مؤخر الذکر ذہن کے دو خاندانوں میں دو عظیم شخصیتیں پیدا ہوئیں، جن کو بعد میں دنیا نے رابندر ناتھ ٹیگور اور علاّمہ اقبال کے نام سے جانا۔

رابندر ناتھ ٹیگور (1861-1941) کلکتہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کا خاندان فنونِ لطیفہ اور تصوف کا علم بردار تھا۔ آپ کے والد مہارشی دیوندر ناتھ ٹیگور عبادت و ریاضت، زہد و مراقبہ اور مشاہدہ و مطالعہ فطرت جیسی صفات کے حامل تھے۔ ساتھ ہی حافظ شیرازی اور رومی سے بہت زیادہ متاثر تھے۔ اس گھرانے کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی تھی کہ یہ مسلمانوں کے علوم اور تہذیب و تمدن سے پوری طرح واقف تھا۔ ان تمام چیزوں کا اثر رابندر ناتھ ٹیگور نے بھی قبول کیا۔ اسی وجہ سے ان کے نظریۂ حیات میں قبولیت، شکر گزاری اور قدر شناسی پائی جاتی ہے۔ زندگی سے نفرت، جھنجھلاہٹ اور شکوہ شکایات سے آپ ہمیشہ دور رہے اور آپ میں مشرقی اقدار سے محبت، انسانیت سے ہمدردی، مذہب پسندی، جمال پرستی اور تصوف پسندی جیسی خصوصیات پیدا

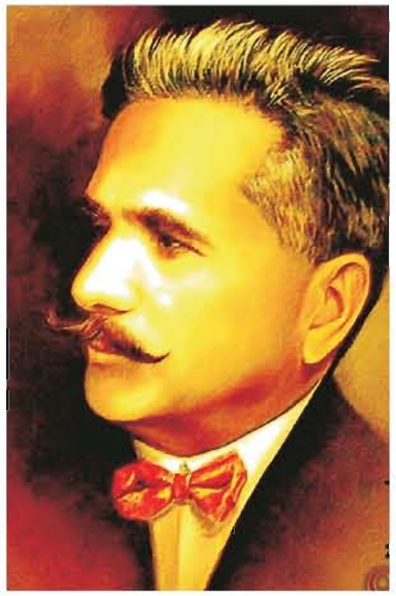

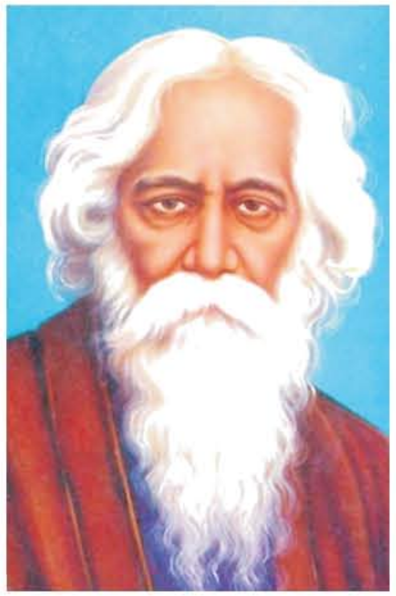

ہوئیں۔ جن کا اثر آپ کی شاعری، ناول، ڈرامے، افسانے، مصوری وغیرہ میں بھی نظر آتا ہے۔

علاّمہ اقبال (1877-1938) سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد صوفی منش بزرگ انسان تھے۔ ان میں مذہبیت اور دین داری کا غلبہ تھا، چنانچہ آپ کی تعلیم و پرورش خالص صوفیانہ مذہبی اور اخلاقی اصولوں پر ہوئی۔ آپ کی والدہ محترمہ بھی دین دار اور عبادت گزار خاتون تھیں، اس لیے انھوں نے بھی ان کی مذہبی اور اخلاقی تربیت میں نمایاں حصہ لیا۔ آپ کے گھر میں شدّت پسندی اور تنگ نظری نہ تھی۔ ان تمام چیزوں کا اثر علاّمہ اقبال پر بھی پڑا، چنانچہ آپ کی شاعری میں اس کے اثرات ہمیں واضح طور سے نظر آتے ہیں۔

آپ کشمیری پنڈتوں کے قدیم خاندان سے تعلق رکھتے تھے، جس کی ایک شاخ اب تک کشمیر میں موجود ہے، آپ کے جدِّ اعلیٰ ایک ولی کے ساتھ حسنِ عقیدت ہو جانے کی وجہ سے مشرف بہ اسلام ہوئے۔ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اقبال نے فرمایا:

میں اصل کا خاص سومناتی
آبا مرے لاتی و مناتی

مرا بنگر کہ در ہندوستاں دیگر نمی بینی
برہمن زادہ و رمز آشنائے روم و تبریز است

یہ ایک عجیب اتفاق ہے کہ ٹیگور اور اقبال دونوں کا تعلق مذہبی گھرانے سے ہوتا ہے اور دونوں کی پرورش مذہبی طرز پر ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دونوں کا رجحان اپنے اپنے مذہب کی طرف ہے۔ لیکن دونوں میں بنیادی فرق یہ ہے کہ ٹیگور کے یہاں سارے مذاہب کی سچائی قبول کر لی جاتی ہے اور سب کو یکساں طور پر دیکھا جاتا ہے۔ جب کہ علاّمہ اقبال کے گھر میں اسلام اور اس کی تعلیمات ہی کو اولیت حاصل ہے۔ چنانچہ دونوں کی شاعری میں اس بنیادی فرق کا اثر واضح طور سے نظر آتا ہے۔

ٹیگور کی شاعری کے مطالعے سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ وہ 'وحدۃ الوجود' کے قائل تھے۔ آپ شام (سندھیا) کے گیت میں کہتے ہیں:

وہ خدا جو آگ میں ہے، جو پانی میں ہے
اور جو تمام دنیا پر چھایا ہوا ہے
میں اسی خدا کو پیہم سجدے کرتا ہوں۔۔۔

علامہ اقبال توحید کو قرآن کریم کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ آپ

فرماتے ہیں کہ:

"قرآن سے پہلے کسی ارضی یا سماوی کتاب نے انسان کو اس بلند مقام پر نہیں پہنچایا جس کی قرآن نے اطلاع دی، یہ لفظ 'سخر لکم مافی السموٰات والارض' تم قرآن کے سوا کہیں نہیں دیکھوگے۔ آج تک تم جن ارضی و سماوی مہیب یا مفید ہستیوں کو اپنا معبود سمجھتے رہے، ہو وہ سب اور تمام دیگر کائنات تمھاری خدمت کے لیے خلق کی گئی ہیں، توحید کا یہ مرتبہ اعلیٰ ماسوا سے بے پروا کردینے والا یہ انسانی خودی کا حقیقی عرفان قرآن سے پہلے کہیں نظر نہیں آتا۔" (البیان اقبال نمبر، دسمبر 1939، ص 23)۔

تعلیم

روایت کے برخلاف رابندر ناتھ ٹیگور کی تعلیم اسکولوں میں نہ ہوسکی، جب کہ ان کے خاندان کے دیگر بچے اسکول جاتے تھے۔ آپ مطالعۂ فطرت کی طرف متوجہ ہوگئے۔ گھنٹوں ان میں کھوئے رہتے۔ اسی سے آپ کو نغمہ، رقص، موسیقی اور مصوری وغیرہ سے دلچسپی پیدا ہوئی جس کا اثر آپ کی شاعری پر بھی ہوا۔

رابندر ناتھ ٹیگور کے برخلاف علاّمہ اقبال کی تعلیم روایتی طریقے سے ہوئی۔ آپ نے ہائی اسکول، انٹر کے بعد بی اے، ایم اے کیا اور پھر ایرانی الٰہیات پر مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔

اس طرح سے ہم دیکھتے ہیں گو کہ ٹیگور اور اقبال کی طرزِ تعلیم الگ الگ منہج پر ہوئی، لیکن بعد میں دونوں کے نظریۂ تعلیم میں کچھ نہ کچھ مماثلت ضرور پائی جاتی ہے۔

ٹیگور نے تعلیم کا مقصد طلبا کی فطری ذہنی نشوونما قرار دیا ہے اور بتایا کہ ذہنی ہم آہنگی سے طلبہ میں تعلیم حاصل کرنے کا رجحان پیدا ہوتا ہے۔ اسی نظریے کو دوسرے لفظوں میں جان ایڈمس نے پیش کیا ہے:

"فطری نظام تعلیم ایک ایسا نظام ہے جو مدرسوں اور کتابوں پر منحصر نہیں ہوتا بلکہ طالب علم کی خود اپنی زندگی پر مبنی ہوتا ہے۔ اس کا مقصد ایسے حالات پیدا کرنا ہوتا ہے جس سے بچے کی فطری نشوونما ہوسکے"۔

ٹیگور نے اپنے ان خیالات کے مطابق بچوں کو تعلیم دینے کے لیے 22 دسمبر 1901 میں 'شانتی نکیتن' کی بنیاد رکھی۔ اس ادارے کا اولین مقصد تعلیم کو زندگی کا ایسا جز بنانا تھا کہ اس کو کبھی علٰیحدہ نہ کیا جاسکے۔ آپ نے اس میں مختلف طرح کے کام، جسمانی نشوونما، کھیل کود، حفظانِ صحت، سیکولرزم اور تہذیبی اقدار کی حفاظت پر خصوصی توجہ دی۔ آپ موجودہ طرز تعلیم کے خلاف تھے اور اسے تعلیمی ترقی میں رکاوٹ سمجھتے تھے۔

علامہ اقبال بھی موجودہ تعلیمی نظریات وافکار سے متفق نہیں تھے۔ آپ نے فرمایا کہ اگر چہ مغربی تعلیم نے مختلف طرح کی ایجادات واختراعات سے انسانیت کو فائدہ پہنچایا، لیکن اسی تعلیم نے انسانوں کے اندر سے خدا کا تصور، مذہب، اخلاق اور بلند کردار کا خاتمہ بھی کردیا۔ آپ نے اس کو اپنے مخصوص انداز میں کچھ اس طرح سے کہا:

خوش تو ہم بھی ہیں جوانوں کی ترقی سے مگر
لب خنداں سے نکل جاتی ہے فریاد بھی ساتھ
ہم سمجھتے تھے کہ لائے گی فراغت تعلیم
کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ
گھر میں پرویز کے شیریں تو ہوئی جلوہ فگن
لے کے آئے ہے مگر تیشۂ فرہاد بھی ساتھ

علامہ اقبال نے یورپ میں تعلیم کی غرض سے کئی سال گزارے تھے۔ آپ مغربی تعلیم کے زہریلے پن سے بخوبی واقف تھے۔

رابندر ناتھ ٹیگور کے برخلاف علاّمہ اقبال کی تعلیم روایتی طریقے سے ہوئی۔ آپ نے ہائی اسکول، انٹر کے بعد بی اے، ایم اے کیا اور پھر ایرانی الٰہیات پر مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔
اس طرح سے ہم دیکھتے ہیں گو کہ ٹیگور اور اقبال کی طرزِ تعلیم الگ الگ منہج پر ہوئی، لیکن بعد میں دونوں کے نظریۂ تعلیم میں کچھ نہ کچھ مماثلت ضرور پائی جاتی ہے۔

چنانچہ آپ اس سے قوم کو آگاہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

لیکن نگاہ نکتہ میں دیکھے زبوں حالی مری
رفتم کہ خاراز پاکشم محمل نہاں شداز نظر
یک لحظہ غافل گشتم وصد سالہ راہم دور شد

فطرت کا تصور

رابندر ناتھ ٹیگور کو فطرت کے مناظر سے دلچسپی شروع سے ہی تھی اور قدرتی ماحول، زمین و آسمان، موسموں اور نباتاتی زندگی سے براہ راست تعلق اور بود و باش کی سادگی نے آپ کو بہت زیادہ متاثر کیا تھا۔ آپ نے اس کا اعتراف ان الفاظ میں کیا:

"میں روزانہ کھڑکی کے سامنے بیٹھتا اور بیرونی دنیا کے حالات ومناظر کا تصور کرتا رہتا۔ مجھے یاد ہے کہ بچپن ہی سے میں مطالعۂ قدرت کا عاشق تھا۔ جب آسمان پر بادلوں کو ایک ایک کر کے آتے دیکھتا تو فرطِ مسرت سے از خودرفتگی کی کیفیت پیدا ہوجاتی۔ اس ابتدائی عمر میں بھی مجھے محسوس ہوتا تھا کہ ایک نہایت گہرا اور بے تکلف دوست مجھے محصور کیے ہوئے ہے۔ اگر چہ اس وقت مجھے اتنا شعور نہ تھا کہ اس کا کوئی نام ونشان بتا سکتا۔ مجھے نیچر سے اتنی محبت تھی کہ الفاظ میں اس کا اظہار ممکن نہیں، نیچر ایک قسم کی رفیق تھی جو ہر وقت میرے ساتھ رہتی تھی اور ہمیشہ نیا حسن میرے سامنے پیش کرتی رہتی تھی۔"

رابندر ناتھ ٹیگور: فکروفن، خالد محمود وشہزاد انجم، ص 69

فطرت سے عشق آپ کو اپنے والد سے وراثت میں ملا تھا۔ سب سے پہلے آپ نے اوائل عمر میں اپنے والد کی رہ نمائی میں ہمالیہ کا سفر کیا اور وہاں قدرت کا شاہ کار حسن دیکھا، جس کا جادو آپ پر تاحیات قائم رہا اور مناظر قدرت سے عشق آپ کی طبیعتِ ثانیہ بن گئی۔

مذکورہ بالا تمام صفات کا اثر آپ کی شاعری پر بھی ہوا۔ چنانچہ آپ کی شاعری میں لہلہاتے کھیتوں، اڑتے، چہچہاتے پرندوں، مٹی سے پھیلنے والی خوشبوؤں، بادلوں، پھولوں اور ہر پل بدلتے موسموں، پہاڑوں، دریاؤں، سمندروں کا ذکر جگہ جگہ ملتا ہے مثلاً:

صبح دم خامشی کا سمندر تھا بھوکا
کہ جیسے ہو چڑیا کے گیتوں کی لہریں
کھلے پھول جورہ گزر کے کنارے پہ تھے
کتنے سرشار تھے
بادلوں کے جھروکوں سے گر گر کے
سونے کی دولت تھی بکھری ہوئی
پھر بھی ہم اتنے مصروف تھے
ان نظاروں کو پل بھر بھی دیکھا نہیں
راہ پر اپنی چلتے رہے

علامہ اقبال کو بھی مناظرِ فطرت سے دلچسپی تھی۔ جس کا ثبوت آپ کی چند مشہور نظمیں 'ہمالیہ، جگنو، رات، شبنم، ستارے، قمر، زہرہ، مشتری، کلی اور پھول' وغیرہ ہیں، جس میں آپ نے فطرت کے حسن کو احسن طریقے سے شاعری کی زبان میں پیش کیا ہے۔

لیکن یہاں ہمیں ٹیگور اور اقبال میں ایک فرق نظر آتا ہے کہ ٹیگور نے فطرت کے حسن اور خوبصورتی کو سکونِ قلب اور لطف اندوزی کے لیے بیان کیا ہے، جب کہ علامہ اقبال نے اپنے اشعار میں قدرت کے حسن اور مناظر سے انسان کو تحریک، نصیحت اور عبرت حاصل کرنے پر اُبھارا ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

کھول آنکھ، زمیں دیکھ، فلک دیکھ، فضا دیکھ
مشرق سے ابھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ

اس جلوۂ بے پردہ کو پردوں میں چھپا دیکھ
ایام جدائی کے ستم دیکھ، جفا دیکھ
بے تاب نہ ہو معرکۂ بیم و رجا دیکھ
ہیں تیرے تصرف میں یہ بادل یہ گھٹائیں
یہ گنبد افلاک یہ خاموش فضائیں
یہ کوہ یہ صحرا یہ سمندر یہ ہوائیں
تھیں پیش نظر کل تو فرشتوں کی ادائیں
آئینہ ایام میں آج اپنی ادا دیکھ

ایک اور جگہ آپ فرماتے ہیں:

نہ اٹھا جذبۂ خورشید اک برگ گل تک بھی
یہ رفعت کی تمنا ہے کہ لے اڑتی ہے شبنم کو

حب الوطنی اور قومیت کا تصور

برصغیر میں شروع ہی سے ذات پات اور چھوت چھات کا نظام موجود تھا۔ نچلی ذات کے لوگوں کو کم تر اور حقیر سمجھا جاتا تھا۔ سماج میں عدم مساوات پائی جاتی تھی۔ رابندر ناتھ ٹیگور اس کے سخت مخالف تھے۔ آپ معاشرے میں برابری کے قائل تھے اور قومیت یا علاقائیت کی بنیاد پر کی جانے والی تفریق کی سخت مذمت کرتے تھے۔

آپ کے نزدیک قومیت کا تصور یہی تھا کہ تمام انسان بغیر کسی بھید بھاؤ کے آپس میں مل جل کر بحیثیت ایک قوم کے امن وسکون کے ساتھ رہیں۔

رابندر ناتھ ٹیگور مغرب ومشرق میں امن کا پیام لے کر گھومے اور اپنے اس مخصوص قومی نظریہ کو فروغ دینے کے لیے ہندو، مسلم، سکھ اور عیسائی سب سے درخواست کی۔ اپنے اشعار سے بھی اس پیغام کو عام کرنے کی کوشش کی۔ آپ کی نظم 'زیارت گاہ ہند' اس کی واضح مثال ہے:

ہند کی عظیم امڈتی ہوئی آبادی کی شکل میں سمندر کے ساحل پر
کوئی نہیں جانتا کس کی پکار اتنے آدمیوں کی دھارا
کہاں سے ایک سرچشمہ بن کر پھوٹ پڑی
اور بھارت ساگر میں کھوگئی
یہاں آریہ، غیر آریہ، یہاں دراوڑ اور چینی۔
شک، ھون، دل پٹھان اور مغل ایک جسم میں سما گئے
آؤ اے آریئے، آؤ اے ان آریئے، ہندو اور مسلمان
آؤ آؤ آج تم اے اہلِ فرنگ، آؤ آؤ اے عیسائی
آؤ اے برہمن پاکیزگیِ قلب کے ساتھ، سب کا ہاتھ پکڑو
آؤ اے پست اقوام کے لوگو! دور کرو اپنی توہین کا بوجھ

علامہ اقبال کے اندر بھی قوم اور وطن سے محبت کا جذبہ موجود تھا بلکہ شروع میں یہ کچھ زیادہ ہی تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے اپنی وطنی قومی نظموں کی بنیاد فخر و دعویٰ پر رکھی۔ ایک ایسا فخر اور دعویٰ جو عوام الناس میں جوش بھر دے۔ جب کہ آپ سے پہلے قومی اور وطنی نظموں میں قوم کی منفی حالت کی عکاسی کی جاتی تھی، جس سے لوگوں میں مایوسی اور اضمحلالی کیفیت پیدا ہوتی تھی۔ آپ وطن کی محبت سے سرشار ہوکر فرماتے ہیں:

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا
پربت وہ سب سے اونچا ہمسایہ آسماں کا
وہ سنتری ہمارا وہ پاسباں ہمارا
گودی میں کھیلتی ہیں اس کی ہزاروں ندیاں
گلشن ہے جن کے دم سے رشک جناں ہمارا
یونان و مصر و روما سب مٹ گئے جہاں سے
اب تک مگر ہے باقی نام و نشاں ہمارا

بات اگر اقبال کے قومیت کے نظریہ سے متعلق کی جائے تو رابندر ناتھ ٹیگور کی طرح آپ نے بھی اس کی بنیاد مادّیت

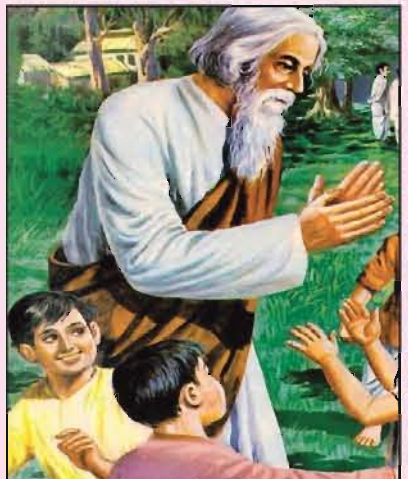

کے بجائے روحانیت پر رکھی اور نسلی وملی امتیازات کو ختم کردینا چاہا۔ اخوت و بھائی چارگی کی ایسی مثال پیش کرنی چاہی جو مہاجرینِ مکہ اور انصارِ مدینہ نے پیش کی تھی کہ اتحاد واتفاق کی فضا ہو، آقا وغلام کی تمیز ختم ہوجائے، کیوں کہ اسی سے فساد پھیلتا ہے اور یک رنگی و یک جہتی کی ایسی فضا ہو جس میں ہر فرد اور ہر جماعت اپنے دل ودماغ سے آزادی سے کام لے اور ترقی کرسکے ساتھ ہی دنیا میں امن وسکون بھی قائم ہو۔

سیاسی نظریہ

رابندر ناتھ ٹیگور کا اصل میدان شعر وشاعری، فلسفہ، معاشرے کی اصلاح، ناول، ڈرامے، موسیقی اور مصوری وغیرہ تھا ان سبھی شعبوں میں آپ نے اپنے جوہر دکھائے، لیکن سیاست کے میدان میں بھی آپ نے اپنے طبعی میلان کی مناسبت سے حصہ لیا۔

اگر چہ آپ نے باقاعدہ کبھی سیاست میں حصہ نہیں لیا اور نہ ہی کسی سیاسی تحریک میں شریک ہوئے۔ البتہ جن نظریات سے آپ کو اتفاق رہا، اس کی آپ نے نثر اور نظم دونوں کے ذریعے تائید کی۔ سیاست میں جن چیزوں سے آپ کو اتفاق نہ تھا اس کو آپ نے نہ صرف ٹھکرادیا بلکہ اس کے خلاف عملی قدم بھی اُٹھایا۔

'جلیاں والا باغ' میں نہتے عوام کو جس طرح سے انگریزوں نے گولیوں کا نشانہ بنایا اس سے دکھی ہوکر آپ نے 'نائٹ' کا خطاب انگریز حکومت کو واپس کردیا۔ اس کے علاوہ جب اہلِ پنجاب پر ظلم ہوئے تو اس کی تلافی کے لیے وائسرائے ہند سے اپیل کی اور انھیں خط لکھا۔

اسی طرح آپ نے گاندھی جی سے بھی چند نظریات پر نااتفاقی ظاہر کی، چاہے وہ ہندو مسلم اتحاد میں رکاوٹیں ڈالنے کا مسئلہ ہو یا بنگال کی تقسیم کا یا فرقہ واریت کا مسئلہ ہو۔ آپ نے آخری وقت تک فرقہ وارانہ منافرت اور تشدد کو ختم کرنے کے لیے قومی وعملی دونوں جدوجہد جاری رکھی۔

رابندر ناتھ ٹیگور ایک ایسا سیاسی نظام چاہتے تھے جس کی بنیاد روحانیت پر ہو نہ کہ مادّیت پر۔ اسی وجہ سے آپ نے مغرب کے مختلف سیاسی نظریوں کو ٹھکرادیا۔ کیونکہ اس میں بعض طبقوں کا استحصال ہوتا ہے۔ ایک جگہ آپ نے فرمایا:

"تمھیں معلوم ہے کہ میں مغربی تہذیب کا قائل نہیں ہوں، جیسا کہ میں اس کا قائل نہیں کہ انسان کی عظیم ترین قوت صرف جسمانی قوت ہے۔ ساتھ ہی ساتھ میں اس کا بھی قائل نہیں ہوں کہ جسمانی قوت کو ڈھایا جائے اور مادی ضرورتوں سے منہ موڑا جائے۔ حقیقت میں جس چیز کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ روح اور مادہ میں توازن اور ہم آہنگی پیدا کی جائے۔ یہ توازن بالکل بنیاد اور ڈھانچے کا توازن ہے۔"

ٹیگور کی دلی خواہش تھی کہ فاشزم کو شکست ہو۔ آپ نے بچوں کی نظموں میں فاشزم کی سخت مخالفت کی، اس کا مذاق اڑایا اور ہٹلر مسولینی کی کارٹون تصاویر بنائیں۔ اس کے مقابلے میں آپ نے عالم گیر انسانیت اور روحانی ہم آہنگی پر زور دیا اور اس کو اپنی شاعری میں جگہ جگہ موضوع بنایا:

جہاں ذہن بے خوف ہو/ اور جہاں فخر سے سر اٹھا ہی رہے
جہاں علم آزاد ہو/ جہاں تنگ دیواروں سے
چھوٹے چھوٹے سے خانوں میں/ دنیا نہ تقسیم ہو
جہاں لفظ ہونٹوں پہ آئیں/ صداقت کی گہرائیوں سے
جہاں بے تھکن جانفشانی بھی/ بانہوں کو پھیلائے
بڑھتی کمالِ ہنر کی طرف ہو

گیتا نجلی، مترجم سہیل احمد فاروقی، ص 91

علامہ اقبال کو بھی سیاست سے براہ راست دلچسپی نہ تھی مگر آپ بالواسطہ دلچسپی اس میں ضرور لیتے تھے۔ آپ بھی ایک ایسا سیاسی نظام چاہتے تھے جس سے مختلف قومیت کے تصور

کا خاتمہ ہو جائے اور ایک 'عالم گیر انسانیت' وجود میں آئے، جس کی بنیاد روحانیت پر ہو نہ کہ مادیت پر۔ اسی لیے آپ مغربی جمہوری طرزِ نظام کے خلاف تھے۔ ایک جگہ آپ فرماتے ہیں:

آبتاؤں تجھ کو رمز آیہ ان الملوک
سلطنت اقوام غالب کی ہے اک جادوگری
ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام
جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری

آپ جمہوری اصول کی سخت مخالف نظر آتے ہیں۔ چنانچہ آپ فرماتے ہیں:

متاعِ معنیٔ بیگانہ ازدوں فطرتاں جوئی
زموراں شوخیِ طبع سلیمانی نمی آمد
گریز از طرز جمہوری غلام پختہ کارے شو
کہ از مغز دوصد خر فکر انسانی نمی آمد
اس راز کو اک مرد فرنگی نے کیا فاش
ہر چند کہ دانا اسے کھو لا نہیں کرتے
جمہوریت اک طرز حکومت ہے کہ جس میں
بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے

یعنی اس طرزِ حکومت میں قابلیت نہیں دیکھی جاتی ہے، بلکہ ووٹوں کی کثرتِ تعداد سے ایک شخص کو منتخب کر لیا جاتا ہے، لیکن یہ ضروری نہیں کہ جو زیادہ ووٹ پائے وہ باصلاحیت بھی ہو۔

اس طرح سے ہم دیکھتے ہیں کہ ٹیگور اور اقبال کے سیاسی نظریے کے بعض حصے ایک دوسرے سے بڑی مطابقت رکھتے ہیں۔ دونوں ہی ایک ایسا نظام چاہتے ہیں جس میں روحانیت و مادیت میں توازن ہو اور قومیت و وطنیت کے تصور سے بلند ہو کر ایک عالم گیر انسانیت ہو، جس میں کسی کا بھی استحصال نہ ہو سکے۔ دونوں نے ہی مغربی نظام حکومت جمہوریت کو نقصان دہ بتایا اور روس کے سوشلسٹ انقلاب کا استقبال کیا۔

لیکن ٹیگور اور اقبال کے سیاسی نظریے میں ایک فرق نظر آتا ہے، وہ یہ کہ ٹیگور کے نزدیک انسان کے فرائض تسخیرِ فطرت تک محدود ہیں اور انسانیت سے ہمدردی و اخوت ہی کُل ہے، لیکن علامہ اقبال اس سے بھی آگے بڑھ کر انسانی زندگی کا ایک مقصد بتاتے ہیں جس کی وجہ سے وہ سیاست میں دین کو بھی شامل کرتے ہیں، جس سے بیگانگی کی تعلیم سب سے پہلے میکیاولی نے دی۔ اس لیے آپ اس کو ابلیس کا بھیجا ہوا پیغمبر کہتے ہیں۔

آپ کے نزدیک زندگی کا وہ مقصد 'آخرت کا حصول' ہے۔ اس لیے آپ چاہتے ہیں کہ سیاست کا نظام مذہب اور اخلاق کی بنیاد پر ہو ورنہ سارے نظام قدیم ملوکیت کی شکل اختیار کر لیں گے۔ آپ فرماتے ہیں:

زمام کار اگر مزدور کے ہاتھوں میں ہو پھر کیا
طریق کوہکن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی
جلال بادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو
جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

فلسفہ

رابندر ناتھ ٹیگور برصغیر پر قابض انگریزوں کے عہد میں پلے بڑھے تھے۔ آپ نے دیکھا کہ مغربی تہذیب و تمدن ہندوستانیوں کے دل و دماغ پر قبضہ جماتی جا رہی ہے اور لوگ اس کے فلسفہ حیات کو تیزی سے اختیار کرتے جا رہے ہیں تو آپ نے اس سیلاب کو روکنے کی کوشش قدیم ہندوستانی روایات اور تہذیب و تمدن سے کی۔ آپ نے قدیم وجدید اور مشرق و مغرب کے سنگم سے ایک نیا فلسفہ 'انسانیت

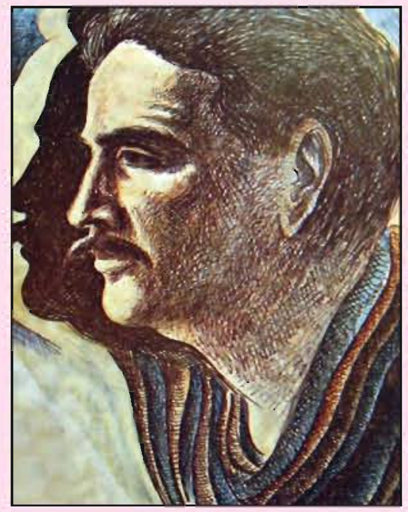

شناسی' اور 'فطرت شناسی' کی شکل میں پیش کیا اور اس کی بنیاد اپنے ذاتی روحانی تجربے پر رکھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ آپ نے جس ماحول میں پرورش پائی اس میں وید، اپنیشد، گوتم بدھ کی تعلیمات، مغربی و اسلامی قدریں اور حافظ و رومی کے افکار و نظریات شامل تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ٹیگور کے فلسفیانہ خیالات میں 'ست' (اصل وجود) اور 'ایشور' دونوں ایک ہیں۔ آپ نے خدا یا ایشور میں انسانی خوبیاں تلاش کی ہیں اور کہا کہ ایشور انسان کی آخری اور بلندترین منزل ہے۔ بعض نے آپ کے اس فلسفے کو 'ٹھوس وحدت الوجود' کا نام دیا۔ یہ اس لیے بھی کہ آپ 'ادویت واد' پر یقین رکھتے تھے اور اسی ایک خدا کو مانتے تھے جو کائنات کے ذرّے ذرّے میں ہے:

وہ خدا جو آگ میں ہے، جو پانی میں ہے
اور جو تمام دنیا پر چھایا ہوا ہے
میں اسی خدا کو پیہم سجدے کرتا ہوں

ادویت واد کی ساری صفات کو بھی آپ نے تسلیم کیا اور اس کا اظہار صبح کے گیت میں کیا ہے:

تو ہمارا مالک ہے ہمیں توفیق عطا کر کہ ہم تجھے اپنا سمجھیں، ہمیں ہمت و استطاعت دے
کہ ہم تیرے سامنے سر سجود جھکا دیں

اے مالک! اے خدا ہمارے تمام گناہ معاف کر اور تمام نیکیاں بخش کہ ہم اسے سجدہ کرتے ہیں جس میں مسرت ہے۔

آپ کے فلسفوں میں موت اور زندگی کا فلسفہ بھی ہے۔ اس میں آپ موت کے ذریعے زندگی کے خاتمے کو تو مانتے ہیں لیکن وجود کے خاتمے کو تسلیم نہیں کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے آپ موت کا خوش دلی سے استقبال کرتے ہیں آپ کہتے ہیں کہ:

"موت زندگی کا زریں تاج ہے۔ مکمل زندگی کے لیے ایک خوش گوار اقدام۔ حیات جاودانی کا راستہ۔ موت حیاتِ ابدی اور حیاتِ دنیوی کے درمیان کی ایک منزل ہے"۔

ایک جگہ آپ کہتے ہیں کہ:

اے موت! میری زندگی کا انتہائی کمال- آ
اور میرے ساتھ سرگوشیاں کر
میں ہر وقت تیرا انتظار کر رہا ہوں

تیرے ہی لیے میں نے زندگی کی خوشیوں، سخت غموں کو برداشت کیا ہے۔

ٹیگور کا ایک فلسفہ ترکِ رہبانیت بھی تھا۔ جس کے مطابق "انسان کا اعلیٰ مقصد، شخصیت کی تکمیل ہے۔" اور اس کے لیے ضروری ہے کہ انسان اس دنیا میں عمل پیہم کرے، نہ کہ وہ کسی جنگل کی راہ پکڑ لے یا مراقبہ نشین ہو جائے۔ آپ کا خیال تھا کہ انسان میں تخلیقی صلاحیت اور عملی قوت بہت زیادہ ہے جس کے ذریعے وہ اپنی دنیا آپ تیار کر سکتا ہے۔ آپ کے فلسفے میں روح اور جسم کا بھی ذکر ہے اور اس میں دونوں ہمیشہ ساتھ ساتھ نظر آتے ہیں اور ان تمام فلسفوں کا آخری پڑاؤ 'مذہبِ انسانیت' پر ہوتا ہے۔

علامہ اقبال اسلامی فلسفے سے پوری طرح واقف تھے اور ساتھ ہی آپ نے مغربی فلسفے کو بھی اس کی خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ پڑھ رکھا تھا لیکن اقبال نے اپنے فلسفے کا سلسلہ مغرب سے نہیں بلکہ ہمیشہ اسلامی مشرق سے وابستہ کیا۔ آپ اگرچہ روشن خیال تھے، لیکن آپ کا رجحان زیادہ تر قدیم مسلک کی طرف ہے چنانچہ آپ خود لکھتے ہیں:

"میرے نزدیک اقوام کی زندگی میں قدیم ایک ایسا ہی ضروری عنصر ہے جیسا کہ جدید، بلکہ میرا ذاتی میلان قدیم کی طرف ہے۔" اقبال نامہ، ص 148

اقبال کا فلسفہ دراصل اسلامی فلسفہ اخلاق کے بنیادی

اصول 'تخلّقوا باخلاق اللّٰہ' کی تفسیر ہے۔ چنانچہ آپ کے فلسفے کی بنیاد 'خودی' ہے جس میں وہ انسانیت کی فلاح مضمر سمجھتے تھے۔ اس سے مراد آپ کی یہ تھی کہ انسان اپنی ذات کو سمجھنے کی کوشش کرے کہ خودی کے ذریعے خدا تک پہنچنا ممکن ہے۔ انسان خدائی ذات کا پرتو ہے یا یہ کہ خدا انسان کی ذات میں جلوہ گر ہے۔ پس اگر انسان اپنی حقیقت کو جان لے تو وہ اس خدا کو کما حقہ پہچان سکتا ہے جس کے جمال کا جلوہ خود انسان کی ہستی ہے۔ اس کی وضاحت میں آپ نے بتایا کہ انسان کی خلقت کا مقصد یہی ہے کہ وہ اپنی خودی کو مستحکم کرے اور اس کے ذریعے عالم فطرت کو تسخیر کرے۔ ایک جگہ آپ فرماتے ہیں:

ہر چیز ہے محو خودنمائی / ہر ذرہ شہید کبریائی
بے ذوق نمود زندگی موت / تعمیر خودی میں ہے خدائی

آپ کے نزدیک فلسفہ خودی کا ایک جز بقائے دوام اور حیاتِ جاودانی بھی ہے۔ یعنی زندگی زمانے کے حادثے کے ساتھ جنگ کرنے کا نام ہے، جس میں زندگی کو کبھی شکست نہیں ہوتی اور یہ کہ زندگی مسلسل جدوجہد، حرکت اور تگ ودَو کا نام ہے۔ آپ نے یہ بھی بتایا کہ قناعت اور رہبانیت کو چھوڑ کر اس دنیا میں جدوجہد کرنے کی ضرورت ہے کیوں کہ خودی کی تربیت اسی طرح سے ہو سکتی ہے:

بدر یا غلط و باموجش در آویز
حیاتِ جاوداں اندر ستیزاست

اقبال کا ایک فلسفہ 'انسانیت کی خودی' بھی ہے۔ جس میں آپ نے رنگ و نسل قبائل و اقوام کو ختم کر کے انسانیت کا ایک جامع، بلند و ہمہ گیر مقصد دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔ آپ کو مغرب کے فلسفوں اور تہذیب و تمدن سے کوئی امید نہیں ہے کیوں کہ اس کی بنیاد حرص و لالچ، مکر و فن اور قوت و مادیت پر مبنی ہے نہ کہ روحانیت پر۔

آپ کے فلسفے کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان اپنی محنت اور اصلاحی کوششوں سے اطاعت، ضبط نفس اور نیابت الٰہی کی منزلیں طے کرتا ہوا خودی کی انتہائی بلندی پر پہنچے اور اپنی روحانی اور مادی ترقیوں کو ملت کے لیے وقف رکھے۔

اقبال بھی ٹیگور کی طرح یورپی فلسفے اور ان کی تہذیب سے غیر مطمئن نظر آتے ہیں، لیکن وہ اس کی علمی ترقیوں کو کافی حد تک پسند کرتے ہیں کیوں کہ ان کو آگے چل کر بقائے انسانی کا ضامن بنایا جا سکتا ہے۔ آپ کو یورپ پر اعتراض یہ ہے کہ اس نے مادیت کو کُل سمجھ لیا ہے۔ اس لیے آپ نے فلسفہ بے خودی کی بنیاد روحانیت پر رکھ کر اس کو یورپ کی جمہوریت، اشتراکیت، فسطائیت اور قومی اشتراک جیسے فلسفوں سے علیحدہ کر دیا ہے۔

اس طرح سے ہم دیکھتے ہیں کہ ٹیگور اور اقبال کے فلسفے میں بعض چیزوں کی مماثلت کچھ نہ کچھ حد تک ضرور پائی جاتی ہے۔ دونوں مغرب کے فلسفے کو مضر بتاتے ہیں اور اس کی وجہ 'مادیت' کو بتاتے ہیں۔ دونوں نے اپنے فلسفوں کی بنیاد روحانیت پر رکھی۔ دونوں رہبانیت اور ترکِ دنیا کے مخالف ہیں۔ دونوں زندگی میں جدوجہد اور عمل کو ضروری قرار دیتے ہیں۔ دونوں مرنے کے بعد روح کے باقی رہنے کو تسلیم کرتے ہیں۔ فرق بس اتنا ہے کہ علامہ اقبال نے فلسفہ کی بنیاد قرآن اور اسلام کو بنایا ہے جبکہ ٹیگور نے فلسفے کی بنیاد مذہبِ انسانیت کو بتایا ہے۔

صنف نازک

زمانہ قدیم سے ہی عورت مظلوم رہی۔ ہر دور میں دنیا کی مہذب قوموں نے بھی اس کے ساتھ ناروا سلوک رکھا اور اس

علامہ اقبال اسلامی فلسفے سے پوری طرح واقف تھے اور ساتھ ہی آپ نے مغربی فلسفے کو بھی اس کی خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ پڑھ رکھا تھا لیکن اقبال نے اپنے فلسفے کا سلسلہ مغرب سے نہیں بلکہ ہمیشہ اسلامی مشرق سے وابستہ کیا۔ آپ اگر چہ روشن خیال تھے، لیکن آپ کا رجحان زیادہ تر قدیم مسلک کی طرف ہے

کے حقوق کو پامال کیا۔ لیکن رابندر ناتھ ٹیگور نے عورت ذات کی قدر کی۔ آپ کے نظریے میں ان کے تعلق سے تنگ نظری نہیں ہے، آپ نے اپنی شاعری میں ان کے مختلف کردار پیش کیے ہیں اور ان پر ہونے والے ظلم و ستم کے خلاف آواز بلند کی ہے۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی رہی ہو کہ آپ حسن پرست تھے اور ہر چیز میں خالق کا عکس تلاش کرتے تھے۔

آپ نے اپنی شاعری میں عورت کے مختلف کردار کو دکھایا ہے اور ان کی مشکلات و پریشانی کی ترجمانی کی ہے۔ مثلاً 'نظم بہو' میں ایک ایسی دیہاتی لڑکی کے احساسات پیش کیے ہیں جس کو شہر راس نہیں آتا۔ اسی طرح آپ نے 'نجات' نظم کے ذریعے کم عمر لڑکیوں کی شادی کے خلاف آواز بلند کی ہے:

اس گرہستی میں آئی تھی جب میں نو سال کی لڑکی تھی
اس کے بعد اس پریوار کی لمبی گلی کو پار کرتی
گھر بھر کی خواہش کے بوجھ سے لدے ہوئے اس جیون کو
کھینچتی ہوئی آخر میں
آج میں آ پہنچی راہ کی سرحد پر
سکھ دکھ کی بات
کچھ سوچوں اتنا سمے کہاں تھا؟
پر جیون اچھا یا برا جیسا بھی ہے۔۔۔

ٹیگور نے شاعری کے علاوہ اپنی نظموں اور کہانیوں میں بھی عورتوں کے حقوق کے لیے آواز بلند کی اور عورت کو ماں، بہن، بیوی اور معشوقہ کے روپ میں پیش کیا۔ بعض جگہ پر آپ نے عورت کو سیاسی رکن کی طرح بھی پیش کیا جو مردوں کی طرح اپنی ذمے داری نبھاتی ہے۔

علامہ اقبال نے بھی اپنی شاعری کے ذریعے عورتوں کو ان کے پورے حقوق دینے کی بات بلند کی اور ان کو ثریا سے اونچا مقام دیا۔ لیکن آپ نے عورت کی عصمت و عفت کو سب سے زیادہ اہمیت دی ہے اور موجودہ دور میں آزادیٔ نسواں کی تحریک، عورتوں کو جس راہ پر لے جانا چاہتی ہے کہ عورت کو مادرانہ فرائض انجام دینے کی ضرورت نہیں ہے اور یہ کام مردوں کا ہے وغیرہ، اس میں چھپی عیاری کو واضح کیا اور فرمایا کہ مادرانہ فرائض کو ڈھنگ سے انجام دینا ہی عورت کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

ازامومت پیچ و تاب جوے ما
موج و گرداب و حیات جوے ما
آن درخ رستاق زادے جاہلے
پست بالائے سطبرے بدگلے
نا تراشے پرورش نادادہ
کم نگاہے کم زبا نے سادہ

آپ کے نزدیک عورت کا کمال یہ نہیں ہے کہ وہ علم و فضل میں ارسطو، افلاطون، شیکسپیئر اور نیوٹن بن جائے بلکہ اس کا کمال یہ ہے کہ وہ ان جیسے لوگوں کو پیدا کرے:

وجود زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ
اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوز دروں
شرف میں بڑھ کے ثریا سے مشت خاک اس کی
کہ ہر شرف ہے اسی درج کا درمکنوں
مکالمات فلا طوں نہ لکھ سکی لیکن
اسی کے شعلہ سے ٹوٹا شرار افلاطوں

تحریک نسواں کا دوسرا مطالبہ یہ ہے کہ عورت نکاح کی بندش سے آزاد ہو کر انفرادی خودی کو ترقی دے، مگر علامہ اقبال عورت مرد کو ایک دوسرے کا لازمی جز مانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ دونوں کو علاحدہ نہیں کیا جا سکتا۔

نغمہ خیز از زخمہ زن ساز مرد
از نیاز اودوبلا ناز مرد

پوشش عریانی مردان زن است
حسن دلجو عشق راپیراہن است

اقبال کے نزدیک خودی کی ترقی کا طریقہ یہ ہے کہ ہر فرد اپنی صلاحیتوں کے مطابق کام کرنے میں آزاد ہو اور چوں کہ عورت کی صلاحیت مرد کے مقابلے میں الگ ہے تو اس کو نہ ماننا اور انکار کرنا فطرت کے خلاف بغاوت ہے۔

روح اقبال، ص، 269

آپ نے عورتوں کو حضرت فاطمہؓ کے اسوہ کو سامنے رکھنے اور اسے اختیار کرنے کی تلقین کی ہے:

مریم از یک نسبت عیسیٰؑ عزیز
از سہ نسبت حضرت زہراؓ عزیز
نور چشم رحمۃ للعالمین ﷺ
آن امام اولین و آخرین
بانوئے آں تاجدار ہل آتی
مرتضیٰؓ مشکل کشا، شیر خدا

شاعری

رابندر ناتھ ٹیگور کی فطرت شناسی اور حسن پرستی ہی آپ کی شاعری کا اصل جوہر ہے۔ اسی لیے آپ کی شاعری کا موضوع فطری و قدرتی مناظر، زمین، کھیت، جنگل، باغ، پہاڑ، سمندر وغیرہ ہے اور آپ نے فطرت کے حوالے سے خصوصی شاعری کی ہے۔ آپ ایک نظم 'وہ میرے مَن میں بہت ہے' میں کہتے ہیں:

میں اس کی تلاش میں ہوں جو میرے مَن میں رہتا ہے
اندھیری رات میں ستاروں کی بہار دیکھ
صبح کو جنگل میں پھولوں کی بھرمار دیکھ۔
وہ ان سب میں آپ رہتا ہے!

جبھی، اس عالم گیر اندھیرے اور اجالے میں-کلامِ ٹیگور، ص 185

اس کے علاوہ رابندر ناتھ ٹیگور کے دوسرے موضوعات میں گاؤں اور شہر کے مختلف رسوم و رواج، تہوار، بچے اور ان کی معصومیت، عورتیں اور ان کے مختلف روپ، مرد اور ان کے مسائل، انسان کی آزادی، فکر و عمل کی آزادی، امن و سکون، اتحاد کا سبق وغیرہ ہیں۔

رابندر ناتھ ٹیگور نے کالی داس، جے دیو، کبیر داس، رومی و حافظ، شیلے، براؤننگ، ایلز بتھ اور شیکسپیئر کو بھی پڑھا تھا، جس کا اثر آپ کی شاعری میں بھی جھلکتا ہے لیکن آپ نے ان سب کے امتزاج سے اپنی ایک الگ راہ نکالی، اسی وجہ سے آپ دیگر شعرا سے ممتاز نظر آتے ہیں۔ آپ کی شاعری میں بے ساختہ پن ہے۔ دل و دماغ میں جو کچھ آتا ہے وہ شعر کی شکل میں نکلتا ہے۔ اسی لیے اس میں کوئی الجھاؤ یا بکھراؤ نہیں ہوتا۔ آپ صرف یہ چاہتے ہیں کہ جیئیں اور دنیا کو بے خود اور متحیر نظروں سے خاموش دیکھتے رہیں۔ چنانچہ اس نظریے سے دنیا کو دیکھنے کے بعد آپ کی جو شاعری وجود میں آتی ہے وہ لازوال، سچی اور دل سے نکلی ہوئی آواز ہوتی ہے۔

ٹیگور کی تشبیہات اور استعارے انوکھے ہوتے ہیں۔ وہ اپنے کلام میں ایسے الفاظ استعمال کرتے ہیں کہ آنکھوں کے سامنے تصور میں منظر آ جاتا ہے۔ ٹیگور کا شاعری کے میدان میں ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ آپ نے اپنی شاعری کے ذریعے بنگلہ کو الگ پہچان دی اور اس کو سنسکرت سے آزاد کرایا۔ اس سے پہلے بنگلہ شاعری میں سنسکرت غالب تھی۔

علامہ اقبال نے اپنی شاعری کا آغاز مادری زبان پنجابی سے کیا لیکن پھر بعد میں آپ اپنے استاد مولوی میر حسن کے کہنے پر اردو میں شعر کہنے لگے۔ شروعاتی دور

میں آپ نے عام صنفِ شاعری اور بچوں کی نظموں وغیرہ میں طبع آزمائی کی جیسے ایک گائے اور بکری، بچے کی دعا اور پرندے کی فریاد وغیرہ۔ اسی دور میں آپ کی شاعری کا ایک حصہ ایسا بھی ہے جو مغربی شعرا ٹینی سن، ایمرسن اور گوئٹے وغیرہ کے کلام سے ماخوذ ہے۔ یہ درحقیقت اقبال کی موضوعی نظموں کا اوّلین نقوش ہیں۔ آثارِ اقبال، ص 23

لیکن یورپ سے واپسی پر آپ کی شاعری کا اصل دور شروع ہوتا ہے، جس کو ہم اسلامی شاعری بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس میں آپ نے ایسی نظمیں کہیں جس میں خودی اور بے خودی کا فلسفہ تھا۔ جیسے 'انسان اور بزم قدرت'، 'عقل و دل' اور 'کنار راوی' وغیرہ۔

بات اگر دونوں کے کلام کی ہو تو اگرچہ دونوں نے الگ الگ ماحول میں پرورش پائی تھی، لیکن دونوں کے بعض افکار و نظریات میں بڑی حد تک مشابہت پائی جاتی ہے۔ اس کا اثر ہم ان کے کلام میں بھی دیکھتے ہیں۔ جیسی ٹیگور نے اپنی شاعری میں انسان اور کائنات کے درمیان ایک ماورائی رشتہ بتایا ہے جس سے ظاہر و باطن کی دنیا الگ ہو جاتی ہے۔ اس کو علامہ اقبال نے بھی تسلیم کیا اور کہا کہ:

''عالمِ روحانی عالمِ مادی سے بے تعلق نہیں۔ انفس و آفاق ایک ہی حقیقت کے دو پہلو ہیں۔

فکرِ اقبال: خلیفہ عبدالحکیم، ص 459

ٹیگور نے تزکیہ نفس پر زور دیا ہے۔ ایک جگہ فرمایا:

''میں ہمیشہ کوشش کروں گا کہ تمام برائیاں اپنے دل سے نکال ڈالوں اور اپنے عشق کو پھولوں کی طرح تازہ اور شگفتہ رکھوں۔ یہ جان کر کہ تری جگہ میرے دل کی خلوتِ حرم میں ہے'' (گیتانجلی)۔

علامہ اقبال بھی دل کو پاک رکھنے کی تلقین کرتے ہیں اور اس سلسلے میں خودی کا نظریہ پیش کرتے ہیں:

دل بے سوز کم گیر و نصیب از صحبت مردے
مسِ تابیدۂ آور کہ گیرد در تو اکسیرم

ٹیگور انسان کو سب سے بلند مقام پر دیکھنا چاہتے ہیں اور اقبال بھی اپنی شاعری کے ذریعے انسان کو بلند ترین مقام پر پہنچانا چاہتے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں:

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

ٹیگور اور اقبال دونوں کا مقصد ایک تھا لیکن نظریہ اور طریقہ الگ تھا۔ اقبال اسلام کو ترجیح دیتے ہیں اور اسی کی روشنی میں مسائل کا حل تلاش کرتے ہیں، جبکہ ٹیگور انسانیت کو ہی مذہب مانتے ہیں اور اسی پر اپنی شاعری کی بنیاد رکھتے ہیں۔ اسی وجہ سے بعض افکار و نظریات میں اختلاف بھی نظر آتا ہے۔ جیسے ٹیگور نے اپنی شاعری میں خدا اور انسانوں کے درمیان دوری اور قرب کو یاس و مایوسی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ایک جگہ فرمایا:

میں تجھ کو اپنا معبود سمجھتا ہوں
اور تجھ سے دور ہی رہتا ہوں
جب میں تجھ کو اپنا نہ جانوں
تو قربت محسوس میں تجھ سے کرتا ہوں۔۔۔

جبکہ اقبال کے یہاں مایوسی کا نام و نشان نہیں ملتا ہے۔ چنانچہ آپ کہتے ہیں:

غلام ہمت بیدار آں سوارانم
ستارہ رابسناں سفتہ درگر بستند
من ندانم نور یا ناراست اندر سینہ ام
ایں قدر دانم بیاض او بہ مہتا بے زند

ٹیگور لازوال طاقت کے سامنے سپردگی کو روحانی سکون حاصل کرنے کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ آپ گیتانجلی میں ایک جگہ کہتے ہیں:

''اے مہر درخشاں میں موسمی خزاں کے اس لکّہ ابر کی طرح ہوں جو بے کار ادھر اُدھر اڑتا پھرتا ہے، کرنوں نے مجھے چوم کر ابھی گلا نہیں دیا کہ میں فنا ہو کر تیرے نور میں مل جاؤں۔ اگر تیری یہی مرضی ہے اور اگر تجھے یہی انداز پسند ہے تو۔۔۔۔الخ''

جبکہ اقبال مذہب پرست تھے اس وجہ سے سپردگی کے خلاف تھے چنانچہ آپ خدا کے حضور میں بھی اپنی انسانی خودی کو فراموش نہیں کرتے ہیں:

اناالحق جز مقامِ کبریا نیست
سزائے او چلیپا ہست یا نیست
اگر فردے بگوید سرزنش بہ
اگر قومے بگوید نار وانیست

ٹیگور کی شاعری میں بعض جگہوں پر ٹیگور کی سوچ میں ان کا یہ تصوف زیادہ نظر آتا ہے، جب کہ اقبال کے یہاں صرف اور صرف اقرارِ تصوف ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

صوفی کی طریقت میں فقط مستیِ احوال
ملاّ کی شریعت میں فقط مستیِ گفتار
شاعر کی نوا مردہ و افسردہ و بے ذوق
افکار میں سرمست، نہ خوابیدہ نہ بیدار
وہ مردِ مجاہد نظر آتا نہیں مجھ کو
ہو جس کے رگ و پے میں فقط مستیِ کردار

ٹیگور پرسکون زندگی گزارنا چاہتے ہیں، جبکہ اقبال خطرات سے بھری زندگی چاہتے ہیں اور مشکلات کو دعوت دے کر ان پر حاوی ہونے کی تلقین کرتے ہیں۔ آپ کا کمال یہی ہے کہ آپ ہار کر بیٹھ جانے والوں میں سے نہیں تھے، بلکہ اسی سے راہ نکالنے کی تلقین کرتے ہیں:

مجھے ڈرا نہیں سکتی فضا کی تاریکی
میری سرشت میں ہے پاکی و درخشانی
تو اے مسافر شب خود چراغ بن اپنا
کر اپنی رات کو داغِ جگر سے نورانی

ٹیگور نے انسان کو بے بس اور لاچار قرار دیا ہے، لیکن اقبال کہتے ہیں کہ انسان ایک خاص حد تک ہی بے بس اور لاچار ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ عملی قوت سے بالکل محروم ہے اور وہ اپنے فہم و ادراک سے عروج و کمال کے منازل طے نہیں کر سکتا۔

ٹیگور کی شاعری میں سادگی، تازگی، برجستگی، روانی، ترنم اور موسیقی کا لاجواب امتزاج نظر آتا ہے لیکن جوش و خروش، ولولہ اور شعلہ افشانی نہیں پائی جاتی ہے، جبکہ اقبال کی شاعری میں اضطراب، بے داری، شعلہ، مردانہ پن، جلال اور خودداری ہے۔

فنونِ لطیفہ

رابندر ناتھ ٹیگور شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بلند پایہ افسانہ نگار، ناول نگار، ڈرامہ نگار، موسیقار، رقاص اور مصور بھی تھے۔ ان تمام میدانوں میں آپ نے اپنی ایک الگ شناخت قائم کی۔ آپ خود ہی گیت لکھتے اور اس کی دھنیں خود ہی تشکیل دیتے تھے۔ آپ کے گیت کلاسکی ہندوستانی گانوں کے طرز پر نہیں ہیں، البتہ اس میں ہندوستانی موسیقی کا اثر ضرور دکھائی دیتا ہے۔ آپ کو بنگالی دھنوں سے خاص محبت تھی۔ دوسروں کے مقابلے میں آپ کے گیت مختلف اور متنوع موضوعات و احساسات کا احاطہ کیے ہوئے ہیں۔

ٹیگور ہندوستان کے پہلے جدید مصور تھے اور آپ کا آرٹ اولین جدید ہندوستانی آرٹ تھا۔ اگرچہ نقادوں نے اس کے آرٹ ہونے میں شک ظاہر کیا ہے لیکن ان لوگوں کی یہ رائے صرف ہندوستانی آرٹ کے پس منظر میں تھی جب کہ ٹیگور صرف ہندوستانی مصور نہیں تھے بلکہ آپ مغربی مصوری کے بھی ماہر تھے اور راجپوت اور مغل مصوری کا بھی مطالعہ کیا تھا۔ ان تمام کے امتزاج سے آپ نے نئی طرزِ مصوری ایجاد کی تھی۔

علامہ اقبال کے نزدیک 'فن برائے فن' نہیں بلکہ 'فن برائے زندگی' ہونا چاہیے اور زندگی صرف خودی کا نام ہے اسی لیے آپ تمام فنونِ لطیفہ میں اسی زندگی کو تلاش کرتے ہیں:

سرود و شعر سیاست کتاب و دین وہنر
گہر ہیں ان گرہ میں تمام یکدانہ
ضمیر بندۂ خاکی سے ہے نمود ان کی
بلند تر ہے ستاروں سے ان کا کاشانہ
اگر خودی کی حفاظت کریں تو عین حیات
نہ کر سکیں تو سراپا فسون و افسانہ

اسی وجہ سے آپ نے فنونِ لطیفہ پر ٹیگور کی طرح طبع آزمائی نہیں کی۔ آپ کو فنون لطیفہ میں وہی مناظر پسند آتے ہیں، جو حسن و جمال کے ساتھ جاہ و جلال کی نمائش کریں:

یک زباں بارفتگاں صحبت گزیں
صنعت آزاد مرداں ہم بہ بیں
خیز و کارا یبک و سوری نگر
وانما چشمے اگر داری جگر
خویش را از خود بروں آوردہ اند
ایں چنیں خود را تماشا کردہ اند

پھر بھی آپ کو ستار سے دلچسپی تھی اور آپ قوالی بھی پسند کرتے تھے۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ دونوں کے یہاں فنونِ لطیفہ کے نظریے میں بنیادی اختلاف پایا جاتا ہے شاید یہ مذہب کے اختلاف کا نتیجہ ہو۔

نوبل پرائز

ٹیگور کو 'گیتانجلی' پر 1913 میں یورپ کا سب سے بڑا وقار انعام 'نوبل پرائز' ادب کے میدان میں ملا۔ علامہ اقبال کے مداحوں کو اس بات کا قلق ہمیشہ رہتا ہے کہ ان کو نوبل پرائز کیوں نہیں دیا گیا؟ چونکہ نوبل کمیٹی کی تمام دستاویزات اور خط و کتابت پر پچاس برس تک راز رکھنے کی پابندی ہوتی ہے اس لیے 1960 سے پہلے تک اس راز پر پردہ پڑا ہوا تھا۔ 1963 میں دستاویزات کے آنے پر یہ راز کھلا کہ یورپ میں چھڑنے والی جنگ کی ممکنہ تباہ کاریوں کو دیکھتے ہوئے کمیٹی کا خیال تھا کہ یہ انعام ایسے ہاتھ میں جائے جو شانتی، امن اور انسانیت کا درس دیتا ہو۔ کیونکہ نوبل انعام یافتہ ادیب کو راتوں رات شہرت مل جاتی ہے تو اس کی تحریروں کا اثر واضح طور پر دنیا کے سبھی انسانوں پر کچھ نہ کچھ بہرحال پڑتا ہے۔

ہیرَلڈ ہیارن نے مختلف ماہرین کی رپورٹ پیش کرنے کے بعد یہ خیال ظاہر کیا کہ اس انعام کو کسی ایسے قلم کار کے ہاتھوں میں نہ جانا چاہیے جو کسی مخصوص قوم کے ملّی جذبات کو ابھار رہا ہو اور دنیا میں اس کو غالب ہونے کی اشاعت کر رہا ہو۔ ظاہر ہے کہ علامہ اقبال کی شاعری کا بیشتر حصہ اسلام اور مسلمانوں کی عظمت کو یاد کرنے اور اسے دوبارہ بحال کرنے پر منحصر ہے اور اقبال اپنی ملت کو اقوام مغرب سے بالاتر بھی سمجھتے تھے۔ ایک جگہ آپ نے فرمایا:

دیار مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکان نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ زرکم عیار ہوگا
نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو الٹ دیا تھا
سنا ہے یہ قدسیوں سے میں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہوگا

ظاہر ہے اس طرح کے خیالات پر آپ کو نوبل پرائز کیسے مل سکتا تھا؟ البتہ انگریز سرکار نے آپ کو 'سر' کا خطاب ضرور عطا کیا تھا لیکن ٹیگور نے آپ کو یہاں پر بھی مات دے دی کیوں کہ آپ کو سات برس پہلے ہی یہ خطاب مل گیا تھا۔ لیکن حیرت اس بات پر ہوتی ہے کہ علامہ اقبال نے اس خطاب کو ٹیگور کی طرح انگریزوں کی ظلم و زیادتی پر واپس کیوں نہیں کیا؟۔

بہرحال ٹیگور اور اقبال دونوں ادب کے عظیم سرمایہ ہیں اور دونوں کی اپنی اپنی جگہ اہمیت مسلّم ہے۔ اگرچہ دونوں کے افکار و نظریات میں چند یکسانیت کے گوشے بھی پائے جاتے ہیں لیکن کسی کو کسی پر فوقیت دینا ممکن نہیں ہے۔ کیونکہ دونوں نے ہی اپنی فکر کے مطابق انسانیت کی خدمت کی ہے۔ اس لیے دونوں کو برابر کا درجہ دینا چاہیے۔

■

Mohd Usama, Research Scholar, JMI, New Delhi– 110025

گوشہ ٹیگور اور اقبال

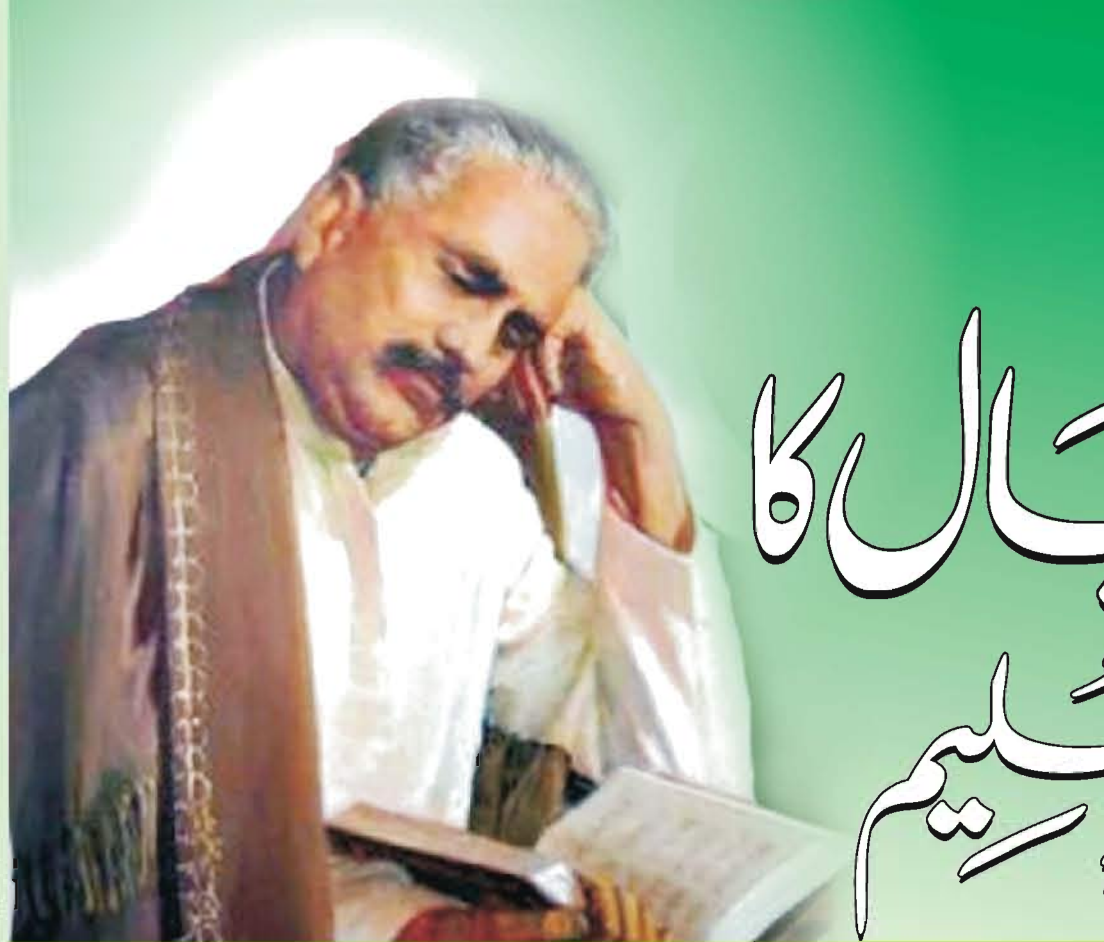

اقبال کا تصورِ تعلیم

یاسمین فاطمہ

لفظ تعلیم کا استعمال تقریباً ہر عہد میں وسیع معنی میں کیا جاتا رہا ہے۔ لہٰذا تعلیم سے مراد محض رسمی تعلیم تک محدود نہیں ہے۔ دوسرے لفظوں میں تعلیم وہ علم نہیں ہے جو طالب علم عمر کے لحاظ سے تبدریج حاصل کرتا ہے۔ مطلب یہ کہ ہر طالب علم پہلے ابتدائی تعلیم کے حصول کی منزل سے گزرتا ہے۔ پھر درمیانی تعلیم کا وقفہ اس کی زندگی میں آتا ہے۔ اس وقفے کے گزرنے کے بعد وہ اعلیٰ تعلیم کی طرف رجوع کرتا ہے۔ جو یونیورسٹیوں اور دیگر اعلیٰ درسی اداروں سے حاصل کی جاتی ہے۔ لیکن درحقیقت تعلیم کا تصور بڑا وسیع اور بامعنی ہے۔ حصولِ تعلیم کا عمل شعوری اور غیر شعوری انداز میں انسانی زندگی کا اہم اور بنیادی حصہ رہا ہے۔ یہ عمل پیدائش سے لے کر زندگی کے آخری لمحے تک کسی نہ کسی صورت میں جاری رہتا ہے۔

کوئی بھی عمل اور حرکت کسی مقصد کے حصول کی غرض سے ہی وجود میں آتا ہے۔ لہٰذا تعلیم عمل کا بنیادی مقصد بھی بعض اعتبار سے انسانی زندگی اور سماج کی اصلاح اور بہبود سے منسوب ہے کیونکہ تعلیم کے ذریعے انسان کو زندگی کا شعور آتا ہے۔ وہ تہذیبی، معاشی اور معاشرتی خوبیوں سے واقف ہوتا ہے۔ ان خوبیوں کو اپنی زندگی میں اہمیت دیتا ہے۔ اپنی فہم و ادراک کے مطابق گرد و پیش کے ماحول کا تنقیدی جائزہ لیتا ہے۔ ماحول کی ناخوشگواریت اور قابل اعتراض باتوں اور حقیقتوں کو بہتر اور سازگار بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ مختصر طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ انفرادی اور اجتماعی زندگی سے وابستہ مختلف پہلوؤں کی تربیت اور نشو و نما حصول تعلیم کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ ایسا ضروری بھی ہے کیونکہ اس طرح سے ایک ایسا سماج وجود میں آسکتا ہے جس کے افراد اعلیٰ تہذیب یافتہ ہوں۔ اقتصادی اور اخلاقی اعتبار سے خوش حال اور اپنے تئیں مطمئن ہوں۔ ان کے پاس منظم اور خاص فلسفۂ حیات ہو جو فکر اور عمل کا درس دیتا ہو۔

اقبال خود اعلیٰ تعلیم یافتہ انسان تھے۔ مشرقی تعلیم کے ساتھ ساتھ مغربی تعلیم سے بھی ان کی شخصیت فیض یاب ہوئی تھی۔ اس لیے وہ ذہنی اور روحانی اعتبار سے وسیع النظر اور وسیع المشرب تھے۔ ان کا تعلیمی نظریہ بھی اسی وسیع النظری اور وسیع المشربی کا نتیجہ معلوم ہوتاہے۔

اردو زبان کے جن شعرا نے زندگی اور سماج کی اصلاح اور ترقی کے لیے جن راستوں کا تعین کیا ہے ان کی ابتدا تعلیم کے حصول کے مرحلے سے گزر کر ہوتی ہے۔ ان شعرا میں ڈاکٹر محمد اقبال کی شخصیت ایک خاص وقار اور انفرادی عظمت کی مالک ہے۔ گوکہ اقبال ماہر تعلیم (Educationist) نہیں تھے۔ اس لیے ان کے یہاں تعلیم کا کوئی بہت واضح اور منظم تصور نہیں ملتا۔ تاہم ان کے فلسفۂ فکر و علم میں تعلیم کے متعلق کچھ بکھرے ہوئے خیالات اور رجحانات کا پتہ چل جاتا ہے۔

چونکہ اقبال خود اعلیٰ تعلیم یافتہ انسان تھے۔ مشرقی تعلیم کے ساتھ ساتھ مغربی تعلیم سے بھی ان کی شخصیت فیض یاب ہوئی تھی۔ اس لیے وہ ذہنی اور روحانی اعتبار سے وسیع النظر اور وسیع المشرب تھے۔ ان کا تعلیمی نظریہ بھی اسی وسیع النظری اور وسیع المشربی کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔ تبھی تو وہ یہ کہنے پر مجبور ہوجاتے ہیں:

مشرق سے ہو بیزار نہ مغرب سے حذر کر
فطرت کا اشارہ ہے کہ ہر شب کو سحر کر

اس شعر کی روشنی میں اقبال اس حقیقت کو واضح کرنا چاہتے ہیں کہ زندگی جو ایک حقیقی شے ہے اس کی پائیداری سود و زیاں کے احساس سے اوپر اٹھ کر ہے۔ اس لیے انفرادی اور اجتماعی سطح پر کسی طرح کی پابند مصلحت اور تعصب پسندی کی گنجائش نہیں ہے۔ انسان کو چاہیے کہ وہ اپنی قوتوں کو پہچانے۔ ان کو نمایاں کرنے کے لیے مناسب طریقِ کار کو عمل میں لائے۔ اس کے لیے ذہنی اور روحانی شعور کی پختگی درکار ہے اور یہ پختگی عمدہ تعلیم کے ذریعے ہی پیدا ہوسکتی ہے۔ گویا وہ تعلیم کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہیں۔ ن کے نزدیک عمدہ تعلیمی قدریں مشرقی نظام تعلیم سے بھی حاصل کی جاسکتی ہیں۔ اس کے علاوہ مغربی نظام تعلیم سے بھی حاصل کی جاسکتی ہیں۔ اس لیے ان کا خیال ہے کہ ان دونوں قسم کے نظامِ تعلیم میں سے کسی ایک کی اہمیت کو قطعی طور پر نظر انداز کردینا یا غیر اہم اپنے تئیں تسلیم لینا قرین انصاف نہیں ہے:

تو اگر اپنی حقیقت سے خبردار رہے
نہ سیہ روز رہے پھر، نہ سیہ کار رہے

یعنی اگر انسان کو اپنے وجود کا احساس رہے۔ حرمتِ وجود کی تکمیل کے لیے فکر مند اور باعمل رہے۔ تو نہ اس کی زندگی میں کسی طرح کی مشکل کا امکان رہے۔ نہ ہی کسی ظلم کو سہنے کی مجبوری رہے۔ عموماً کسی قسم کی پریشانی کی آمد اور ظلم سہنے کی مجبوری انسان کی اپنی جہالت اور کم علمی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اس جہالت کو اور کم علمی کو تعلیم کے حصول کے ذریعے دور کیا جاسکتا ہے۔

اس پس منظر میں یہ بات غالباً واضح ہوجاتی ہے کہ اقبال ذہنی بیداری اور قلبی روشنی کو زندگی کی ارتقا اور بقا کے لیے ضروری خیال کرتے ہیں۔ ذہنی بیداری اور عصری تقاضوں سے آگہی عمدہ تعلیم و تربیت کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ تعلیم حاصل کرنے کا صحیح طریقۂ عمل صرف کتابوں کا مطالعہ کرنا ہی نہیں ہے۔ صحیح تعلیم مطالعے سے حاصل ہونے والے علم سے عملی استفادہ کرنا ہے۔ یہ استفادہ جہد و عمل کی صورت میں آشکار ہو۔ چنانچہ اقبال طالب علموں سے مخاطب ہوکر کہتے ہیں:

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کردے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں
تجھے کتاب سے ممکن نہیں فراغ کہ تو
کتاب خواں ہے مگر صاحب کتاب نہیں

نظم: طالب علم

بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں، کہتے ہوئے تعلیم کے حوالے سے اقبال کی مراد یہ ہے کہ موجودہ زمانے کی مشرقی تعلیم کا مزاج جیسا ہے کہ وہ حالات کی کشمکشوں سے نبرد آزما ہونے اور اس کے تقاضوں کو پورا کرنے کی طاقت اور توانائی عطا کرنے کے لیے ناکافی ہے۔ لہٰذا وقت کا تقاضا یہ ہے کہ مشرقی تعلیم کے ساتھ ساتھ جدید مغربی تعلیم سے بھی استفادہ کیا جائے۔ جس سے انسان کا اخلاقی، سماجی اور معاشرتی وقار تو بڑھے ہی ساتھ ہی معاشی اعتبار سے بھی وہ اپنے آپ میں مطمئن ہو۔ غرض کہ اقبال کے تصور تعلیم میں جتنی اہمیت اخلاقی اور تہذیبی تربیت کو حاصل ہے، اتنی ہی اہمیت مادی ارتقا کو بھی حاصل ہے:

زندگی کچھ اور شے ہے علم ہے کچھ اور شے
زندگی سوزِ جگر ہے علم ہے سوزِ دماغ
علم میں دولت بھی ہے قدرت بھی ہے لذت بھی ہے
ایک مشکل ہے کہ ہاتھ آتا نہیں اپنا سراغ

نظم: تربیت

لیکن مادی ترقی کے لیے اقبال مغربی تعلیم یعنی سائنس اور ٹکنالوجی کے مختلف انکشافات اور ایجادات سے واقفیت اور عملی اہمیت پر زور تو ضرور دیتے ہیں مگر مادی ترقی کی جتنی زیادہ اہمیت اپنی جگہ پر ہے اتنی ہی اس کی ایک حد بھی ہے۔ اس کا بھی اقبال خیال رکھتے ہیں۔ بلکہ ان کے اس خیال میں توازن اور اعتدال کا احساس ہوتا ہے۔ اقبال کا یہ خیال ملاحظہ ہو:

ہر اک مقام سے آگے مقام ہے تیرا
حیات، ذوقِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں
ہے دل کے لیے موت مشینوں کی حکومت
احساسِ مروت کو کچل دیتے ہیں آلات

عصری حالات اور موجودہ زمانے میں اقبال کا تصورِ تعلیم ایک نصیحت آمیز پیغام دیتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ آج جب والدین اپنے بچوں کو انگریزی تعلیم دلانے کی شدید خواہش رکھتے ہیں بلکہ اپنی خواہش کو عملی جامہ پہنانے کی پوری کوشش بھی کرتے ہیں۔ خواہ معاشی نقطۂ نظر سے ان کی حالت کیسی بھی ہو۔ کیونکہ انگریزی تعلیم ہر دور میں معاشی اعتبار سے بارِ گراں رہی ہے۔ بہرحال ہمیں یہ اعتراف کرنے میں برا معلوم نہیں ہوتا کہ انگریزی تعلیم حاصل کرنا وقت کی ضرورت ہے۔ اور ہماری مجبوری بھی ہے کیونکہ اگر ہم ایسا نہیں کریں گے تو زندگی کی مادی ترقی کی دوڑ میں یقینا پیچھے رہ جائیں گے۔ انگریزی زبان بولنے اور سمجھنے والے کی قدردانی اور عزت افزائی اپنی جگہ مسلم ہے۔ اس سے انکار ممکن نہیں۔ خواہ وہ علم اور عمل کے میدان میں کوئی خاص شناخت نہ رکھتا ہو۔ اسی طرح سائنس کی تعلیم اور انفارمیشن اور ٹکنالوجی سے وابستہ علوم نہ صرف اپنی اہمیت پوری طرح ہم سے تسلیم کروا چکے ہیں۔ بلکہ ان علوم سے واقفیت اور تربیت کے سلسلے میں دنیا کے دوسرے ایشیائی اور یورپی ملکوں کے مقابلے میں ہم اگر آگے نہیں ہیں تو بہت زیادہ پیچھے بھی نہیں ہیں۔

مگر مادی ترقی کی اس اندھی دوڑ میں آج ہم نے اور معاشرے نے انسانی قدروں کو تقریباً بھلا دیا ہے۔ رشتوں کی پاسداری، خلوص، محبت، انسان دوستی، ہمدردی، ایثار و قربانی، حق شناسی اور حق گوئی جیسے اخلاق اور تہذیبی فرائض اور نکات سے ایک حد تک ناآشنا ہوکر رہ گئے ہیں۔ یعنی ہم نے ’ہر اک مقام سے آگے مقام‘ کی طرف ایک اندھی دوڑ لگا رکھی ہے اور ’مشینوں کی حکومت‘ کو خندہ پیشانی سے قبول کر رکھا ہے جس کے نتیجے میں ہمارے ’دل کی موت‘ ہوگئی ہے اور ’احساسِ مروت‘ بھی ’کچل‘ گئے ہیں۔ گویا انفرادی اور اجتماعی زندگی کا نظام غیر متوازن انداز میں ترقی پذیر ہوا ہے۔ لہٰذا ہمارا یہ

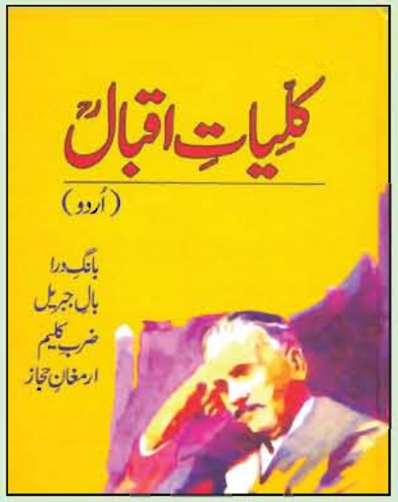

اخلاقی اور سماجی فرض ہے کہ ہم نظامِ زندگی کی مادی ترقی کے اس پہلو پر غور کریں اور اسے اہمیت دیں۔ جو متوازن ہو اور ہر اعتبار سے صحت مند بھی ہو۔ اس کے لیے ذہن اور روح کی بیداری اور وسیع النظری کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے عملی کوششوں کی بھی ضرورت ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ انگریزی اور سائنس کی تعلیم کے ساتھ مشرقی علم و ادب کی تعلیم کی بھی ضرورت ہے۔

■

Yasmeen Fatima, Research Scholar, Dept of Urdu, Allahabad University, Allahabad - 211002

انتخاب کلام ٹیگور

آنکھ مچولی

چمپا کے پیڑ پر چمپا بن کر کھل اٹھوں،
ماں بھور کے سمے اگر ڈال پر
ملائم پتیوں میں لوٹوں پوٹوں—
تم مجھ سے ہار مانو گی،
ماں، تب کیا مجھے پہچان سکوگی؟
تم پکاروگی، ''منا' کہاں ہے رہے''
میں صرف چپ چاپ ہنسوں گا

جب تم کوئی کام لے کر بیٹھوگی وہ میں دیکھ لوں گا آنکھیں کھول کر
نہا کر چمپا کے نیچے سے ہوکر
آؤ گی تم پیٹھ پر اپنی لٹیں پھیلائے ہوئے—
یہاں سے ہوکر پوجا کے کمرے میں جاؤ گی،
دور سے پھول کی خوشبو پاؤ گی
جب تم یہ نہیں سمجھ پاؤ گی کہ تمھارے منا کے بدن سے ہی سگندھ آرہی ہے
دوپہر کے سمے مہابھارت ہاتھ میں لیے
تم بیٹھوگی سب کا کھانا پینا ہو چکنے پر،
پیڑ کی چھایا گھر کی کھڑکی سے
آکر پڑے گی تمھاری پیٹھ اور گود پر
میں اپنی چھوٹی چھایا کو
ڈولاؤں گا تمھاری کتاب کے اوپر لاکر
جب تم یہ نہیں سمجھ پاؤ گی
کہ تمھاری آنکھوں میں منا کی پرچھائیں تیر رہی ہے
شام کو دیپک جلاکر
جب تم جاؤ گی گؤشالہ میں
تب میں پھول کا کھیل کھیل کر،

اے ماں ٹپ سے دھرتی پر جھڑ پڑوں گا
پھر سے تمھارا منا بن جاؤں گا،
'کہانی سناؤ' تم سے جاکر کہوں گا
تم کہوگی، 'نٹ کھٹ تو کہاں تھا؟''
میں کہوں گا، نہیں بتاتا
ششوستمبر 1903، (نظم نمبر 48)

ترجمہ: فراق گورکھپوری

تہمت

ارے بچے تمھاری آنکھوں میں پانی کیوں ہے
کس نے تمھیں کیا کہا ہے
مجھ سے صاف صاف کہو
کیا لکھتے لکھتے ہاتھوں اور منہ میں
سیاہی پوت لی ہے
گندا کہہ کر اسی لیے کسی نے گالی دی ہے؟
چھی چھی، کیا یہ مناسب ہے
ماہِ کامل سیاہی پوت لے
(تو) دیکھیں کون گندا کہتا ہے
ارے بچے، سبھی تمھاری غلطی پکڑتے ہیں
میں دیکھتی ہوں ہر چیز سے
ان لوگوں کو شکایت ہے
کھیل میں کپڑا
پھاڑ پھوڑ کر آئے،
کیا اسی لیے تمھیں ابھاگا لڑکا کہتے ہیں
چھی چھی یہ کون سا طریقہ ہے
پھٹے ہوئے بادلوں میں سویرا ہنستا ہے
کیا وہ ابھاگا ہے
تمھیں کون کیا کہتا ہے اس طرف کان ہی نہ دینا

تمھارے نام پر گویا ایک ہنگامہ
برابر بڑھتا ہی جاتا ہے
تم مٹھائی پسند کرتے ہو
کیا اسی لیے گھر میں اور باہر
لالچی کہہ کر تمھاری سب مذمت کرتے ہیں
چھی چھی کیا ہوگا
تمھیں جو لوگ پیار کرتے ہیں
وہ کیسے لوگ ہیں
ششوستمبر 1903 (نظم نمبر 50)

ترجمہ: فراق گورکھپوری

سمجھ پاتی نہیں ہو تم مجھے، ہے نا؟
تعجب سے بھری آنکھیں تمھاری پوچھتی ہیں
کہ جیسے چاند ایک ٹک دیکھتا ہے تعجب سے سمندر کو

ترجمہ: گلزار

'گیتانجلی' سے انتخاب

(1)

اے میرے آقا! مجھے نہیں معلوم تو کس طرح گاتا ہے! میں ہمیشہ ایک خاموش حالتِ تحیر میں سنا کرتا ہوں۔
تیری موسیقی کی روشنی عالم کو منور کررہی ہے۔ تیری موسیقی کا نفسِ حیات ایک آسمان سے دوسرے آسمان تک دوڑا پھرتا ہے۔ تیری موسیقی کا مقدس چشمہ تمام سنگین حجابات کو توڑ کر بہہ نکلتا ہے۔
میرا قلب آرزومند ہے کہ تیرے نغموں کا ہم نوا ہوجائے۔ لیکن ایک آواز کے لیے بے کار تڑپ رہا ہے۔ میں بولتا ہوں۔ میرے بول نغمہ نہیں ہوتے۔ لاچار عاجز ہوکر چیخ اٹھتا ہوں۔ آہ! تو نے میرے قلب کو اپنی موسیقی کے بے شمار پھندوں میں اسیر کرلیا آقا!

(نظم نمبر 3)

(2)

اس چھوٹے سے پھول کو توڑ لے اور لے لے۔ دیر نہ کر! مجھے خوف ہے کہ مبادا وہ کمھلا جائے اور خاک آلودہ ہوجائے۔

وہ تیرے ہار میں جگہ نہ پائے، نہ پائے۔ لیکن اپنے دردمند ہاتھ کے مس سے اس کی عزت تو بڑھادے۔ میں ڈرتا ہوں کہیں میرے آگاہ ہونے سے پہلے ہی دن ختم نہ ہوجائے اور نذر کا وقت گزر جائے۔ مانا کہ اس کا رنگ گہرا نہیں ہے۔ اس کی خوشبو کمزور ہے (لیکن کیا ہرج ہے) اپنی خدمت (پرستش) کے لیے اس پھول کو کام میں لا۔ اور اسے توڑ لے جب کہ ابھی وقت ہے۔

(نظم نمبر 6)

(10)

اگر دن ختم ہوگیا ہے۔ اگر چڑیاں اب نہیں گاتیں۔ اگر ہوا مضمحل وخستہ ہوگئی ہے تو تاریکی کا نقاب میرے (چہرہ کے) اوپر ڈال دے بالکل اسی طرح جس طرح تو نے زمین کو چادر خواب میں ملفوف کردیا اور جس طرح شام کے وقت نڈھال کنول کی پنکھڑیوں کو نزاکت کے ساتھ بند کردیا۔
اس مسافر سے شرم وافلاس دور کردے جس کا زادِ راہ قبلِ اختتامِ سفر نبٹ چکا ہو۔ جس کا ملبوس بوسیدہ وگرد آلود اور جس کی قوت خستہ ہوچکی ہے اور اپنی لطف بخش رات کے پردہ میں پھول کی طرح اسے حیاتِ تازہ مرحمت کر۔

(نظم نمبر 24)

ترجمہ: نیاز فتح پوری

(بشکریہ ماہنامہ انشا کا سلور جبلی-ٹیگور نمبر)

---

(3)

ترے طرزِ نغمہ سرائی کا
مجھے علم بھی تو نہیں ذرا
کہ بصد تحیر وخامشی
ترے گیت سنتا ہوں میں سدا

ترے گیت کی جو ہے روشنی
وہی میرے جگ کا اُجالا ہے
ترے گیت کی جو حیات بخش یہ سانس ہے
وہی آسمانوں میں ہے رواں
وہ پوتر دھارا ہے تیرا گیت
جو ہر اک چٹان کو توڑ کر
چلا جارہا ہے رواں دواں

مرے دل کی ہے یہی آرزو
کہ شریکِ نغمہ ترا بنے
مگر ایسی ساری ہی کاوشیں
کبھی باریاب نہ ہوسکیں

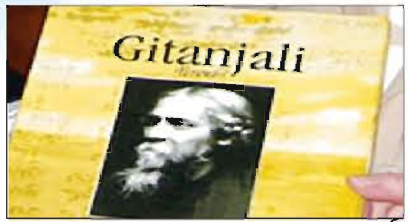

کبھی حرف سُر میں نہ ڈھل سکے
مرے پاس لفظ تو تھے بہت
کبھی لفظ نغمہ نہ بن سکے
میں حواس کھو کے
ہوں چیختا
اے مرے خدا!
ترے گیت کا یہ جو جال ہے
کہ نہ جس کا کوئی کنارہ ہے
مرا دل تو قیدی اُسی کا ہے

(7)

عروسِ نغمہ نے
نوچ پھینکا ہے اپنا سولہ سنگار سارا
غرور اس کو لباس کا ہے
نہ شوقِ زیبائی ہی ہے اس کو
کہ زینتیں تو فراق صورت
ترے مرے درمیان حائل
سدا رہیں گی
کہ اب جو سرگوشیاں ہیں تیری
وہ ان کی جھنکار کے تلاطم میں
ڈوب کر سانس توڑ دیں گی

مرا غرورِ سخن ہمیشہ
ندامتوں کا غبار اوڑھے
تری ثنا میں ہے غرق آقا
سخن کے مالک!
میں تیرے قدموں میں بچھ گیا ہوں
مجھے بس اتنا تو اذن دے دے
کہ اپنی ویران زندگی کو
حق وصداقت کی راہ پر
میں لگا کے چھوڑوں
کہ جیسے نے ہو وہ بانسری کی
جسے تو اپنے سروں سے بھر دے

(11)

ثناو تسبیح ترک کردے
یہ کس کی تقدیس ہو رہی ہے
تو جس کو معبد سمجھ رہا ہے
کسی بھی محبس سے کم نہیں ہے
تو اپنی آنکھیں تو کھول ناداں
کہ تیرا معبود سامنے ہے

جہاں پہ دہقاں کا ہل ہے چلتا
وہیں پہ موجود وہ ملے گا
جہاں پہ پتھر کے کوٹنے میں
غریب مزدور کا پسینہ
مدام گھلتا ہی جارہا ہے
وہاں بھی جلوہ اُسی کا ہوگا
وہ سخت گرمی کی دھوپ ہو
یا پھوار ساون کی پڑ رہی ہو
لباس تم اُس کا دیکھتے ہو
قدم سے سر تک ہے گرد اوڑھے
اُتار و تقدیس کا لبادہ
شعار اپنا ؤ راستی کا
تم اس کے جیسا تو بن کے دیکھو
زمیں پر آؤ

نجات آخر کہاں ملے گی
ہمارے آقا نے
خود ہی کاندھوں پہ رکھ لیا ہے
جوا جو تخلیق کا یہ ہنس کر
تو بندھ گیا ہے ہمارے دامن سے
تا قیامت

مراقبے سے اب آؤ باہر
اٹھا کے رکھو یہ عود وعنبر
ہوا ہی کیا جو تمھاری پوشاک
جا بجا سے مسک گئی ہے
کہ داغ دھبوں سے بھر گئی ہے
ملو تم اس سے
جو جانفشانی وہ کر رہا ہے
پسینہ اپنا بہا رہا ہے
ہے ساتھ دینا ہمیں اسی کا

(بشکریہ: گیتانجلی: رابندر ناتھ ٹیگور، مترجم: سہیل احمد فاروقی، ناشر: ٹیگور ریسرچ اینڈ ٹرانسلیشن اسکیم، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی)

چھٹی

رابندرناتھ ٹیگور

بچوں کے سردار پھٹک چکرورتی کے دماغ میں اچانک ایک نئے خیال نے جنم لیا۔ ندی کنارے سال کی ایک بڑی سی لکڑی مستول کی شکل میں تبدیل ہونے کے لیے پڑی ہوئی تھی۔ طے ہوا کہ اسے یہاں سے لڑھکاتے ہوئے کہیں چھپادیں تو بڑا مزہ آئے گا۔

جس کی لکڑی ہوگی ضرورت کے وقت اُسے کافی پریشانی اور دقت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ یہ سوچ کر بچوں نے ایک جٹ ہوکر اپنے ارادے کو پورا کرنے کی ٹھانی۔

جب کمر باندھ کر پورے جوش کے ساتھ کام شروع کرنے کو سب تیار ہوئے تو اسی لمحہ پھٹک سے چھوٹا ماکھن لال گمبھیر ہوکر کندہ کے اوپر جابیٹھا۔ لڑکے اس کی سخت لاپروائی دیکھ کر کچھ مایوس ہوئے۔ ایک نے ڈرتے ہوئے کندہ کو تھوڑا تھوڑا دھکیلا لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ وہ عقل مند دنیا کے تمام کھیلوں پر فلاسفر کی طرح اپنی سوچ میں گم تھا۔ پھٹِک نے حاکمانہ انداز میں کہا:

''دیکھو مار کھاؤ گے۔ اسی وقت اٹھ جاؤ۔''

تھوڑی جنبش کے بعد وہ مستقل اسی جگہ جم کر بیٹھ گیا۔

عام طور پر ایسی حالت میں اپنی حکومت کی عزت بچانے کے لیے نافرمان بھائی کو بلاتا۔ خیر ایک تھپڑ رسید کرنا پھٹِک کی ذمے داری تھی مگر ہمت نہ ہوئی۔ لیکن اس نے ایسا انداز اختیار کیا کہ اگر وہ چاہے تو اس وقت اسے سزا دے سکتا ہے لیکن ایسا نہیں کیا۔ وجہ یہ تھی کہ پہلے سے بہتر کھیل اس کے دماغ میں آگیا۔ اس میں اور بھی زیادہ مزہ ہے۔ تجویز پیش کی کہ ماکھن کو کندہ کے ساتھ ہی لڑھکا دیا جائے۔

ماکھن نے سوچا کہ بڑے فخر کی بات ہے لیکن اصل میں یہ فخر کی بات نہیں بلکہ اس میں خطرہ تھا۔ اس کے ساتھیوں کے ذہن میں یہ بات نہ آئی۔

لڑکوں نے کمر باندھ کر دھکیلنا شروع کیا:

''مارو دھکا ہیا! شاباش جوانوں ہیا!''

کندہ کے پلٹتے ہی ماکھن اپنی اونچی سوچ کے ساتھ زمین بوس ہوگیا۔

کھیل کی شروعات ہی میں نتیجہ امید کے مطابق نکلا۔ تمام لڑکوں نے نعرۂ تحسین بلند کیا لیکن پھٹِک بے چین ہو اٹھا۔ ماکھن اسی اثنا میں زمین سے اٹھ کر پھٹِک کے اوپر پل پڑا اور اندھا دھند مارنے لگا۔ منہ ناک نوچ ڈالے اور پھر بلکتے ہوئے گھر کا رخ کیا۔ اس کے بعد کھیل بند ہوگیا۔

پھٹِک نرسل کے چند پودے توڑ کر تاڑ کے اگلے ادھ کھلے حصہ پر جابیٹھا اور چپ چاپ نرسل کی جڑ کو چبانے لگا۔

اس وقت دوسرے گاؤں کی ایک ناؤ گھاٹ پر آکر رکی۔ ادھیڑ عمر کا ایک شریف آدمی اپنی کچی مونچھ اور پکے بال کے ساتھ باہر آیا۔ لڑکے سے پوچھا: ''چکرورتی خاندان کدھر رہتا ہے؟''

لڑکا نرسل چباتے چباتے بولا: ''اُدھر!'' لیکن کس طرف یہ کوئی بھی نہیں سمجھ پایا۔

شریف آدمی نے پھر پوچھا: ''کہاں؟''

اس نے کہا: ''نہیں معلوم۔'' بول کر پھر سے نرسل کے پھول کا رس چوسنے لگ گیا۔ بابو صاحب کسی دوسرے کے ساتھ چکرورتی کی تلاش میں نکل پڑے۔

تھوڑی دیر بعد باگھا باگدی آکر بولا:

''پھٹک دادا! ماں بلا رہی ہے''

پھٹِک نے کہا: ''نہیں جائیں گے''

باگھا اس وقت پوری طاقت کے ساتھ اسے گود میں اٹھا کر لے گیا۔ پھٹِک شکست کھا کر مشتعل ہوگیا اور ہاتھ پاؤں چلانے لگا۔

پھٹک کو دیکھتے ہی اس کی ماں غصہ سے آگ بگولہ ہوکر بولی: ''پھر تم نے ماکھن کو مارا؟''

''پھٹِک نے کہا: ''نہیں، مارا نہیں۔''

''پھرٹ جھوٹ بول رہے ہو؟''

''بالکل نہیں مارا۔ ماکھن سے پوچھ لو۔''

ماکھن سے جب پوچھا تو اس نے پھر دہرایا: ''ہاں مارا۔''

تب پھٹِک کو برداشت نہیں ہوا۔ تیز قدموں کے ساتھ آگے بڑھ کر ایک زوردار طمانچہ رسید کیا:

''پھر جھوٹ؟''

ماں نے ماکھن کی طرف ہوکر پھٹِک کو دوڑاتے ہوئے پیٹھ پر دوتین ہاتھ جڑ دیے۔ پھٹِک نے ماں کو دھکیل دیا

ماں دہاڑی:

''ارے تم نے مجھ پر ہاتھ اٹھایا؟''

اس وقت وہی کچھ مونچھ اور پکے بال والے بابو صاحب گھر میں داخل ہوتے ہوئے بولے:

''کیا کر رہے ہو تم لو؟''

پھٹک کی ماں اچانک خوشی سے چہک پڑی:

''او ماں! یہ تو دادا ہیں؟ تم کب آئے؟''

یہ کہتے ہوئے اس نے بھائی کے پاؤں چھوتے ہوئے آشیرواد لیا۔

بہت دن ہوئے داد پچھّم کی طرف نوکری کرنے چلے گئے تھے۔ اسی دوران پھٹک کی ماں کی دو اولادیں ہوئیں۔ دونوں کچھ بڑے بھی ہوگئے۔ اس دوران اس کے شوہر کا دیہانت بھی ہوگیا، تب بھی بھائی نظر نہیں آئے۔ آج ایک زمانے کے بعد بشمبھر بابو وطن واپس آئے ہیں تو اپنی بہن کو دیکھنے آگئے۔

کچھ دنوں تک کافی چہل پہل رہی۔ جانے سے ایک دو دن قبل بشمبھر بابو نے اپنی بہن سے ان کے لڑکوں کی پرورش اور پڑھائی لکھائی کے بارے میں پوچھا۔ جواب ماں پھٹک کی شرارت اور پڑھائی سے بے توجہی اور ماکھن کی سادگی اور پڑھائی سے بے توجہی اور ماکھن کی سادگی اور پڑھائی لکھائی سے دلچسپی کی داستان سنی۔ بہن نے شکایت کی: ''پھٹک نے بہت پریشان کر رکھا ہے۔''

یہ سن کر بشمبھر بابو نے یہ تجویز رکھی: ''میں پھٹک کو اپنے ساتھ کلکتہ لے جاکر تعلیم دلواؤں گا۔''

بیوہ بہن بخوشی اس تجویز پر راضی ہوگئی۔

پھٹک سے پوچھا گیا: ''کیوں پھٹک! ماما کے ساتھ کلکتے جاؤ گے؟''

پھٹک نے اچھل کر کہا: ''جائیں گے۔''

ہر چند کہ پھٹک کی ماں کو اس کے جانے پر کوئی اعتراض نہیں تھا مگر ان کے دل میں اس کے لیے ہر وقت ایک اندیشہ سا رہتا تھا کہ نہ جانے کس دن وہ ماکھن کو پانی میں ڈبو دے گا یا اس کا سر پھوڑ دے اور نہ جانے کیا کیا کر بیٹھے مگر جب پھٹک جانے پر فوراً رضا مند ہوگیا تو ماں کو مایوسی کے ساتھ کچھ دکھ بھی ہوا۔

''کب جائیں گے؟ کس وقت جائیں گے؟'' بول کر پھٹک نے اپنے ماما کو پریشان کر ڈالا۔ خوشی کے مارے اسے رات بھر نیند نہیں آئی۔

سفر پر جانے سے پہلے اپنی تمام چیزیں مثلاً چھیپ، پتنگ، لٹائی وغیرہ دے کر ماکھن کو کھیلنے کے لیے بڑی ہی خوش دلی سے دے دیا، جیسے ایک باپ اپنی ذمے داری اولاد کو سونپتا ہے۔

کلکتہ میں ماما کے گھر پہنچنے پر سب سے پہلے مامی سے ملاقات ہوئی۔ اچانک خاندان میں ایک آدمی کے بڑھ جانے سے مامی مطمئن ہوئی یا نہیں، کچھ کہا نہیں جاسکتا۔ ان کے خود اپنے تین لڑکے تھے، جنھیں لے کر وہ اپنی طرح اپنا گھر بار چلا رہی تھیں اور اس بیچ اچانک ایک تیرہ برس کا انجان، اَن پڑھ، گنوار لڑکا گھس پڑے، کتنی پریشانی اور تردد کا باعث ہے۔ بشمبھر بابو کی اتنی عمر ہوگئی مگر عقل نام کو بھی نہ آئی۔

تیرہ چودہ سال کا اتنا شرارتی لڑکا دنیا میں نہیں دیکھا۔ اس کا طور طریقہ ٹھیک نہیں۔ کسی کام کے لائق نہیں۔ اس کے لیے دل میں محبت کہاں سے آئے؟ کسی کو اس سے انسیت کی خواہش کیسے ہو؟ اس کے منہ سے کبھی ادھ کچری باتیں نکلتیں، بالکل احمقوں جیسی اور کبھی ایسا ہوتا تھا کہ اپنی حماقت میں بڑوں کی طرح باتیں کرنے لگتا۔

اچانک اس کے کپڑے چھوٹے ہونے لگے مگر اسے اپنی بڑھتی عمر کا احساس نہ تھا۔ دراصل وہ بے ڈھنگے کی طرح بڑھ رہا تھا۔ لوگ اسے عیب سمجھنے لگے تھے۔ اس کے بچپن کی معصومیت اور آواز کی مٹھاس غائب ہوگئی۔ لوگ اسے ہی قصوروار ٹھہراتے۔ بچپن کی شرارتوں کو معاف کیا جاسکتا ہے۔ لیکن عمر کے اس حصے کی کوئی غلطی برداشت نہیں ہوتی۔

وہ اکثر دل ہی دل میں یہ سوچتا کہ زندگی کے کسی بھی گوشے میں صحیح طور پر فٹ نہیں ہو پا رہا ہے، اس لیے اسے ہمیشہ اپنے اس وجود پر شرمندگی کا احساس ہوتا اور معافی کا متمنی رہتا۔

حالانکہ اس عمر میں کسی کی شفقت کی بڑی چاہ ہوتی ہے لیکن کوئی اس کو پیار دینا نہیں چاہتا تھا کیوں کہ اس سے اس کو اور شہ ملتی۔ ایسی صورت میں اس کا چہرہ اور انداز زندگی لاوارث کتے جیسی ہوگئی تھی۔

ان حالات میں اپنے گھر سے دور کسی انجان جگہ بچے کے لیے جہنم کے برابر ہے۔ پیار سے محرومی اس کو قدم قدم پر کانٹے کی طرح چبھ رہی تھی۔

مامی کی نفرت بھری نظر بہت آسانی سے اس کی سمجھ میں آجاتی، اس لیے پھٹک کے دل کو زبردست چوٹ پہنچتی۔ مامی اگر اچانک کبھی کوئی کام کرنے کو کہہ دیتی تو وہ بہت خوش ہوکر ضرورت سے زیادہ کام کر دیتا۔ آخر کو مامی اس کے جوش کو دباتے ہوئے کہتی:

''بہت ہوا، بہت ہوا۔ اور زیادہ کام کرنے کی ضرورت نہیں۔ اب تم اپنے کام پر دھیان دو۔ جاؤ پڑھو۔'' تب مامی کا یہ رویہ اسے اپنی ذہنی ترقی کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ محسوس ہوتا۔ اس کے لیے یہ سراسر ناانصافی تھی۔

گھر کے اندر اس طرح کی یہ ناقدری! کہیں سانس لینے کی کوئی جگہ بھی تو نہیں۔ وہ دیواروں کے بیچ اٹک کر رہ گیا تھا اور اب اس کو صرف اپنے گاؤں کی باتیں یاد آتیں۔

وہ میدان یاد کرتا، جہاں بہت بڑی سی ایک پتنگ لے کر گھوں گھوں کی آواز کے ساتھ اڑتا پھرتا تھا۔ اپنے ساتھ بہت سارے بچوں کو ملی جلی آوازیں یاد آتیں، جو میدان کو سر پر اٹھائے رکھتے۔ آزادی کے ساتھ گھومنا، ٹہلنا، ندی میں دن کے وقت تیرنا، چھوٹی چھوٹی لہروں سے کھیلنا، وہ سب ساتھی، ہنگامہ آزادی اور سب سے آخر میں ماں کی وہ باتیں یاد آتیں جو بھلائے نہ بھولتیں۔ وہ باتیں اس کے دل کو کھینچتی رہتیں۔

جانوروں جیسا پیار جو سمجھ میں نہ آئے۔ صرف ایک اندھی خواہش، ایک ان دیکھی بے چینی، سورج غروب ہوتے وقت جیسے بغیر ماں کا بچہ دل ہی دل میں ماں، ماں کی رٹ لگا کر رو اٹھے گا۔ شرمسار، سہمے ہوئے خام صورت لڑکے کے دل میں یہی کیفیت گھر کیے رہتی۔

اسکول میں اس سے بڑا احمق اور پڑھائی سے بیگانہ لڑکا کوئی اور نہیں تھا۔ سوال پوچھنے پر بیوقوفوں کی طرح تکنے لگتا۔ استاد مارنا شروع کرتے، تب بھی گدھے کی طرح چپ چاپ برداشت کرتا۔ لڑکوں کی جب چھٹی ہوتی، تب کھڑکی

کے قریب جا کر دور کسی اونچی چھت کو گھورنے لگتا۔ جب دوپہر کی دھوپ میں کسی لڑکے لڑکی کو کھیلتے دیکھتا، تب اس کا دل بھی کھیلنے کے لیے مچل اٹھتا۔

ایک دن ارادہ کرکے بڑی ہمت سے اس نے ماما سے پوچھا:

"ماما! ماں کے پاس کب جاؤگے؟"

ماما نے جواب دیا:

"اسکول کی چھٹی کے بعد۔"

کارتک مہینہ میں پوجا کی چھٹی ہوگی۔ اس میں ابھی بہت دیر ہے۔ ایک دن پھٹِک کے اسکول کی کتاب گم ہوگئی۔ ایسے بھی وہ پڑھائی پر پوری توجہ نہیں دیتا۔ اس پر کتاب کا گم ہونا، وہ اور بھی مایوس ہوگیا۔ استاد ہر روز اس کو مارتے اور بے عزت کرتے۔ اسکول میں اس کی ایسی حالت ہوئی کہ اس کے ماموں زاد بھائی بھی اس کو اپنا رشتہ دار کہنے سے شرمندگی محسوس کرتے۔ اس کی بے عزتی پر دوسروں سے زیادہ اس کے ماموں زاد بھائی خوشی کا اظہار کرتے۔

جب بات برداشت سے باہر ہوگئی تو ایک دن پھٹِک اپنی مامی سے مجرم کی طرح جا کر بولا:

"کتاب گم ہوگئی۔"

مامی نے اپنے ہونٹوں کے دونوں کنارے سکٹر کر ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا:

"اچھا ہوا! میں تمھیں ہر مہینے پانچ بار کتاب خرید کر نہیں دے سکتی۔" پھٹِک کچھ جواب نہ دے کر چلا آیا۔ وہ دوسرے کا پیسہ برباد کررہا ہے۔ یہی سوچ کر اپنی ماں کی خودغرضی پر اسے غصہ آیا۔ اپنی بے حرمتی اور مفلسی نے جیسے اسے مٹی میں ملا دیا ہو۔

اسکول سے واپس آنے کے بعد اس رات اس کے سر میں درد ہونے لگا اور جسم کانپنے لگا۔ اندازہ ہوا کہ بخار آرہا ہے۔ وہ سمجھ گیا کہ طبیعت خراب ہونے سے مامی پر زیادہ بوجھ پڑے گا اور بے وجہ انھیں تکلیف ہوگی۔ مامی اس کے اس حال کو بلاوجہ کیا معنی پہنائے گی، اس کو اس کا ٹھیک اندازہ تھا۔ بیماری کی حالت میں بے کار عجیب سا احمق لڑکا اس دنیا میں اپنی ماں کے علاوہ اور کسی سے تیمارداری کی امید رکھنے پر شرمندگی محسوس کررہا تھا۔

دوسرے دن صبح پھٹِک دکھائی نہیں دیا۔ چہار طرف پڑوسیوں کے گھر میں تلاش کرنے پر بھی اس کا کہیں پتہ نہ چلا۔

اس روز رات ہی سے ساون کی موسلا دھار بارش ہونے لگی۔ چنانچہ اسے تلاش کرنے میں لوگوں کو بلاوجہ بہت بھیگنا پڑا۔ آخر میں کہیں پتہ نہیں چلا، اس لیے بشمبھر بابو نے پولس کو خبر دی۔ سارا دن گزر جانے کے بعد شام کے وقت ایک گاڑی بشمبھر بابو کے گھر کے سامنے آکر رکی۔ اس وقت بھی مسلسل بارش ہورہی تھی۔ راستے پر گھٹنوں تک پانی بھر گیا تھا۔

وہ پولس والوں نے گاڑی سے پھٹِک کو پکڑ کر اتارا اور بشمبھر بابو کے سامنے لا کھڑا کیا۔ اس کا جسم پانی سے شرابور اور کیچڑ سے بھرا تھا۔ منہ، آنکھ لال۔ وہ بہت کانپ رہا تھا۔ بشمبھر بابو تقریباً گود میں اٹھا کر اس کو اندر لے گئے۔

مامی اس کو دیکھتے ہی بول اٹھی:

"کیوں جی! دوسرے کے لڑکے کو لے کر یہ جھمیلا؟ جاؤ اس کو، اس کے گھر بھیج دو۔"

حقیقتاً بشمبھر بابو کا سارا دن اندیشے میں کٹا۔ کھانا بھی ٹھیک سے نہیں ہوا اور اپنے لڑکوں سے ناحق نوک جھونک ہوئی۔

پھٹِک نے روتے ہوئے کہا:

"میں ماں کے پاس جارہا تھا۔ مجھے واپس لے آئے۔"

لڑکے کا بخار بڑھ رہا تھا۔ ساری رات بڑبڑاتا رہا۔ بشمبھر بابو ڈاکٹر کو لے کر آئے۔

چھت کی لکڑی کو اپنی سرخ آنکھوں سے دیکھتے ہوئے پھٹک نے کہا:

"ماما! کیا میری چھٹی ہوگئی؟"

بشمبھر بابو رومال سے آنکھیں پوچھ کر شفقت سے پھٹِک کے جلتے ہوئے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر اس کے قریب آکر بیٹھ گئے۔

پھٹک پھر سے بڑبڑانے لگا:

"ماں! ہم کو مت مارو۔ ہاں! سچ بول رہے ہیں ہم نے کوئی غلطی نہیں کی، ماں!"

دوسرے روز دن کے وقت کچھ دیر کے لیے پھٹک ہوش میں آیا تو کسی کے انتظار میں بے کیف نظروں سے گھر کے چہار طرف دیکھا۔ ناامید ہوکر چپ چاپ پھر سے دیوار کی طرف منہ کرکے سو گیا۔

بشمبھر بابو نے اس کے دل کی حالت کو سمجھ کر اس کے کان کے نزدیک آکر دھیمی آواز میں کہا:

"پھٹک تمھاری ماں کو لانے کے لیے آدمی بھیج دیا ہے۔"

اس کے بعد کا دن بھی گزر گیا۔ ڈاکٹر نے مایوس ہوکر کہا: "حالت بہت ہی خراب ہے۔"

بشمبھر بابو بجھتے ہوئے دیے کی روشنی میں بیمار کے بستر پر بیٹھ کر پھٹک کی ماں کا انتظار کررہے تھے۔ پھٹک خلاصیوں جیسی آواز میں بولا:

"ہیّا ہو ہیّا — ہیّا ہو... ہئی... یا.."

کلکتہ آتے وقت اسے کچھ راستہ اسٹیمر سے طے کرنا پڑا تھا۔ خلاصی لنگر پھینک کر سر لگاتے ہوئے پانی کی گہرائی کو ناپتے اور اس طرح کی آواز نکالتے تھے۔

ان خلاصیوں کی باتوں کو درد بھرے انداز میں بڑبڑاتے ہوئے جیسے پانی کی گہرائی ناپ رہا تھا اور بے کنار سمندر کا سفر کررہا تھا۔ لنگر ڈالنے کے بعد بھی اس کی گہرائی تک نہیں پہنچ پا رہا تھا۔

اسی وقت پھٹک کی ماں آندھی کی طرح گھر میں داخل ہوئی اور اونچی آواز میں آواز بلکنے لگی۔ وہ بستر کے اوپر گر کر اونچی آواز میں دینے لگی:

"پھٹک! سونا! میرے بچے—"

بشمبھر بابو نے بڑے کرب کے ساتھ دکھ کے بھنور میں گھری ماں کو تسلی دی۔ ماں بستر پر جھک کر اونچی آواز میں پھٹک کو پکارنے لگی:

"میرے لعل! میرے بچے!"

پھٹک نے دھیمی آواز میں کہا: "ہاں!"

ماں نے پھر آواز دی:

"پھٹک! میرے پیارے پھٹِک۔"

پھٹک نے آہستہ آہستہ کروٹ بدلی اور کسی کو دیکھے بغیر سرگوشی کی:

"ماں! میری چھٹی ہوگئی۔ اب میں گھر جارہا ہوں۔ گھر — اپنے گھر —!!"

■

(بشکریہ: سلور جبلی-ٹیگور نمبر انشا، مدیر: ف س اعجاز، دسمبر 2010)

کلامِ اقبال مختصر انتخاب

ہمالہ

اے ہمالہ! اے فصیلِ کشورِ ہندوستاں
چومتا ہے تیری پیشانی کو جھک کر آسماں
تجھ میں کچھ پیدا نہیں دیرینہ روزی کے نشاں
تو جواں ہے گردشِ شام و سحر کے درمیاں
ایک جلوہ تھا کلیمِ طورِ سینا کے لیے
تو تجلّی ہے سراپا چشمِ بینا کے لیے
امتحانِ دیدۂ ظاہر میں کوہستاں ہے تو
پاسباں اپنا ہے تو، دیوارِ ہندوستاں ہے تو
مطلعِ اوّل فلک جس کا ہو وہ دیواں ہے تو
سوئے خلوت گاہِ دل دامن کشِ انساں ہے تو
برف نے باندھی ہے دستارِ فضیلت تیرے سر
خندہ زن ہے جو کلاہِ مہرِ عالم تاب پر
تیری عمرِ رفتہ کی ایک آن ہے عہدِ کہن
وادیوں میں ہیں تری کالی گھٹائیں خیمہ زن
چوٹیاں تیری ثریا سے ہیں سرگرمِ سخن
تو زمیں پر اور پہنائے فلک تیرا وطن
چشمۂ دامن ترا آئینۂ سیّال ہے
دامنِ موجِ ہوا جس کے لیے رومال ہے
ابر کے ہاتھوں میں رہوارِ ہوا کے واسطے
تازیانہ دے دیا برقِ سرِ کہسار نے
اے ہمالہ کوئی بازی گاہ ہے تو بھی، جسے
دستِ قدرت نے بنایا ہے عناصر کے لیے
ہائے کیا فرطِ طرب میں جھومتا جاتا ہے ابر
فیلِ بے زنجیر کی صورت اڑا جاتا ہے ابر
جنبشِ موجِ نسیمِ صبح گہوارہ بنی
جھومتی ہے نشۂ ہستی میں ہر گل کی کلی
یوں زبانِ برگ سے گویا ہے اس کی خامشی
دستِ گلچیں کی جھٹک میں نے نہیں دیکھی کبھی
کہہ رہی ہے میری خاموشی ہی افسانہ مرا
کنجِ خلوت خانۂ قدرت ہے کاشانہ مرا
آتی ہے ندّی فرازِ کوہ سے گاتی ہوئی
کوثر و تسنیم کی موجوں کو شرماتی ہوئی
آئنہ سا شاہدِ قدرت کو دکھلاتی ہوئی
سنگِ رہ سے گاہ بچتی گاہ ٹکراتی ہوئی
چھیڑتی جا اس عراقِ دل نشیں کے ساز کو
اے مسافر دل سمجھتا ہے تری آواز کو
لیلیِ شب کھولتی ہے آ کے جب زلفِ رسا
دامنِ دل کھینچتی ہے آبشاروں کی صدا
وہ خموشی شام کی جس پر تکلم ہو فدا
وہ درختوں پر تفکر کا سماں چھایا ہوا
کانپتا پھرتا ہے کیا رنگِ شفق کہسار پر
خوشنما لگتا ہے یہ غازہ ترے رخسار پر
اے ہمالہ! داستاں اُس وقت کی کوئی سنا
مسکنِ آبائے انساں جب بنا دامن ترا
کچھ بتا اُس سیدھی سادی زندگی کا ماجرا
داغ جس پر غازۂ رنگِ تکلف کا نہ تھا
ہاں دکھا دے اے تصور پھر وہ صبح و شام تو
دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو

پہلے مجموعہ 'بانگ درا' کی پہلی نظم

آفتاب
(ترجمہ گایتری)

اے آفتاب؛ روح و روانِ جہاں ہے تو
شیرازہ بندِ دفترِ کون و مکاں ہے تو
باعث ہے تو وجود و عدم کی نمود کا
ہے سبز تیرے دم سے چمنِ ہست و بود کا
قائم یہ عنصروں کا تماشا تجھی سے ہے
ہر شے میں زندگی کا تقاضا تجھی سے ہے
ہر شے کو تیری جلوہ گری سے ثبات ہے
تیرا یہ سوز و ساز سراپا حیات ہے
وہ آفتاب جس سے زمانے میں نور ہے
دل ہے، خرد ہے، روحِ رواں ہے، شعور ہے
اے آفتاب! ہم کو ضیائے شعور دے
چشمِ خرد کو اپنی تجلّی سے نور دے
ہے محفلِ وجود کا ساماں طراز تو
یزدانِ ساکنانِ نشیب و فراز تو
تیرا کمال ہستی ہر جاندار میں
تیری نمود سلسلۂ کوہسار میں
ہر چیز کی حیات کا پروردگار تو
زائیدگانِ نور کا ہے تاجدار تو
نے ابتدا کوئی نہ کوئی انتہا تری
آزادِ قیدِ اوّل و آخر ضیا تری

تصویرِ درد

نہیں منت کشِ تابِ شنیدن داستاں میری
خموشی گفتگو ہے، بے زبانی ہے زباں میری
یہ دستورِ زباں بندی ہے کیسا تیری محفل میں
یہاں تو بات کرنے کو ترستی ہے زباں میری
اٹھائے کچھ ورق لالے نے، کچھ نرگس نے، کچھ گل نے
چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں میری
اڑا لی قمریوں نے، طوطیوں نے، عندلیبوں نے
چمن والوں نے مل کر لوٹ لی طرزِ فغاں میری
ٹپک اے شمع آنسو بن کے پُرانے کی آنکھوں سے
سراپا درد ہوں، حسرت بھری ہے داستاں میری
الٰہی! پھر مزا کیا ہے یہاں دنیا میں رہنے کا
حیاتِ جاوداں میری، نہ مرگِ ناگہاں میری!
مرا رونا نہیں، رونا ہے یہ سارے گلستاں کا
وہ گل ہوں میں، خزاں ہر گل کی ہے گویا خزاں میری
''دریں حسرت سرا عمریست افسونِ جرس دارم
ز فیضِ دل تپید نہا خروشِ بے نفس دارم''

ہندوستانی بچوں کا قومی گیت

چشتی نے جس زمیں میں پیغامِ حق سنایا
نانک نے جس چمن میں وحدت کا گیت گایا
تاتاریوں نے جس کو اپنا وطن بنایا
جس نے حجازیوں سے دشتِ عرب چھڑایا
میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے
یونانیوں کو جس نے حیران کر دیا تھا
سارے جہاں کو جس نے علم و ہنر دیا تھا
مٹی کو جس کی حق نے زر کا اثر دیا تھا
ترکوں کا جس نے دامن ہیروں سے بھر دیا تھا
میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے
ٹوٹے تھے جو ستارے فارس کے آسماں سے
پھر تاب دے کے جس نے چمکائے کہکشاں سے
وحدت کی لے سنی تھی دنیا نے جس مکاں سے
میرِ عربؐ کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے
میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے
بندے کلیم جس کے، پربت جہاں کے سینا
نوحؑ نبی کا آکر ٹھہرا جہاں سفینا
رفعت ہے جس زمیں کی بامِ فلک کا زینا
جنت کی زندگی ہے جس کی فضا میں جینا
میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے

التجائے مسافر

(بہ درگاہِ حضرت محبوبِ الٰہیؒ، دہلی)

فرشتے پڑھتے ہیں جس کو وہ نام ہے تیرا
بڑی جناب تری، فیض عام ہے تیرا
ستارے عشق کے تیری کشش سے ہیں قائم
نظامِ مہر کی صورت نظام ہے تیرا
تری لحد کی زیارت ہے زندگی دل کی
مسیح و خضر سے اونچا مقام ہے تیرا
نہاں ہے تیری محبت میں رنگِ محبوبی
بڑی ہے شان، بڑا احترام ہے تیرا
اگر سیاہ دلم، داغِ لالہ زارِ توام
وگر کشادہ جبینم، گلِ بہارِ توام
چمن کو چھوڑ کے نکلا ہوں مثلِ نکہتِ گُل
ہوا ہے صبر کا منظور امتحاں مجھ کو
چلی ہے لے کے وطن کے نگار خانے سے
شرابِ علم کی لذت کشاں کشاں مجھ کو
نظر ہے ابرِ کرم پر، درختِ صحرا ہوں
کیا خدا نے نہ محتاجِ باغباں مجھ کو
فلک نشیں صفتِ مہر ہوں زمانے میں
تری دعا سے عطا ہو وہ نردباں مجھ کو
مقام ہم سفروں سے ہو اس قدر آگے
کہ سمجھے منزلِ مقصود کارواں مجھ کو
مری زبانِ قلم سے کسی کا دل نہ دُکھے
کسی سے شکوہ نہ ہو زیرِ آسماں مجھ کو
دلوں کو چاک کرے مثلِ شانہ جس کا اثر
تری جناب سے جیسی ملے فغاں مجھ کو
بنایا تھا جسے چن چن کے خار و خس میں نے
چمن میں پھر نظر آئے وہ آشیاں مجھ کو
پھر آرکھوں قدمِ مادر و پدر پہ جبیں
کیا جنھوں نے محبت کا رازداں مجھ کو
وہ شمعِ بارگہِ خاندانِ مرتضوی
رہے گا مثلِ حرم جس کا آستاں مجھ کو
نفس سے جس کے کھلی میری آرزو کی کلی
بنایا جس کی مروّت نے نکتہ داں مجھ کو
دعا یہ کر کہ خداوندِ آسماں و زمیں
کرے پھر اس کی زیارت سے شادماں مجھ کو
وہ میرا یوسفِ ثانی، وہ شمعِ محفلِ عشق
ہوئی ہے جس کی اخوت قرارِ جاں مجھ کو
جلا کے جس کی محبت نے دفترِ من و تو
ہوائے عیش میں پالا، کیا جواں مجھ کو
ریاضِ دہر میں مانندِ گل رہے خنداں
کہ ہے عزیز تر از جاں وہ جانِ جاں مجھ کو
شگفتہ ہو کے کلی دل کی پھول ہوجائے!
یہ التجائے مسافر قبول ہوجائے!

رام

لبریز ہے شرابِ حقیقت سے جامِ ہند
سب فلسفی ہیں خطۂ مغرب کے رامِ ہند
یہ ہندیوں کے فکرِ فلک رس کا ہے اثر
رفعت میں آسماں سے بھی اونچا ہے بامِ ہند
اس دیس میں ہوئے ہیں ہزاروں ملک سرشت

مشہور جن کے دَم سے ہے دنیا میں نامِ ہند
ہے رام کے وجود پہ ہندوستاں کو ناز
اہلِ نظر سمجھتے ہیں اس کو امامِ ہند
اعجاز اس چراغِ ہدایت کا ہے یہی
روشن تر از سحر ہے زمانے میں شامِ ہند
تلوار کا دھنی تھا، شجاعت میں فرد تھا
پاکیزگی میں، جوشِ محبت میں فرد تھا

نانک

قوم نے پیغامِ گوتم کی ذرا پروا نہ کی
قدر پہچانی نہ اپنے گوہرِ یک دانہ کی
آہ! بدقسمت رہے آوازِ حق سے بے خبر
غافل اپنے پھل کی شیرینی سے ہوتا ہے شجر
آشکار اُس نے کیا جو زندگی کا راز تھا
ہند کو لیکن خیالی فلسفے پر ناز تھا
شمعِ حق سے جو منور ہو یہ وہ محفل نہ تھی
بارشِ رحمت ہوئی لیکن زمیں قابل نہ تھی
آہ! شودر کے لیے ہندوستاں غم خانہ ہے
دردِ انسانی سے اس بستی کا دل بیگانہ ہے
برہمن سرشار ہے اب تک مئے پندار میں
شمعِ گوتم جل رہی ہے محفلِ اغیار میں
بت کدہ پھر بعد مدت کے مکر روشن ہوا ہے
نورِ ابراہیم سے آزر کا گھر روشن ہوا
پھر اٹھی آخر صدا توحید کی پنجاب سے
ہند کو اک مردِ کامل نے جگایا خواب سے

پھول

تجھے کیوں فکر ہے اے گل دلِ صد چاک بلبل کی
تو اپنے پیرہن کے چاک تو پہلے رفو کر لے
تمنا آبرو کی ہو اگر گلزارِ ہستی میں
تو کانٹوں میں الجھ کر زندگی کرنے کی خو کر لے
صنوبر باغ میں آزاد بھی ہے پا بہ گل بھی ہے
انھی پابندیوں میں حاصل آزادی کو تو کر لے
تنک بخشی کو استغنا سے پیغامِ خجالت دے
نہ رہ منّت کشِ شبنم، نگوں جام و سبو کر لے
نہیں یہ شانِ خودداری، چمن سے توڑ کر تجھ کو
کوئی دستار میں رکھ لے، کوئی زیبِ گلو کر لے
چمن میں غنچۂ گل سے یہ کہہ کر اڑ گئی شبنم
مذاقِ جورِ گلچیں ہو تو پیدا رنگ و بو کر لے
اگر منظور ہو تجھ کو خزاں نا آشنا رہنا
جہانِ رنگ و بو سے، پہلے قطعِ آرزو کر لے
اسی میں دیکھ مضمر ہے کمالِ زندگی تیرا
جو تجھ کو زینتِ دامن کوئی آئینہ رو کر لے

شیکسپیئر

شفقِ صبح کو دریا کا خرامِ آئینہ
نغمۂ شام کو خاموشیِ شام آئینہ
برگِ گل آئینہ عارضِ زیبائے بہار
شاہدِ مے کے لیے حجلۂ جام آئینہ
حسن آئینۂ حق اور دل آئینہ حسن
دلِ انساں کو ترا حسنِ کلام آئینہ
ہے ترے فکرِ فلک رس سے کمالِ ہستی
کیا تری فطرتِ روشن تھی مآلِ ہستی
تجھ کو جب دیدۂ دیدار طلب نے ڈھونڈا
تابِ خورشید میں خورشید کو پنہاں دیکھا
چشمِ عالم سے تو ہستی رہی مستور تری
اور عالم کو تری آنکھ نے عریاں دیکھا
حفظِ اسرار کا فطرت کو ہے سودا ایسا
رازداں پھر نہ کرے گی کوئی پیدا ایسا

سرمایہ و محنت

بندۂ مزدور کو جا کر مرا پیغام دے
خضر کا پیغام کیا، ہے یہ پیامِ کائنات
اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دارِ حیلہ گر
شاخِ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات
دستِ دولت آفریں کو مُزد یوں ملتی رہی
اہلِ ثروت جیسے دیتے ہیں غریبوں کی زکات
ساحر الموط نے تجھ کو دیا برگِ حشیش
اور تو اے بے خبر سمجھا اسے شاخِ نبات
نسل، قومیت، کلیسا، سلطنت، تہذیب، رنگ
خواجگی نے خوب چن چن کے بنائے مسکرات
کٹ مرا ناداں خیالی دیوتاؤں کے لیے
سُکر کی لذت میں تو لٹوا گیا نقدِ حیات
مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار
انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات
اٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

بالِ جبریل کا شعرِ اوّل

پھول کی پتّی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر
(بھرتری ہری)

دعا

(مسجدِ قرطبہ میں لکھی گئی)

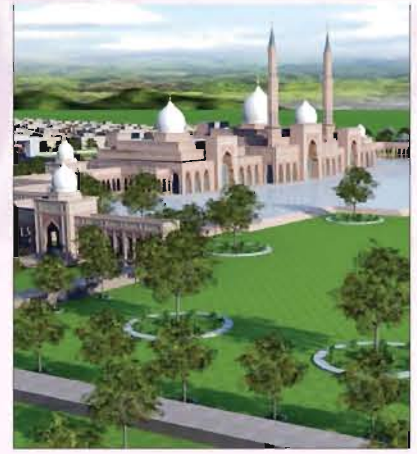

ہے یہی میری نماز، ہے یہی میرا وضو
میری نواؤں میں ہے میرے جگر کا لہو
صحبتِ اہلِ صفا، نور و حضور و سرور
سرخوش و پرسوز ہے لالہ لبِ آبجو
راہِ محبت میں ہے کون کسی کا رفیق
ساتھ مرے رہ گئی ایک مری آرزو
میرا نشیمن نہیں درگہِ میر و وزیر
میرا نشیمن بھی تو، شاخِ نشیمن بھی تو
تجھ سے گریباں مرا مطلعِ صبحِ نشور
تجھ سے مرے سینے میں آتشِ 'اللہ ہو'
تجھ سے مری زندگی سوز و تب و درد و داغ
تو ہی مری آرزو، تو ہی مری جستجو
پاس اگر تو نہیں، شہر ہے ویراں تمام
تو ہے تو آباد ہیں اجڑے ہوئے کاخ و کو
پھر وہ شرابِ کہن مجھ کو عطا کر کہ میں
ڈھونڈ رہا ہوں اُسے توڑ کے جام و سبو
چشمِ کرم ساقیا! دیر سے ہیں منتظر
جلوتیوں کے سبو، خلوتیوں کے کدو
تیری خدائی سے ہے میرے جنوں کو گلہ
اپنے لیے لامکاں، میرے لیے چارسو!
فلسفہ و شعر کی اور حقیقت ہے کیا
حرفِ تمنا، جسے کہہ نہ سکیں روبرو

لینن

(خدا کے حضور میں)

اے انفس و آفاق میں پیدا ترے آیات
حق یہ ہے کہ ہے زندہ و پائندہ تری ذات
میں کیسے سمجھتا کہ تو ہے یا کہ نہیں ہے
ہر دم متغیر تھے خرد کے نظریات
محرم نہیں فطرت کے سرودِ ازلی سے
بینائے کواکب ہو کہ دانائے نباتات
آج آنکھ نے دیکھا تو وہ عالم ہوا ثابت
میں جس کو سمجھتا تھا کلیسا کے خرافات
ہم بندِ شب و روز میں جکڑے ہوئے بندے
تو خالقِ اعصار و نگارندۂ آنات!
اک بات اگر مجھ کو اجازت ہو تو پوچھوں
حل کر نہ سکے جس کو حکیموں کے مقالات
جب تک میں جیا خیمۂ افلاک کے نیچے
کانٹے کی طرح دل میں کھٹکتی رہی یہ بات
گفتار کے اسلوب پہ قابو نہیں رہتا
جب روح کے اندر متلاطم ہوں خیالات
وہ کون سا آدم ہے کہ تو جس کا ہے معبود
وہ آدمِ خاکی کہ جو ہے زیرِ سماوات؟
مشرق کے خداوند سفیدانِ فرنگی
مغرب کے خداوند درخشندہ فلزات
یورپ میں بہت روشنی علم و ہنر ہے
حق یہ ہے کہ بے چشمۂ حیواں ہے یہ ظلمات
رعنائی تعمیر میں، رونق میں، صفا میں
گرجوں سے کہیں بڑھ کے ہیں بنکوں کی عمارات
ظاہر میں تجارت ہے، حقیقت میں جوا ہے
سود ایک کا لاکھوں کے لیے مرگِ مفاجات
یہ علم، یہ حکمت، یہ تدبر، یہ حکومت
پیتے ہیں لہو، دیتے ہیں تعلیمِ مساوات
بے کاری و عریانی و مے خواری و افلاس
کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کے فتوحات
وہ قوم کہ فیضانِ سماوی سے ہو محروم
حد اُس کے کمالات کی ہے برق و بخارات
ہے دل کے لیے موت مشینوں کی حکومت
احساسِ مروّت کو کچل دیتے ہیں آلات
آثار تو کچھ کچھ نظر آتے ہیں کہ آخر
تدبیر کو تقدیر کے شاطر نے کیا مات
میخانے کی بنیاد میں آیا ہے تزلزل
بیٹھے ہیں اسی فکر میں پیرانِ خرابات
چہروں پہ جو سرخی نظر آتی ہے سرِ شام
یا غازہ ہے یا ساغر و مینا کی کرامات
تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں
ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات
کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ؟
دنیا ہے تری منتظرِ روزِ مکافات!

فرمانِ خدا

(فرشتوں سے)

اُٹھو! مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخِ امرا کے در و دیوار ہلا دو
گرماؤ غلاموں کا لہو سوزِ یقیں سے
کنجشکِ فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو
سلطانیِ جمہور کا آتا ہے زمانہ
جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے، مٹا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی
اُس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو
کیوں خالق و مخلوق میں حائل رہیں پردے
پیرانِ کلیسا کو کلیسا سے اٹھا دو
حق را بسجودے صنماں را بطوافے
بہتر ہے چراغِ حرم و دَیر بجھا دو
میں ناخوش و بیزار ہوں مرمر کی سلوں سے
میرے لیے مٹی کا حرم اور بنا دو
تہذیبِ نوی کارگہِ شیشہ گراں ہے
آدابِ جنوں شاعرِ مشرق کو سکھا دو!

لا الٰہ الاّ اللہ

خودی کا سرِّ نہاں لا الٰہ الاّ اللہ
خودی ہے تیغ فساں لا الٰہ الاّ اللہ
یہ دور اپنے براہیم کی تلاش میں ہے
صنم کدہ ہے جہاں، لا الٰہ الاّ اللہ
کیا ہے تونے متاعِ غرور کا سودا
فریبِ سود و زیاں، لا الٰہ الاّ اللہ
یہ مال و دولتِ دنیا، یہ رشتہ و پیوند
بتانِ وہم و گماں، لا الٰہ الاّ اللہ
خرد ہوئی ہے زمان و مکاں کی زُنّاری
نہ ہے زماں نہ مکاں، لا الٰہ الاّ اللہ
یہ نغمہ فصلِ گل و لالہ کا نہیں پابند
بہار ہو کہ خزاں، لا الٰہ الاّ اللہ
اگرچہ بت ہیں جماعت کی آستینوں میں
مجھے ہے حکمِ اذاں، لا الٰہ الاّ اللہ

مدرسہ

عصرِ حاضر ملک الموت ہے تیرا، جس نے
قبض کی روح تری دے کے تجھے فکرِ معاش
دل لرزتا ہے حریفانہ کشاکش سے ترا
زندگی موت ہے، کھودیتی ہے جب ذوقِ خراش
اُس جنوں سے تجھے تعلیم نے بیگانہ کیا
جو یہ کہتا تھا خرد سے کہ بہانے نہ تراش
فیضِ فطرت نے تجھے دیدۂ شاہیں بخشا
جس میں رکھ دی ہے غلامی نے نگاہِ خفاش
مدرسے نے تری آنکھوں سے چھپایا جن کو
خلوتِ کوہ و بیاباں میں وہ اسرار ہیں فاش

آزادیِ نسواں

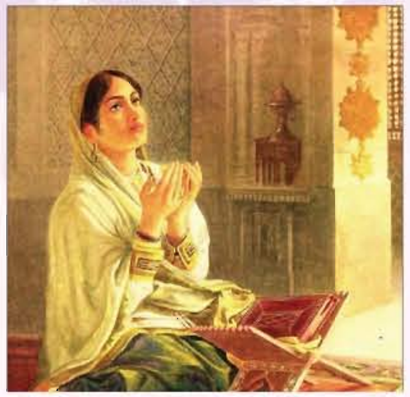

اس بحث کا کچھ فیصلہ میں کر نہیں سکتا
گو خوب سمجھتا ہوں کہ یہ زہر ہے، وہ قند
کیا فائدہ، کچھ کہہ کے بنوں اور بھی معتوب
پہلے ہی خفا مجھ سے ہیں تہذیب کے فرزند
اس راز کو عورت کی بصیرت ہی کرے فاش
مجبور ہیں، معذور ہیں، مردانِ خردمند
کیا چیز ہے آرائش و قیمت میں زیادہ
آزادیِ نسواں کہ زمرّد کا گلوبند!

حضرتِ انساں

جہاں میں دانش و بینش کی ہے کس درجہ ارزانی
کوئی شے چھپ نہیں سکتی کہ یہ عالم ہے نورانی
کوئی دیکھے تو ہے باریک فطرت کا حجاب اتنا
نمایاں ہیں فرشتوں کے تبسم ہائے پنہانی
یہ دنیا دعوتِ دیدار ہے فرزندِ آدم کو
کہ ہر مستور کو بخشا گیا ہے ذوقِ عریانی
یہی فرزندِ آدم ہے کہ جس کے اشکِ خونیں سے
کیا ہے حضرتِ یزداں نے دریاؤں کو طوفانی
فلک کو کیا خبر یہ خاکداں کس کا نشیمن ہے
غرض انجم سے ہے کس کے شبستاں کی نگہبانی
اگر مقصودِ کل میں ہوں تو مجھ سے ماورا کیا ہے
مرے ہنگامہ ہائے نو بہ نو کی انتہا کیا ہے

غزلیں

انوکھی وضع ہے سارے زمانے سے نرالے ہیں
یہ عاشق کون سی بستی کے یا رب رہنے والے ہیں
علاجِ درد میں بھی درد کی لذت پہ مرتا ہوں
جو تھے چھالوں میں کانٹے نوکِ سوزن سے نکالے ہیں
پھلا پھولا رہے یارب! چمن میری اُمیدوں کا
جگر کا خون دے دے کر یہ بوٹے میں نے پالے ہیں
رلاتی ہے مجھے راتوں کی خاموشی ستاروں کی
نرالا عشق ہے میرا نرالے میرے لالے ہیں
نہ پوچھو مجھ سے لذت خانماں برباد رہنے کی
نشیمن سیکڑوں میں نے بنا کر پھونک ڈالے ہیں
نہیں بیگانگی اچھی رفیقِ راہ منزل سے
ٹھہر جا اے شرر ہم بھی تو آخر مٹنے والے ہیں
امیدِ حور نے سب کچھ سکھا رکھا ہے واعظ کو
یہ حضرت دیکھنے میں سیدھے سادے بھولے بھالے ہیں
مرے اشعار اے اقبال! کیوں پیارے نہ ہوں مجھ کو
مرے ٹوٹے ہوئے دل کے یہ دردانگیز نالے ہیں

☆

ترے عشق کی انتہا چاہتا ہوں
میری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں
ستم ہو کہ ہو وعدۂ بے حجابی
کوئی بات صبر آزما چاہتا ہوں
یہ جنت مبارک رہے زاہدوں کو
کہ میں آپ کا سامنا چاہتا ہوں
ذرا سا تو دل ہوں مگر شوخ اتنا
وہی لن ترانی سُنا چاہتا ہوں
کوئی دم کا مہماں ہوں اے اہلِ محفل
چراغِ سحر ہوں بجھا چاہتا ہوں
بھری بزم میں راز کی بات کہہ دی
بڑا بے ادب ہوں سزا چاہتا ہوں

☆

پریشاں ہو کے میری خاک آخر دل نہ بن جائے
جو مشکل اب ہے یارب پھر وہی مشکل نہ بن جائے
نہ کر دیں مجھ کو مجبورِ نوا فردوس میں حوریں!
مرا سوزِ دروں پھر گرمیِ محفل نہ بن جائے
کبھی چھوڑی ہوئی منزل بھی یاد آتی ہے راہی کو
کھٹک سی ہے جو سینے میں غمِ منزل نہ بن جائے
بنایا عشق نے دریائے ناپیدا کراں مجھ کو!
یہ میری خود نگہداری مرا ساحل نہ بن جائے

کہیں اس عالمِ بے رنگ و بو میں بھی طلب میری
وہی افسانۂ دُنبالۂ محمل نہ بن جائے
عروجِ آدم خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہِ کامل نہ بن جائے

☆

خرد کے پاس خبر کے سوا کچھ اور نہیں
ترا علاج نظر کے سوا کچھ اور نہیں
ہر اک مقام سے آگے مقام ہے تیرا
حیات ذوقِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں
گراں بہا ہے تو حفظ خودی سے ہے ورنہ
گہر میں آب گہر کے سوا کچھ اور نہیں
رگوں میں گردشِ خون ہے اگر تو کیا حاصل
حیات سوز جگر کے سوا کچھ اور نہیں
عروسِ لالہ! مناسب نہیں ہے مجھ سے حجاب
کہ میں نسیمِ سحر کے سوا کچھ اور نہیں
جسے کساد سمجھتے ہیں تاجرانِ فرنگ
وہ شے متاعِ ہنر کے سوا کچھ اور نہیں
بڑا کریم ہے اقبال بے نوا لیکن
عطائے شعلہ شرر کے سوا کچھ اور نہیں

ظریفانہ

☆

یہ کوئی دن کی بات ہے اے مرد ہوش مند
غیرت نہ تجھ میں ہوگی، نہ زن اوٹ چاہے گی
آتا ہے اب وہ دور کے اولاد کے عوض
کونسل کی ممبری کے لیے ووٹ چاہے گی

☆

کچھ غم نہیں جو حضرت واعظ ہیں تنگ دست
تہذیب نو کے سامنے سر اپنا خم کریں
رد جہاد میں تو بہت کچھ لکھا گیا
تردید حج میں کوئی رسالہ رقم کریں

☆

انتہا بھی اس کی ہے؟ آخر خریدیں کب تلک
چھتریاں، رومال، مفلر، پیرہن جاپان سے
اپنی غفلت کی یہی حالت اگر قائم رہی
آئیں گے غسال کابل سے، کفن جاپان سے

☆

ہم مشرق کے مسکینوں کا دل مغرب میں جا اٹکا ہے
واں کنٹر سب بلوری ہیں یاں ایک پرانا مٹکا ہے
اس دور میں سب مٹ جائیں گے، ہاں! باقی وہ رہ جائے گا
جو قائم اپنی راہ پہ ہے اور پکا اپنی ہٹ کا ہے
اے شیخ و برہمن، سنتے ہو! کیا اہل بصیرت کہتے ہیں
گردوں نے کتنی بلندی سے ان قوموں کو دے پٹکا ہے
یا باہم پیار کے جلسے تھے، دستور محبت قائم تھا
یا بحث میں اردو ہندی ہے یا قربانی یا جھٹکا ہے

☆

ہاتھوں سے اپنے دامنِ دنیا نکل گیا
رخصت ہوا دلوں سے خیالِ معاد بھی
قانونِ وقف کے لیے لڑتے تھے شیخ جی
پوچھو تو، وقف کے لیے ہے جائداد بھی!

☆

وہ مس بولی ارادہ خودکشی کا جب کیا میں نے
مہذّب ہے تو اے عاشق! قدم باہر نہ دھر حد سے
نہ جرأت ہے، نہ خنجر ہے تو قصدِ خودکشی کیسا
یہ مانا دردِ ناکامی گیا تیرا گزر حد سے
کہا میں نے کہ اے جانِ جہاں کچھ نقد دِلوا دو
کرائے پر منگالوں گا کوئی افغان سرحد سے

☆

ناداں تھے اس قدر کہ نہ جانی عرب کی قدر
حاصل ہوا یہی، نہ بچے مار پیٹ سے
مغرب میں ہے جہازِ بیاباں شُتر کا نام
تُرکوں نے کام کچھ نہ لیا اس فلیٹ سے

☆

ممبری امپیریل کونسل کی کچھ مشکل نہیں
ووٹ تو مل جائیں گے، پیسے بھی دلوائیں گے کیا؟
میرزا غالب، خدا بخشے، بجا فرما گئے
"ہم نے یہ مانا کہ دلّی میں رہیں، کھائیں گے کیا؟"

☆

دلیلِ مہر و وفا اس سے بڑھ کے کیا ہوگی
نہ ہو حضور سے اُلفت تو یہ ستم نہ سہیں
مُصر ہے حلقہ، کمیٹی میں کچھ کہیں ہم بھی
مگر رضائے کلکٹر کو بھانپ لیں تو کہیں
سند تو لیجیے، لڑکوں کے کام آئے گی
وہ مہربان ہیں اب پھر رہیں رہیں نہ رہیں
زمین پر تو نہیں ہندیوں کو جا ملتی
مگر جہاں میں ہیں خالی سمندروں کی تہیں
مثال کشتیِ بے حس مطیعِ فرماں ہیں
کہو تو بستۂ ساحل رہیں، کہو تو بہیں

☆

رات مچھر نے کہہ دیا مجھ سے
ماجرا اپنی ناتمامی کا
مجھ کو دیتے ہیں ایک بوند لہو
صلہ شب بھر کی تشنہ کامی کا
اور یہ بسوہ دار، بے زحمت
پی گیا سب لہو اسامی کا

☆

جان جائے ہاتھ سے جائے نہ ست
ہے یہی اک بات ہر مذہب کا تَت
چٹّے بٹّے ایک ہی تھیلی کے ہیں
ساہوکاری، بِسوہ کاری، بِسوہ داری، سلطنت

☆

تکرار تھی مزارع و مالک میں ایک روز
دونوں یہ کہہ رہے تھے، مرا مال ہے زمیں
کہتا تھا وہ، کرے جو زراعت اُسی کا کھیت
کہتا تھا یہ کہ عقل ٹھکانے تری نہیں
پوچھا زمیں سے میں نے کہ ہے کس کا مال تو
بولی مجھے تو ہے فقط اس بات کا یقیں
مالک ہے یا مزارعِ شوریدہ حال ہے
جو زیرِ آسماں ہے وہ دھرتی کا مال ہے

☆

مسجد تو بنادی شب بھر میں ایماں کی حرارت والوں نے
من اپنا پرانا پاپی ہے، برسوں میں نمازی بن نہ سکا
کیا خوب امیر فیصل کو سنوسی نے پیغام دیا
تو نام ونسب کا حجازی ہے پر دل کا حجازی بن نہ سکا
تر آنکھیں تو ہو جاتی ہیں، پر کیا لذت اس رونے میں
جب خون جگر کی آمیزش سے اشک پیازی بن نہ سکا
اقبال بڑا اپدیشک ہے من باتوں میں موہ لیتا ہے
گفتار کا یہ غازی تو بنا، کردار کا غازی بن نہ سکا

بخطِ اقبال

☆

لوح بھی تو قلم بھی تو تیرا وجود الکتاب
گنبد آبگینہ رنگ تیرے محیط میں حباب
عالم آب و خاک میں تیرے ظہور کا فروغ
ذرۂ ریگ کو دیا تو نے طلوع آفتاب
شوکت سنجروسلیم تیرے جلال کی نمود
فقر جنیدوبایزید تیرا جمال بے نقاب
شوق ترا اگر نہ ہو میری نماز کا امام
میرا قیام بھی حجاب میرا سجود بھی حجاب
تیری نگاہ ناز سے دونوں مراد پا گئے
عقل، غیاب و جستجو، عشق حضور و اضط

نصیر احمد خان

زبان کے مختلف معیار

مشہور ماہر لسانیات بلوم فیلڈ کا خیال ہے کہ ایک زبان کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پہلی قسم 'ادبی معیار' کی زبان ہے۔ اس کا تعلق بول چال اور تحریر کی بنیادی شکل ہے جو بلاتفریق برادری، فرقہ، علاقہ اور سماجی گروہ پورے ادبی سماج کے لیے قابل قبول ہوتی ہے۔ یہ عام تعلیم کے ذریعے رواج پاتی ہے۔ مثال کے طور پر کشمیر سے لے کر کنیاری کماری اور آسام سے لے کر گجرات تک ہندوستان میں اور پاکستان کے مختلف علاقوں جیسے کراچی، حیدرآباد سندھ، لاہور، پیشاور وغیرہ میں جو اردو ادبی سطح پر ضبطِ تحریر میں لائی جاتی ہے اور جسے اردو سماج کے مہذب اور شائستہ لوگ بولتے اور کالجوں و یونیورسٹیوں میں پڑھاتے ہیں اسے ہم ادبی معیار کی اردو کہہ سکتے ہیں۔

دوسری قسم میں زبان کا 'عام فہم معیار' آتا ہے جو زبان کے شائستہ طبقے کے عام فہم اسلوب سے عبارت ہے یعنی زبان کے بولنے والے سماج کا وہ حصہ جو نہ صرف تعلیم یافتہ ہے، مہذب ہے بلکہ جو زبان کو اپنی روزمرہ کی زندگی میں استعمال بھی کرتا ہے۔ زبان کی یہ بول چال اس زبان کا عام فہم معیار کہلاتی ہے۔ اس قسم میں شمالی ہندوستان میں اتر پردیش اور بہار وغیرہ مغربی ہندوستان میں مہاراشٹر (بمبئی، اورنگ آباد، ناگپور وغیرہ)، راجستھان (جے پور، اودے پور وغیرہ) وسطی ہندوستان میں (بھوپال، گوالیار وغیرہ) اور پاکستان کے مختلف علاقوں کو شامل کر سکتے ہیں۔ یہاں اردو کو مادری زبان کہنے والے تعلیم یافتہ لوگ اپنی روزمرہ کی زندگی میں اسے استعمال کرتے ہیں۔

تیسری قسم 'علاقائی معیار' کی ہے۔ اس ضمن میں زبان کی ایسی شکل شمار کی جاسکتی ہے جو عام فہم معیار کی زبان سے کم و بیش مماثلت رکھتی ہو۔ یہ کم و بیش مماثلت اس بات پر منحصر ہے کہ زبان اپنے سماج کے کس حصے میں بولی جارہی ہے۔ ہندوستان، بنگلہ دیش اور پاکستان کے مختلف علاقوں اور صوبوں میں اردو بولی جاتی ہے۔ کشمیر میں جس طرح اردو بولی جاتی ہے اس کا اپنا معیار ہے۔ مشرقی و مغربی پنجاب میں اردو بولنے کا معیار دوسرا ہے۔ سندھ کی اردو کا معیار مہاراشٹر، گجرات اور راجستھان کے علاقوں کی اردو سے الگ ہے۔ تلنگانہ (حیدر آباد وغیرہ) کی اردو دراویڑی خاندان ہی کی زبان کرناٹک یا تامل ناڈو میں کنڑی یا تاملی اردو کے مقابلے میں مختلف معیار رکھتی ہے۔ مشرقی اور مغربی بنگال کی اردو کا معیار بہار میں رائج اردو کے معیار سے جداگانہ ہے۔ مدھیہ پردیش، اتر پردیش اور ہماچل پردیش کی اردو کے معیاروں کو ایک دوسرے کے مقابلے میں بھی الگ الگ پہچانا جاسکتا ہے۔ یہ ان گنت اردو کے معیار علاقائی حد بندیوں کا نتیجہ ہیں جو علاقائی زبانوں یا بولیوں سے متاثر ہوکر قائم ہوئے ہیں۔

چوتھی قسم میں 'پست معیار' زبان آتی ہے جسے واضح طور پر ادبی معیار، عام فہم معیار اور علاقائی معیار جیسی زبان کی مختلف شکلوں سے بآسانی الگ کیا جاسکتا ہے۔ زبان میں یہ فرق مختلف سماجی گروہوں یا جغرافیائی حالات کی وجہ سے رونما ہوتا ہے۔ سماج کے پس ماندہ لوگ اپنی زبان کو بگاڑ کر بولتے ہیں۔ زبان کی ساخت کے اصولوں سے وہ بے نیاز ہوتے ہیں۔ تلفظ خواہ وہ آواز سے متعلق ہو یا لفظ سے اور زبان کی قواعد ان کے یہاں کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ ایسے لوگوں میں خاص طور پر نچلے طبقے کے مزدور پیشہ لوگ آتے ہیں۔ اس طرح سماجی بولیاں جنم لیتی ہیں؛ جیسے اردو کی کرخنداری بولی جو دہلی میں جامع مسجد کے آس پاس کے رہنے والے خصوصاً کم پڑھے لکھے یا جاہل لوگ بولتے ہیں۔ اِن میں دست کار، روزانہ کی اجرت پر کام کرنے والے مزدور، خوانچہ والے اور دوسرے غیر ترقی یافتہ لوگ شامل ہیں۔ پست معیار میں زبان کی وہ بولیاں بھی آجاتی ہیں جو معیاری زبان سے رابطہ ٹوٹنے یا علاقائی معیار سے ہٹ کر دور دراز علاقوں میں بولی جاتی ہیں۔

زبان کے معیار کی آخری قسم کو 'دیسی معیار' کے نام سے پکارا جاسکتا ہے۔ زبان کی یہ قسم سماج کے دوسرے بولنے والوں کے لیے اس وقت تک ناقابلِ فہم ہوتی ہے جب تک کہ ذاتی طور پر اس سے واقفیت نہ ہو۔ اس کے ذیل میں کلکتیا اردو اور دکنی اردو کو شمار کر سکتے ہیں۔ اگر ہم ان اردو بولیوں کے عام بولنے والوں کی بول چال کا جائزہ لیں تو اس وقت تک باقاعدہ سمجھنے سے قاصر رہیں گے جب تک کہ ان بولیوں سے ہماری پہلے سے تھوڑی بہت واقفیت نہ ہو۔ زبان کی اس قسم کی جھلکیاں بعض گھرانوں کی مخصوص بولیوں میں بھی دیکھنے کو مل جاتی ہیں۔■

غضنفر

اردو، درس و تدریس میں لغات کا کردار

اس موضوع پر ایک ایسا سبق تیار کیا جا رہا ہے جس کا اطلاق جماعت میں ایک استاد عملی طور پر کرسکتا ہے۔ اس سبق کی تیاری میں اس بات کا خاص خیال رکھا گیا ہے کہ کلاس روم میں دلچسپ تدریسی فضا قائم کی جاسکے اور طلبہ استاد کو سننے کے لیے آمادہ ہوسکیں۔

استاد: ''(ایک ڈبّا میز پر رکھتے ہوئے) اس ڈبے میں کچھ پرچیاں ہیں۔ آپ میں سے کچھ لوگ باری باری سے یہاں آئیں اور پرچی نکال کر اسے پڑھیں۔''

(ایک طالب علم میز کے پاس پہنچتا ہے، پرچی نکالتا ہے اور پرچی پر لکھی تحریر کو پڑھتا ہے)

پہلا طالب علم:

تم انجمن میں رات عجب آن سے گئے
بسمل کئی پڑے ہیں کئی جان سے گئے

[استاد اس شعر کو بلیک بورڈ کے دائیں جانب جلی حروف میں لکھ دیتا ہے]

دوسرا طالب علم آگے بڑھتا ہے پرچی نکالتا ہے اور تحریر پڑھتا ہے:

ہر اک آن رہتا ہے اب دھیان تیرا
نہیں دھیان جاتا کسی آن تیرا
(معروف)

[استاد اس شعر کو دہراتے ہوئے بلیک بورڈ کے بائیں جانب لکھ دیتا ہے۔]

دوسرے کے بعد ایک تیسرا طالب علم آگے بڑھ کر پرچی نکالتا ہے اور پرچی پر درج تحریر پڑھتا ہے:

لوگ ہی آن کے یکجا مجھے کرتے ہیں کہ میں
ریت کی طرح بکھر جاتا ہوں تنہائی میں
(ظفر اقبال)

[استاد اس شعر کو بھی دہراتا ہے اور بلیک بورڈ پر اوٗپر کی جانب لکھ دیتا ہے آخر میں ایک اور طالب علم ڈبے کے پاس پہنچتا ہے اور اس میں بچی ہوئی آخری پرچی کو نکال کر پڑھتا ہے:

مفلس کی کچھ نظر نہیں رہتی ہے آن پر
دیتا ہے اپنی جان وہ اک ایک نان پر
(نظیر)

[استاد اس شعر کو بھی دہراتا ہے اور اسے بلیک بورڈ کے نچلے حصّے پر تحریر فرما دیتا ہے۔]

استاد: (طلبہ سے مخاطب ہوکر) آپ نے ان چاروں شعروں کو سنا اور اب آپ انھیں بلیک بورڈ پر بھی دیکھ رہے ہیں۔ آپ کو بتانا یہ ہے کہ ان شعروں میں کون سا لفظ مشترک ہے یعنی کون سا ایسا لفظ ہے جو سب میں موجود ہے؟''

طلبہ: ''آن''

طلبہ کی آوازوں سے کلاس روم گونج پڑتا ہے:

استاد: جی ہاں، آپ نے صحیح پہچانا۔ ''آن'' سب میں موجود ہے۔ اب آپ سے میرا دوسرا سوال یہ ہے کہ اس لفظ کے معنی کیا ہیں؟''

ایک طالب علم: ''گھڑی، لمحہ''

دوسرا طالب علم: ''آن بان، ادا''

استاد: ''اور کوئی معنی''

طلبہ خاموش رہتے ہیں۔

استاد: ''اچھا، اب آپ کوئی ایسا شعر پڑھیے جس میں آن گھڑی یا لمحہ کے معنی میں استعمال ہوا ہو۔''

ایک طالب علم:

دل بھی تیرے ہی ڈھنگ سیکھا ہے
آن میں کچھ ہے آن میں کچھ ہے

استاد: بالکل صحیح جواب، اب میں ایک شعر پڑھتا ہوں، آپ کو بتانا ہے کہ اس میں آن کس معنے میں استعمال ہوا ہے؟ شعر سناتا ہوں، غور سے سنیے:

یا مست کو بے وصل تھی اک آن قیامت
یا برسوں جدائی میں گزر جاتے ہیں کیسے

طلبہ: سر! اس شعر میں بھی آن گھڑی یا لمحہ کے معنی میں استعمال ہوا ہے

استاد: آپ درست فرما رہے ہیں۔ اس میں بھی ''آن'' وقت کے معنی میں آیا ہے۔ اب آپ کوئی ایسا شعر پڑھیے جس میں ''آن'' عزّت و آبرو کے معنی میں استعمال ہوا ہو''

طلبہ: ''محبوب کے ناز و ادا کے معنی میں۔''

استاد: بالکل صحیح۔ اس میں یہ لفظ ادائے معشوق کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ آپ کو کوئی ایسا شعر یاد ہے جس میں ''آن'' معشوقانہ چھب یعنی محبوب کے ناز و انداز کے معنی میں استعمال ہوا ہو؟

وقفہ

لوگ ہی آن کے یکجا مجھے کرتے ہیں کہ میں
ریت کی طرح بکھر جاتا ہوں تنہائی میں

تم انجمن میں رات عجب آن سے گئے
بسمل کئی پڑے ہیں آئی جان سے گئے

ہر اک آن رہتا ہے اب دھیان تیرا
نہیں دھیان جاتا کسی آن تیرا

مفلس کی کچھ نظر نہیں رہتی ہے آن پر
دیتا ہے اپنی جان ایک ایک نان پر

''**ایک طالب علم:**

مفلس کی کچھ نظر نہیں رہتی ہے آن پر
دیتا ہے اپنی جان وہ اک ایک نان پر

استاد: بالکل صحیح جواب دیا آپ نے۔ اس شعر میں ''آن'' واقعی عزّت و آبرو کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ لیکن کیا آپ کو معلوم ہے کہ یہ لفظ دو اور معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے اور ان کی مثالیں بھی بلیک بورڈ پر موجود ہیں۔ مثلاً بلیک بورڈ کے اوپری حصّے پر جو شعر دکھائی دے رہا ہے یعنی:

لوگ ہی آن کے یکجا مجھے کرتے ہیں کہ میں
ریت کی طرح بکھر جاتا ہوں تنہائی میں

میں ''آن'' لفظ آنا کے مخفّف کے طور پر آیا ہے یا حاصل بالمصدر کے روپ میں۔ اس معنی میں ایک اور شعر سنیے:

کچھ ڈر ہے اِدھر آؤ اور ایک آن نہ بیٹھو
ہٹ کر یہ کہا تم کہیں پاس آن نہ بیٹھو

یعنی کہیں پاس آکر نہ بیٹھ جاؤ، اور اب بورڈ کے نیچے جو شعر درج ہے اسے دیکھیے۔ اس میں لفظ ''آن'' محبوب کے ناز و ادا کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ ہے کہ نہیں؟

طلبہ: ''جی ہاں''

استاد: اب میں ایک اور شعر پڑھتا ہوں آپ بتائیے کہ اس میں آن کس معنے میں استعمال ہوا ہے؟:

سودا جو ترا حال ہے اتنا تو نہیں وہ
کیا جانیے، تو نے اسے کس آن میں دیکھا

استاد: لگتا ہے آپ میں سے کسی کو اس معنی و مفہوم کا کوئی شعر یاد نہیں تو لیجیے آپ کی طرف سے بھی میں ہی سنا دیتا ہوں:

ہزار تن کے چلیں، بانکے خوبرو لیکن
کسی میں آن نہیں تیری بانکپن کی سی
(نظیر)

تو اب تک آپ نے دیکھا کہ ''آن'' لفظ ایک ہے مگر اس کے معنی کئی ہیں اور آپ نے ''آن'' کا مختلف معنوں میں محلِ استعمال بھی دیکھا اور وہ بھی شعروں میں۔

لفظِ ''آن'' کس کس معنے میں استعمال ہوتا ہے اور اس کے محلِ استعمال میں جو یہ شعر سنائے گئے آپ کو معلوم ہے یہ ساری تفصیلات کہاں سے ملیں؟۔

طالب علم: ''سر، لغت سے ملی ہوں گی''۔

استاد: ''بالکل صحیح جواب دیا۔ آپ کا اندازہ صدفی صد درست ہے۔ میں نے یہ ساری تفصیلات ایک لغت 'فرہنگِ آصفیہ' سے حاصل کی ہیں''۔

دوستو! یہ لغت بڑے کام کی چیز ہے۔ اگر ہم اس کے ہمراہ ہولیں تو یہ ہمارے تدریسی سفر کا خضر ثابت ہوسکتی ہے۔ کیوں کہ لغات کے پاس لفظ و معنی کو سمجھنے سمجھانے، لفظ کی حقیقت کو بتانے اور معنی کی گرہیں کھولنے اور اس کی مختلف دِشاؤں اور دَشاؤں کو دکھانے کے لیے ایک ایسا آلہ موجود ہے جسے قطب نما سے تشبیہ دی جاسکتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں لغات الفاظ کا خزینہ اور معانی کا گنجینہ ہوتی ہیں جو استاد اور طلبہ کے ذخیرۂ الفاظ میں اضافہ کرکے دونوں کی زبان و بیان کو بہتر، مالا مال اور موثر بناتی ہیں۔ لغات صرف لفظ کے مختلف معانی ہی فراہم نہیں کرتیں اور محض ان کے محلِ استعمال ہی نہیں بتاتیں بلکہ لفظ کے مترادفات، قواعدی زمرات، اشتقاق، مآخذات اور دیگر تفصیلات سے بھی روشناس کراتی ہیں۔ یعنی لغات یہ بھی بتاتی ہیں کہ کسی لفظ کے کیا کیا مترادفات ہیں؟ کوئی لفظ مذکر ہے یا مونث، واحد ہے یا جمع۔ اسم ہے، صفت ہے یا کیا ہے؟ وہ کس زبان کا ہے؟ ابھی تک ہم نے لفظ ''آن'' کے متعلق یہ جانا کہ یہ لفظ کئی معنوں میں استعمال ہوتا ہے اور ایک ایک معنی کے محلِ استعمال کو شعروں کی زبان میں سمجھا، اب ہم یہ دیکھیں گے کہ اس لفظ کے مختلف معنوں میں کیا کیا مترادفات ہیں؟

آن: بمعنی وقت، لمحہ، گھڑی، لحظہ، ساعت، دم، پل، چھن، منٹ

آن: (بمعنی عزّت)، آبرو، حرمت، مرتبہ، درجہ

آن: بمعنی مخففِ آنا یا حاصل بالمصدر، آنا مصدر سے ماضی کی ایک ناتمام صورت جو دوسرے فعل کے ساتھ مل کر کام دیتی ہے۔ جیسے آن پڑا، آن دبا، آن پھرنا مثلاً کبھی ادھر بھی تو آن پھرا کرو۔ وہ بھول کر بھی نہیں آن پھرے۔ سارا کام مجھ اس غریب پر آن پڑا۔ وہ قدموں میں آن پڑا:

آن پہنچی سر گردابِ فنا کشتی عمر
ہر نفس بادِ مخالف کا ہے جھونکا ہم کو

آن ملنا: دیپک سنگ پتنگا ناچے بھائے مورے کنگنا، اب آن ملو سجنا

رہتی ہے فکرِ تازہ مضامیں کی منتظر
اس گھر میں آنکلتے ہیں مہماں نئے نئے
(شیفتہ)

آن لگنا:

نگہہ کا وار تھا، دل پر پھڑکنے جان لگی
چلی تھی برچھی کسی پر کسی کے آن لگی
(ذوق)

آن کے:

کہے تو کہ شب چاندنے آن کے
نکالا ہے منہہ کھیت سے دھان کے
(میر حسن)

آن: بمعنی معشوقانہ چھب، شان، ادا، ناز و انداز، انداز، ادائے معشوق، اندازِ محبوب

آن: بمعنی سوگندھ، قسم، عہد، پرتگیا،

آن کے مختلف معنوں میں کیا کیا مترادف الفاظ ہیں یہ دیکھنے کے بعد آیئے اب ہم یہ دیکھیں کہ یہ لفظ کس زبان کا ہے؟ لغت یہ بھی بتاتی ہے کہ یہ لفظ فارسی بھی ہے، اردو بھی، اور ہندی بھی، مثلاً آن اگر ادائے معشوق یا اندازِ محبوب کے معنی میں

ستعمال ہوا ہے تو یہ فارسی ہے۔

آن اگر لمحہ اور ساعت کے معنے میں آیا ہے تو یہ عربی ہے۔

آن اگر قسم عہد، یا سوگندھ کے معنی میں استعمال ہوا ہے تو یہ ہندی ہے۔

آن بمعنی ہٹ، ہٹیلا پن اگر استعمال ہوا ہے تو یہ ہندی ہے۔ جیسے وہ اپنی آن نہ چھوڑے گا تم اپنی بان نہ چھوڑو

آن اگر آنا کے مخفف کے طور پر یا کسی فعل کے ساتھ جڑ کر استعمال ہوتا ہے۔

تو یہ اردو کا لفظ کہلائے گا۔

لغت یہ بھی بتاتی ہے کہ کسی لفظ کا قواعدی زمرہ کیا ہے؟ یعنی وہ لفظ اسم ہے، صفت ہے، فعل ہے، یا کچھ اور؟ آیئے دیکھیں کہ "آن" کیا ہے؟ یہ لفظ اسم ہے البتہ جہاں آنا مصدر سے ماضی کی ایک نا تمام صورت جو دوسرے فعل کے ساتھ مل کر کام دیتی ہے، وہاں یہ لفظ فعل لازم بن جاتا ہے۔

آن، عربی، فارسی، ہندی اور اردو ہر جگہ مونث ہے جیسے۔

اس کو منظور ہے پھر آن دکھانی اپنی
دیکھیے حال مرا ہوتا ہے اک آن میں کیا

(ظفر)

-فارسی-(انداز) مونث

دشنام دے کے ہائے وہ جمدھر کا کھینچنا
چبھتی ہے مرے دل میں وہی آن، آن آن

عربی (لمحہ) مونث

کچھ نئی ہے حسن والوں کی بھی یارب آن بان
ہے الگ دنیا سے ان بانکے جوانوں کی طرح

اُردو (شان وشوکت) مونث

ایک لفظ دوسرے لفظ سے مل کر جب استعمال ہوتا ہے تو کیسے کیسے نئے معنی پیدا ہوتے ہیں، لغت یہ منظر بھی دکھاتی ہے، مثلاً لفظ آن جب بان کے ساتھ ملتا ہے تو کون سا معنی نکلتا ہے اور یہ آن' جب تان سے ملتا ہے تو کیا بنتا ہے؟

آن جب بان سے ملتا ہے تو شان وشوکت کا سماں بندھتا ہے۔ ٹھاٹ باٹ کا منظر نظر آتا ہے۔ مثلاً:

کھڑے شاخ شبو کے ہر جا نشاں
مدن بان کی اور ہی آن بان

(میر حسن)

کون سے بت میں آن بان نہیں
بے نیازی کی کس میں شان نہیں

(رند)

دل ہجومِ الم سے نکلا خوب
اور بڑی آن بان سے نکلا

(آرزو لکھنوی)

حسن کی آن تان ہائے غضب
بے نیازی کی شان ہائے غضب

(داغ)

آن کے ساتھ ماننا جوڑ دیتے ہیں تو یہ لفظ اپنا لوہا منوانے لگتا ہے۔ مثلاً:

دیکھ کر کرتی گلے میں سبز دھانی آپ کی
دھان کے بھی کھیت نے اب آن مانی آپ کی

(نظر)

"ققنس ایک نہایت خوش رنگ اور خوش آواز پرندے کا نام جس کی نسبت اہلِ لغات کا بیان ہے کہ اس کی چونچ میں، 360 سوراخ ہوتے ہیں اور ان میں سے ایک ایک راگ نکلتا ہے۔ جب اسے بھوک لگتی ہے تو کسی بلند پہاڑ پر ہوا کے رخ ہو بیٹھتا ہے جس کے سبب عجیب و غریب سر نکلتے اور ان کی آواز پر بہت سے پرندے فریفتہ ہو کر اکٹھے ہوجاتے ہیں اور یہ ان میں سے دو چار کو پکڑ کر چٹ کر جاتا ہے۔ اس کی عمر ہزار سال کی ہوتی ہے اور جوڑا نہیں ہوتا۔

اور جب آن کے ساتھ پڑنا لگادیتے ہیں تو یہ مصیبت واقع ہوجاتی ہے یا پتا پڑ جاتی ہے۔ جیسے:

چپ رہتے رہتے آن پڑی اپنی جان پر
تو بھی نہ لائے ہم ترا شکوہ زبان پر

(موزوں)

آن کے ہمراہ جب لگنا کو لگا دیتے ہیں تو کسی کے پاس آجانے یا قریب آنے کا معنی نکلنے لگتا ہے جیسے:

نگہہ کا وار تھا دل پر پھڑکنے جان لگی
چلی تھی برچھی کسی پر کسی کے آن لگی

(ذوق)

قصّہ مختصر یہ کے آن کے ساتھ درجنوں لفظ جوڑے جاتے ہیں اور ہر لفظ ایک نئے معنی سے ہمیں متعارف کراتا جاتا ہے اور یہ ساری معلومات ہمیں لغات سے حاصل ہوتی ہیں۔

اسی طرح لغت کچھ ایسی تفصیلات بھی فراہم کرتی ہے جو کہیں اور دستیاب نہیں۔ مثلاً ققنس کے بارے میں عام طور پر لوگ یہ جانتے ہیں کہ یہ ایک خیالی پرندہ ہے جو اپنے خاکستر سے پیدا ہوتا ہے مگر لغات ققنس کے بارے میں یہ بھی بتاتی ہیں کہ:

"ققنس ایک نہایت خوش رنگ اور خوش آواز پرندے کا نام جس کی نسبت اہلِ لغات کا بیان ہے کہ اس کی چونچ میں، 360 سوراخ ہوتے ہیں اور ان میں سے ایک ایک راگ نکلتا ہے۔ جب اسے بھوک لگتی ہے تو کسی بلند پہاڑ پر ہوا کے رخ ہو بیٹھتا ہے جس کے سبب عجیب و غریب سر نکلتے اور ان کی آواز پر بہت سے پرندے فریفتہ ہو کر اکٹھے ہوجاتے ہیں اور یہ ان میں سے دو چار کو پکڑ کر چٹ کر جاتا ہے۔ اس کی عمر ہزار سال کی ہوتی ہے اور جوڑا نہیں ہوتا۔ جب پورے ہزار برس گزر جاتے ہیں تو اس کی عمرِ طبعی اخیر ہوجاتی ہے۔ اس وقت یہ بہت سی سوکھی لکڑیاں جمع کرتا اور ان پر بیٹھ کر مستی کے عالم میں گاتا اور پروں کو جھڑ جھڑاتا ہے۔ جس وقت دیپک راگ اس کی چونچ سے نکلتا ہے تو ان لکڑیوں میں آگ لگ جاتی اور یہ جل کر راکھ ہوجاتا ہے۔ خدا کی قدرت سے اس راکھ پر مینہہ برستا اور اس میں از خود انڈا پیدا ہوجاتا ہے۔ کچھ مدت کے بعد پھر اس میں سے ققنس پیدا ہوتا اور پرورش پاتا ہے۔" کہتے ہیں حکمانے علم موسیقی اسی سے حاصل کیا ہے اس اصل صورت میں موسیقار بھی اسی کو کہتے ہیں۔

(فرہنگِ آصفیہ جلد دوم، چوتھا ایڈیشن 1998، ص 1479 اور 1480)

ھُما۔ ف۔اسم مذکّر: ایک مشہور پرند کا نام جو ہڈّیاں کھاتا اور کسی کو نہیں ستاتا۔ اس جانور کی نسبت ایشیائی لوگوں کا خیال ہے کہ جس کے سر پر یہ جانور پھر جائے وہ بادشاہ ہوجائے یعنی دولت اور سلطنت پائے۔ چنانچہ اس پرند کو مبارک خیال کر کے شاہانِ ایران اپنے جھنڈوں پر اس کی تصویر بنایا کرتے تھے بعض لوگ اسی کو عنقا خیال کرتے اور سب پرندوں کا بادشاہ مانتے ہیں۔

(فرہنگِ آصفیہ، جلد چہارم، ترقی اردو بورڈ اڈیشن 1974 ص 729)

درس و تدریس میں لغات مندرجہ ذیل طریقے سے اپنا کردار نبھاتی ہیں:

1. لفظ کے معنی دیتی ہیں
2. مترادفات فراہم کرتی ہیں
3. جنس بتاتی ہیں (مذکر، مونث)
4. صیغہ بتاتی ہیں (واحد، جمع)
5. املا سکھاتی ہیں
6. تلفظ کی ادائگی میں رہنمائی کرتی ہیں
7. لفظ کے مآخذ کی نشاندہی کرتی ہیں
8. اشتقاق بتاتی ہیں
9. بعض لفظوں کی وضاحت وصراحت کرتی ہیں
10. محلِ استعمال کی سند عطا کرتی ہیں
11. اشکال (کنفیوزن) کو دور کرتی ہیں
12. ترجمہ نگاری میں مدد کرتی ہیں
13. بعض اوقات شرمندگی سے بچاتی ہیں اور سرخ روئی عطا کرتی ہیں

لغت دیکھنا یعنی اس سے استفادہ کرنا بھی ایک آرٹ ہے۔ بغیر اس آرٹ کو سیکھے لغت سے فائدہ اٹھانا آسان نہیں ہوتا۔ جو جتنی جلدی اس ہنر کو سیکھ جاتا ہے وہ زبان و بیان کے استعمال میں اتنا ہی زیادہ کامیاب ہوتا ہے۔ لغت دیکھنے کا طریقہ یہ ہے کہ جس زبان کی لغت دیکھی جائے اس زبان کے حروفِ تہجی سے پوری طرح واقفیت ہو۔ یعنی یہ معلوم ہو کہ حروف کی ترتیب کیا ہے۔ مطلب یہ کہ اسے اس بات کا علم ہو کہ پہلے کون سا حرف آئے گا اور اس کے بعد کون سا اور پھر اس کے بعد کون سا چونکہ اردو حروفِ تہجی میں حرف کے ساتھ بعض اعراب وعلامات کا بھی اہم رول ہوتا ہے اس لیے وہ بھی حروف کی ترتیب اور لغت سازی میں اثر انداز ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اردو کی لغات میں ایک جیسی ترتیب نظر نہیں آتی ۔ کوئی لغت (آ) سے شروع ہوتی ہے اور (آ) سے شروع ہونے والے اردو کے سارے الفاظ بہ اعتبارِ حروفِ تہجی یکجا کردیے جاتے ہیں۔ اور کسی کسی میں شروعات الف (ا) سے ہوتی ہے۔ مثلاً:

فرہنگِ آصفیہ کا آغاز حرفِ الف سے ہوتا ہے۔ اس کے بعد آ، ا، اِ، اُ وغیرہ سے شروع ہونے والے الفاظ بغیر کسی ترتیب کے آتے رہتے ہیں۔ اس کے برعکس فیروز اللغات میں حرفِ الف کے بعد (آ) سے شروع ہونے والے الفاظ جمع کیے گئے ہیں۔ اس کے بعد باقی اعراب یعنی ا، اِ، اُ وغیرہ سے شروع ہونے والے الفاظ بغیر کسی ترتیب کے شامل کیے گئے ہیں۔

کسی لغت کو دیکھنے میں دشواری پیش آرہی ہو تو اس لغت کے آغاز میں شامل مقدمے کو ضرور پڑھ لینا چاہیے جس میں لغت نگار اپنی لغت کے متعلق کچھ اصولوں کا ذکر کرتا ہے۔ وہ اصول ڈکشنری دیکھنے میں مدد کرتے ہیں۔

کوئی ایک لغت تمام تر مطلوبہ معلومات مشکل سے فراہم کرتی ہے۔ اس لیے ایک سے زیادہ لغت کی رہنمائی ضروری ہے۔

بعض لغات لفظ کے مآخذ اور اس کے بعض قواعدی زمرات کی اختلافی نوعیت کی معلومات فراہم کرتی ہیں۔ لغت میں لفظ کی مذ بعض میں جنس کے خانے میں لفظ مذکر لکھا ہوتا ہے تو بعض میں مونث۔ کسی میں لفظ کے سامنے قواعدی زمرے کے خانے میں اسم درج ہوتا ہے تو کسی میں میں صفت۔ اس کنفیوزن کو دور کرنے کے لیے کسی تیسری معیاری اور مستند لغت کی مدد ضروری ہوجاتی ہے۔

تمام لغات سارے قواعدی زمرات سے متعلق معلومات فراہم نہیں کرتیں۔ اس لیے حسبِ ضرورت ایک سے زیادہ لغت کو دیکھنا ضروری ہوجاتا ہے۔

ایک زبان کے لفظ کا مترادف اور معنی دوسری زبان میں جاننا ہو تو اس کے لیے ذولسانی یا سہہ لسانی لغات سے رجوع کرنا چاہیے۔ اور کراس چیکنگ کے لیے استفادے میں آنے والی لغت کے علاوہ کچھ اور لغات کو بھی سامنے رکھنا چاہیے تاکہ صحیح معنی تک پہنچا جاسکے۔ خصوصاً ترجمہ کرتے وقت ایسا ضرور کرنا چاہیے۔ بعض لغات کا جیبی اڈیشن بازار میں ملتا ہے، استاد کو چاہیے کہ وہ اس بات کو یقینی بنائیں کہ ہر ایک طالب علم کے پاس لغت کا جیبی اڈیشن موجود ہو۔ لغت سے فائدہ اٹھانے کے لیے درج ذیل اقدامات کیے جاسکتے ہیں:

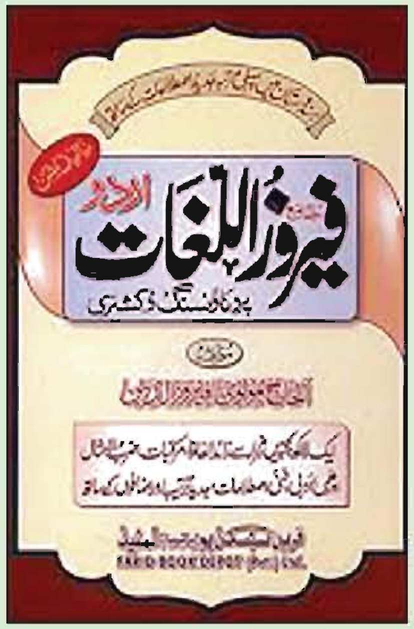

1. جو بھی سبق پڑھایا جائے اس میں سے کچھ الفاظ چن لیے جائیں اور طلبہ سے کہا جائے کہ وہ لغت کی مدد سے ان لفظوں کے مترادفات تلاش کریں۔
2. سبق سے کچھ ایسے لفظ انھیں دیے جائیں جن کی جنس معلوم کرنے کے لیے طلبہ سے کہا جائے کہ وہ لغت دیکھیں۔
3. کچھ الفاظ دے کر یہ پتا لگانے کے لیے کہا جائے کہ وہ ڈکشنری سے معلوم کریں کہ وہ لفظ عربی کے ہیں یا فارسی کے یا کسی اور زبان کے۔
4. کچھ لفظ ایسے بھی دیے جائیں جن کا قواعدی زمرہ معلوم کیا جائے یعنی یہ کہ وہ لفظ اسم ہیں یا صفت یا کچھ اور۔
5. کچھ غلط املا کے ساتھ الفاظ لکھے جائیں اور طلبہ سے کہا جائے کہ وہ ڈکشنری میں دیکھیں کہ اصل املا کیا ہے؟
6. کبھی کچھ لفظ ایسے بھی دیے جائیں جن کا صحیح تلفظ معلوم کرنے کے لیے طلبہ سے ڈکشنری دیکھنے کو کہا جائے۔
7. ڈکشنری دیکھنے کے سلسلے میں طلبہ کے درمیان مقابلہ کرایا جائے۔ انھیں ایک لفظ دے دیا جائے اور ان سے کہا جائے کہ وہ اس لفظ کے معنی، مآخذ اور قواعدی زمرہ معلوم کریں، جو سب سے پہلے اور صحیح معلومات فراہم کرے گا اسے انعام دیا جائے۔ یا شاباشی دی جائے، یا نمبر دیے جائیں۔
8. طلبہ سے کہا جائے کہ وہ لائبریری میں جائیں اور 5 یا 10 اردو لغات کے نام لکھ کر لائیں۔ اور یہ بھی پتا کریں کہ ان لغات کے مولف یا مرتب کون ہیں؟
9. کبھی کبھی طلبہ کو کچھ لفظ دیے جائیں اور ان سے کہا جائے کہ ان لفظوں کے دو یا تین معنی لکھیں جو مترادفات نہ ہوں ، بلکہ الگ الگ معنی ہوں۔ (یعنی ایک دوسرے کے مختلف معنی دے رہے ہوں)

"یومِ لغت، ڈکشنری ڈے" ہفتے میں ایک دن کسی مخصوص Period میں ڈکشنری ڈے منایا جاسکتا ہے۔ اس عنوان سے ایک ایسے پروگرام کا اہتمام کیا جاسکتا ہے جس کے تحت درج ذیل عنوانات پر پروگرام مرتب ہوسکتے ہیں:

1. ڈکشنری کی اہمیت پر مختصر تحریری مقابلہ
2. ڈکشنری سے متعلق کوئز پروگرام
3. لغت کی قدر و قیمت پر تقریری مقابلہ

مثلاً ایک دور میں لغات کے نام۔ دوسرے دور میں اردو لغات کے ادارے ۔ تیسرے دور میں ڈکشنری کے امور مخففات کا مطلب۔

لغات مین بنیادی انٹری۔

4. لغت نویسی کا کام۔ اس ضمن میں مختصر لغت نویسی کی مشق کرائی جاسکتی ہے، یہ کام گھر سے کر کے منگوایا جاسکتا ہے۔ مثال کے طور پر طلبہ سے کہا جائے کہ وہ گھر سے متعلق الفاظ کی فرہنگ تیار کریں۔ فرہنگ میں معنی کے ساتھ اس لفظ کی جنس بھی بتائیں۔ ممکن ہو تو ان سے واحد اور جمع بھی بنوائے جائیں۔ کسی کو اسکول کا موضوع دیا جاسکتا ہے۔ کسی سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ اس موضوع سے بننے والے 100 الفاظ کی لغت بنا کر لائیں اور لفظوں کی ترتیب alphabetical رکھیں۔

- کچھ لفظ دیے جائیں اور طلبہ سے کہا جائے کہ ان کے معنی ڈکشنری دیکھ کر بتائیں۔ جو سب سے پہلے بتائے اسے فاتح قرار دیا جائے۔
- اس طرح لغت کا پورا شعور طلبہ میں بیدار کیا جاسکتا ہے جو ان کی تعلیمی زندگی کے مختلف مراحل پر کام آسکتا ہے۔

■

Prof. Ghazanfar (Director), Academy of Professional Development of Urdu Medium Teachers, Jamia Millia Islamia, New Delhi - 110025

افسانہ شعریات کی تشکیل کا جواز

شاہد الرحمن

اردو افسانہ کے اولین نقوش انیسویں صدی کے اواخر میں ملتے ہیں۔ دراصل بعض ایسے حوالہ جات ہمارے پیشِ نظر ہیں جن کی بنیاد پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کے اولین نمونے ’گلدستہ حیدری‘ سے لے کر ’اودھ پنچ‘ کی نثری تخلیقات میں موجود ہیں۔ حالاں کہ فن اور تکنیک کے لحاظ سے یہ مسئلہ ابھی تک تحقیق طلب ہے کہ اولین افسانہ کون سا ہے؟ بعض ناقدین ’گزرا ہوا زمانہ‘ (1870) کو پہلا افسانہ قرار دیتے ہیں زمانی بُعد کو ملحوظ رکھا جائے تو یہ بات غلط بھی نہیں لگتی لیکن فن اور تکنیک کے پیش نظر بعض لوگ 1903 کے ’مخزن‘ میں راشد الخیری کی نثری تحریر ’نصیر اور خدیجہ‘ کو پہلا افسانہ قرار دیتے ہیں۔ اس باب میں مزید معلومات حاصل کرنے کے لیے انوار احمد کی کتاب ’اردو افسانہ ایک صدی کا قصہ‘ سے رجوع کیا جا سکتا ہے۔ ان باتوں سے قطع نظر ہم یہ وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ بیسویں صدی کے آغاز میں راشد الخیری، سجاد حیدر یلدرم اور پریم چند ایسے افسانہ نگاروں کے ہاں فن کی مختلف صورتیں نظر آتی ہیں۔ اس کے بعد اُردو افسانہ مستحکم ہوتا ہوا نظر آتا ہے اور مختلف تحریک و رجحانات کی نمائندگی میں بھی اس کا فنی قالب صیقل ہوتا ہے۔ یہ امر طے شدہ ہے کہ کسی بھی فن کی شعریات پہلے ہی سے موجود ہوتی ہے لیکن اس کا اصل اظہار تخلیقِ فن کے ساتھ ہوتا ہے۔ دراصل تخلیق فن کے بعد ہی شعریات کو منضبط کرنے کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ اُردو شاعری کی مثال سامنے کی ہے کہ ہمارے ہاں شاعروں کے فنی اظہار کو بنیاد بنا کر اس کی شعریات کو منظم کیا گیا ہے۔ اس باب میں وہ اشعار جو شعر کے متعلقات کو پیش کرتے ہیں، خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ اس کے بعد تذکرے اور تنقید کا ظہور ہوتا ہے۔ یہ تمام باتیں شاعری کی شعریات سے متعلق ہیں۔ اسی طرح فنِ افسانہ کے باب میں اس امر کا سراغ لگایا جا سکتا ہے۔ افسانہ تنقید کے سلسلے میں ہمارے ہاں ایک نوع کی بے ترتیبی نظر آتی ہے کہ اس کی شعریات کو باضابطہ موضوع نہیں بنایا گیا ہے۔ افسانہ تنقید میں یک موضوعی کتابوں کی کمی بھی نہیں ہے لیکن بہت کم کتابیں ایسی ہیں جن میں اس فن کی خالص شعریات کا ترتیب وار خیال رکھا گیا ہے۔ ارتضیٰ کریم کی کتاب ’اُردو فکشن کی تنقید‘ اس باب میں ہماری رہنمائی اس طور پر کرتی ہے کہ افسانہ تنقید کا اشاریہ اس میں شامل ہے۔ لیکن ان مضامین اور کتابوں کے مطالعات کو باقاعدہ صیقل کرنے کا کوئی اہتمام نہیں کیا گیا ہے۔ اکثر نقادوں نے اس طرف توجہ دلائی ہے۔ اس کے باوجود بازدید اور چھان پھٹک کا عمل باقی ہے۔ موجودہ زمانے میں افسانہ تنقید نے ترقی کر لی ہے اور فنِ افسانہ نظریاتی سطح پر کہاں سے کہاں پہنچ گیا ہے۔ اس طور پر یہ ضروری ہے کہ ہمارے سامنے کوئی ایسا مطالعہ پیش کیا جائے جو اس فن کی شعریات کو اسی طرح بامعنی بناتا ہو جس طرح اُردو شاعری کے باب میں ہمارے سامنے حوالہ جات کی صورتیں نمایاں ہیں۔ افسانہ تنقید کو موضوع بناتے ہوئے میری اپنی ترجیحات یہ ہیں کہ ان تمام متون کی بازیافت کی جائے جن میں خود افسانہ نگاروں نے اس فن کو پرکھا ہے اور اسی تسلسل میں ناقدین کے مطالعات کو اہمیت دی جائے۔ اس نوع کے مطالعے کی انفرادی خوبی یہ ہوگی کہ افسانہ کی تمام جہتیں کم و بیش روشن ہو جائیں گی۔ اُردو افسانہ کے اولین نقوش سے لے کر موجودہ عہد کے مطالعات میں اس تسلسل کا ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہوگا کہ افسانہ تنقید کی تاریخ، تشکیل و تعبیر کے تمام نشانات کو سمیٹ لے گی۔

> **موجودہ زمانے میں افسانہ تنقید نے ترقی کرلی ہے اور فنِ افسانہ نظریاتی سطح پر کہاں سے کہاں پہنچ گیا ہے۔ اس طور پر یہ ضروری ہے کہ ہمارے سامنے کوئی ایسا مطالعہ پیش کیا جائے جو اس فن کی شعریات کو اسی طرح بامعنی بناتا ہو جس طرح اُردو شاعری کے باب میں ہمارے سامنے حوالہ جات کی صورتیں نمایاں ہیں۔**

پریم چند کو اُردو افسانہ میں فن اور تکنیک کے لحاظ سے خاص مقام حاصل ہے۔ بعض ابتدائی نمونوں کے بعد ان کے ہاں فنِ افسانہ کے نشانات زمانی تصور میں مزید صیقل ہو کر ہمارے سامنے آتے ہیں۔ مثال کے طور پر ’سوز وطن کا دیباچہ‘، ’میں افسانہ کیوں لکھتا ہوں‘، ’میرے بہترین افسانے‘ اور ’ہماری قوت بیانیہ کا زوال‘ جو 1908 اور 1933 کے درمیان شائع ہوئے، دراصل یہ وہ مضامین ہیں جو افسانہ تنقید کے ابتدائی میلانات کا سراغ ہیں۔ اسی تسلسل میں 1935 تک رسائل و جرائد میں شائع ہونے والے وہ مضامین جو اس صنف سے متعلق ہیں، اس صنف کی تعمیر و تشکیل کے بہ ہر پہلو افسانے کی شعریات وضع کرتے ہیں۔ یہاں بعض عنوانات ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں:

(1) فن قصہ نویسی، ضیاء الدین شمسی، مطبوعہ ’ہمایوں‘ مئی تا نومبر 1922

(2) فن افسانہ نگاری، عبدالقادر سروری، مطبوعہ ’نگار‘ دسمبر 1926

(3) افسانہ کی ماہیت، حسیب احمد صدیقی، مطبوعہ ’ہمایوں‘ نومبر 1927

(4) کہانی کا سفر، ضیاء الدین، مطبوعہ ’نیرنگ خیال‘ جون 1931

(5) افسانہ نویسی، عظیم بیگ چغتائی، مطبوعہ ’ساقی‘ جنوری 1935

اس کے علاوہ بعض ایسی کتابیں بھی ملاحظہ کی جا سکتی ہیں جو 1935 سے قبل شائع ہو چکی تھیں:

(1) عبدالقادر سروری ’دنیائے افسانہ‘ 1927

(2) عبدالقادر سروری ’کردار اور افسانہ‘ 1929

(3) مجنوں گورکھپوری ’افسانہ اور اس کی غایت‘ 1935

بلاشبہ ان مضامین اور کتابوں کی حیثیت کئی معنوں میں تذکرے کی ہے لیکن ان کے مطالعات سے افسانہ تنقید کو بامعنی بنایا جا سکتا ہے۔ 1935 کے بعد وقار عظیم، جمیل احمد کندھائے پوری اور 1940 کے بعد صلاح الدین احمد، احتشام حسین، علی عباس حسینی، ممتاز حسین، محمد حسن عسکری اور احسن فاروقی کے ہاں تنقید کے باقاعدہ نمونے ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں۔ اس مطالعے میں پریم چند کے مضامین اور وہ تبصرے بھی قابل ذکر ہیں جو اس زمانے کے افسانہ سے تعلق رکھتے ہیں۔

پریم چند کے ’پریم بتیسی‘ (1925) کی اشاعت پر امتیاز علی تاج نے مقدمہ لکھا جو افسانوں پر ان کی پہلی تنقید کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان باتوں کو یہاں نشان زد کرنے کا مقصود یہ ہے کہ افسانہ تنقید کے دوطرفہ عمل کو ملاحظہ کیا جائے۔ اس دوطرفہ عمل کے ذریعے ہی ہم افسانہ نگاروں کی اپنی تنقید اور اس کے مقابلے میں نقادوں کی تنقید کو تفہیم و تعبیر کے دائرے میں لا سکتے ہیں اور اس کی شعریات کو متشکل کر سکتے ہیں۔ پریم چند کے بعد کم و بیش تمام افسانہ نگاروں نے اس صنف کے فن اور تکنیک کو موضوع بنایا ہے جن کو بالعموم نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

ترقی پسندی، جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے زمانے میں بھی اس صنف نے مختلف کروٹیں لی ہیں۔ یہاں غور کرنے والی بات یہ ہے کہ تحریک و رجحانات کی پیروی میں نقادوں نے اس صنف کا تجزیہ کیا تو بعض افسانہ نگاروں نے ان عنوانات سے الگ ہو کر اپنے فن کا مطالعہ پیش کیا۔ ان باتوں پر بہت کم توجہ دی گئی ہے۔ حالاں کہ ان اسالیب کا مطالعہ بیک وقت ہونا چاہیے۔

> **افسانے کی ماہیت، مبادیات اور شعریات کو افسانہ تنقید کے عنوان میں یک جا کرنے کی سعی کی جانی چاہیے۔ افسانہ تنقید کے غالب رویے کو ذہن میں رکھتے ہوئے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ شعر کی تنقید کا اس پر خاصا اثر ہے جس کو کہیں نہ کہیں الگ کرنے کے ضرورت بھی ہے۔ اس عمل کے ذریعے ہی اس صنف کی خالص شعریات کو پرکھا جاسکتا ہے۔**

افسانہ کی ابتدا میں ہی ہمارے ہاں اس صنف کی ماہیت کو سمجھنے کے لیے دیگر زبانوں کے تراجم سے بھی مدد لی گئی ہے۔ اس لیے افسانہ تنقید کے طرفوں کو وا کرنے کے لیے ان تمام حوالوں کو نشان زد کرنا بھی ضروری ہے۔ افسانہ تنقید کو موضوع بناتے ہوئے بازدید کا عمل ناگزیر ہے۔ چوں کہ اس موضوع پر خاطر خواہ مواد کی موجودگی میں بھی بعض تاریخی اور ادبی حقائق مثلاً تشکیلی عناصر پردۂ غیاب میں ہیں۔ مابعد جدیدیت کے زمانے میں بھی یہ صنف اپنی نوعمری کے باوجود تقاضا کرتی ہے کہ اس کے اُصول و نظریات کی چھان پھٹک کی جائے۔ اس لیے افسانے کی ماہیت، مبادیات اور شعریات کو افسانہ تنقید کے عنوان میں یک جا کرنے کی سعی کی جانی چاہیے۔ افسانہ تنقید کے غالب رویے کو ذہن میں رکھتے ہوئے یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ شعر کی تنقید کا اس پر خاصا اثر ہے جس کو کہیں نہ کہیں الگ کرنے کے ضرورت بھی ہے۔ اس عمل کے ذریعے ہی اس صنف کی خالص شعریات کو پرکھا جا سکتا ہے۔ کسی بھی صنف میں خالص شعریات اس کا بنیادی اور حاوی اسٹرکچر ہے جس کو بیش از بیش نمایاں کرنا ضروری ہے۔ ہمارے یہاں افسانہ اور شعری تنقید کی مبادیات میں تفریق کی صورت پیدا نہیں کی گئی ہے جس کی وجہ سے اس کی اصل صورت بہت کم سامنے آئی ہے۔ افسانہ اور شعر کی مبادیات میں تفریق سے مراد تنقیدی اصطلاحات کے استعمال میں وضاحتی فرہنگ بہت کم ناقدین کے یہاں نظر آتی ہیں۔ ممتاز شیریں کے بعد ہمارے زمانے میں گوپی چند نارنگ کی فکشن تنقید ان معاملات کو طے کرتی ہے۔ اس نوع کا مطالعہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ ہمارے ہاں وزیر آغا جیسے اہم نقاد اس صنف کو اس طور پر خاطر میں نہیں لاتے کہ ان کا اپنا مفروضہ یہ ہے کہ افسانہ ہمارے ہاں پیدا نہیں ہوا۔ اس میں بین الاقوامی معاشرہ نظر آتا ہے۔ ان کا مفروضہ ایک تاریخی سچ ضرور ہے لیکن یہ بات باور کرانے کی ہے کہ اس صنف کی مقامیت ایک مسلمہ حقیقت ہے، چوں کہ ہمارے ہاں ایسے اسالیب موجود ہیں جن میں قصہ گوئی کا رجحان ہے۔ ان باتوں کو اسی نوع کے مطالعے میں نشان زد کیا جا سکتا ہے۔ دراصل کسی صنف کی شعریات کے تعین میں وہ تمام حوالے در آتے ہیں جو اس کی خالص تہذیب کے ترجمان ہیں۔

جیسا کہ پہلے ہی کہا گیا کہ افسانہ سے متعلق ہمارے یہاں تنقیدی سرمایہ خاطر خواہ ہے۔ مضامین کے علاوہ کئی یک موضوعی کتابیں موجود ہیں لیکن ایسی کوئی کتاب اس موضوع پر نہیں ہے جو افسانہ تنقید کے ابتدائی نقوش سے لے کر اب تک کے مطالعات کا احاطہ کرتی ہو۔ ارتضیٰ کریم کی کتاب ’اردو فکشن کی تنقید‘ میں جو اشاریہ افسانہ تنقید کے تعلق سے شامل کیا گیا ہے اس کی مدد سے افسانہ تنقید کی بازدید ہی افسانہ شعریات کی تعمیر و تشکیل اور اس کے پیٹرن کا ایک سوانحی مطالعہ ہو سکتی ہے چونکہ ان متون کا مطالعہ ہی افسانہ تنقید کا جواز ہے۔

متذکرہ امور سے واضح ہے کہ اُردو افسانہ کی تنقید کا آغاز اس کی ابتدا سے ہی ہو گیا تھا اور مابعد جدیدیت کے زمانے تک اس کا سرمایہ نہایت وقیع ہو چکا ہے۔ ان مطالعات میں ہماری تنقید نے اکثر ان حوالوں سے صرفِ نظر کیا ہے جو افسانہ نگاروں کی اپنی تحریروں میں موجود ہیں۔ اس کے علاوہ ایک اہم نکتہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں ایسی کوئی کتاب نہیں ہے جو اُردو افسانہ کی مکمل تاریخ اور تنقید سے واقعتاً بحث کرتی ہو۔ افسانہ تنقید کی ابتدا میں عبدالقادر سروری نے اس طرف توجہ دلائی تھی کہ فکشن کی بوطیقا لکھنے کی ضرورت ہے۔ اس عرصۂ حیات میں بھی ایسی کوئی بوطیقا نہیں لکھی گئی ہے۔ یہ موضوع چوں کہ بہت پھیلا ہوا ہے اس لیے افسانہ تنقید کے عنوان میں جہاں بعض متعلقات کو روشن کیا جا سکتا ہے وہیں اس کی ترتیب وار صورتوں کے پیش نظر اس کی بوطیقا کو مرتب کرنے کی کوشش بھی کی جا سکتی ہے۔

■

Shahidur Rahman,171,Sabarmati Hostel,
JNU, New Delhi-110067

راحت افزا

سجاد ظہیر
خطوط کے آئینے میں

اردو میں مکتوب نگاری کا آغاز فارسی کے زیرِ اثر ہوا۔ کافی وقت تک خطوط نگاری فارسی طرزِ تحریر کے طابع رہی۔ انیسوں صدی میں اس میں ایک نئے رجحان کی شروعات ہوئی اور نئے طرزِ تحریر کی ایجاد کا سہرا غالب کے سر جاتا ہے۔ جنھوں نے ا س صنف میں نئے نئے تجرابات کر کے اس کو ایک نیا اسلوب عطا کیا۔ غالب کی مکتوب نگاری سے اردو میں مکتوب نگاری کو تقویت ملتی ہے، سرسید کی ادبی تحریک کسی حد تک اردو خط و کتابت کو متاثر کرتی ہے۔

خطوط بڑی حد تک ذاتی ڈائری کی حیثیت رکھتے ہیں کیونکہ یہ انسانی جذبات، احساسات، خیالات، ومشاہدات کے اظہار کا ذریعہ ہوتے ہیں۔ مکاتیب دراصل انسانی شخصیت کا وہ ائینہ ہوتے ہیں جس کی روشنی میں شخصی تصویر ابھر کر سامنے آتی ہے۔ غالب، سرسید، ابوالکلام آزاد، نیاز فتح پوری، اور دوسرے مشاہیرِ ادب کے خطوط کچھ ایسی دستاویز ہیں جن میں ان حضرات کی ذاتی زندگی کو سمجھنے میں کافی مدد ملتی ہے۔ انھیں کی طرح سجاد ظہیر کے خطوط بھی کافی اہمیت کے حامل ہی۔

سجاد ظہیر ترقی پسند تحریک کے اہم ستون ہیں انھوں نے اپنی زندگی قوم کے لیے وقف کردی۔ ادب، سماج، سیاست، فنون لطیفہ، اور تاریخ سے انھیں کافی دلچسپی تھی وہ کئی کتابوں کے خالق اور ترقی پسند مصنّفین کے بانی ہیں۔ ان کے خطوط اپنی علمیت اور ادبیت کی وجہ سے اردو ادب کے لیے بیش قیمتی سرمایہ ہیں، جو انھوں نے مختلف جگھوں سے دوستوں عزیز واقارب کو لکھے، جن میں ان کی بیٹی نجمہ، داماد باقر، اور دوستوں میں قاضی عبدالغفار، فراق گورکھپوری، اجمل اجملی، فیض احمد فیض، رام لعل وغیرہ شامل ہیں۔ یہاں پر میری توجہ کا مرکز سجاد ظہیر کے وہ خطوط ہیں جو انھوں نے اپنی اہلیہ رضیہ سجاد ظہیر کے نام لکھے، ان میں کچھ حیدر آباد اور کچھ لکھنؤ کی سینٹرل جیل سے لکھے ہیں۔ یہ خطوط ماہنامہ 'نقوش' کے 'ترقی پسند ادب نمبر' میں شائع ہوئے، البتہ ان کے خطوط کا مجموعہ 'نقوشِ زنداں' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

میں برطانوی حکوت کے خلاف تقریر کرنے کے جرم میں گرفتار ہونے کے بعد سینٹرل جیل لکھنؤ سے جو خطوط اپنی رفیقۂ حیات رضیہ سجاد ظہیر کو لکھے وہ نہایت ہی دل خراش معلوم ہوتے ہیں، ان میں ماضی کی یادیں ہیں، دبے کچے ارمانوں کی کسک ہے۔ بیوی کے ساتھ گزارے ہوئے خوشگوار لمحے ہیں۔ قید خانے میں گزرنے والے ایک ایک پل کی روداد اس طرح بیان کی گئی ہے کہ گویا زنداں کا خاکہ نظروں کے سامنے ابھرنے لگتا ہے۔ سجاد ظہیر کو اپنی بیوی سے بے پناہ عشق تھا، قید خانے میں ان کو اپنی رفیقۂ حیات سے جدائی کس قدر گراں گزرتی ہے اس کا ا ندازہ ہم ان کے خطوط کو پڑھ کر ہی لگا سکتے ہیں۔ قید خانے میں دو پرندوں کو دیکھ کر ان کی آزادی پر رشک کرتے ہوے سجاد ظہیر اپنی شریک زندگی سے ملنے کو تڑپ جاتے ہیں لکھتے ہیں:

"پرسوں شام کو جب سورج ڈوب رہا تھا۔ اور پچھّم کا آسمان گلابی تھا تو جیل کی اونچی دیوار پر ایک بارگی دو مینائیں آکر بیٹھ گئیں۔ آسمان کی سرخی میں ان کے پروں کی سیاہی ابھر کر آئی اور یہ جوڑا نظروں کے سامنے بالکل نمایاں ہو گیا پھر یک بارگی ان دونوں نے چلانا شروع کیا، خوب پر پھڑ پھڑائے اور ہماری پچیس فٹ اونچی دیوار سے ہچکولے لیتی ہوئی پھر پھر کرتی اڑ گئیں۔ مجھے اس وقت تمھارا خیال آیا اور ان دو آزاد چڑیوں پر رشک ہوا۔"

گذشتہ دنوں میں ساتھ گزارے لمحات کی ٹیس ان خطوط میں صاف محسوس کی جاسکتی ہے، جو قید خانے کی پریشان کن زندگی کو اور بھی مشکل بنا دیتی ہے۔

ان کے جملوں میں عاشق اور معشوق کے ہجر کی کسک دکھائی دیتی ہے۔ 'نقوشِ زنداں' کے دباچے میں جوش ملیح آبادی لکھتے ہیں:

"ان خطوط میں وہ سب کچھ ہے جو عاشق اور معشوق کے خطوں میں ہوا کرتا ہے۔ ان میں وہ حرارت، وہ ہلچل وہ ہمہما ور وہ حیات پائی جاتی ہے جو ازدواج کے مرعوب صحن میں نہیں ،معاشقے کے لہلہاتے سبزہ زاروں میں پائی جاتی ہے۔"

عشق و عاشقی کی مسحور کن باتیں، رومانیت خیز جملے، رفاقتوں کی یاد کے ساتھ ہجر کی تڑپ اور مستقبل میں ملاقات کی بے پناہ خواہش، موسم کی خنکی اور بہار، ان تمام باتوں کے ساتھ ساتھ قید خانے کی تمام تر مشغولیات اور تمام جزئیات کا ذکر اپنی شریکِ سفر سے اس طرح کرتے ہیں کہ قید خانے کا نقشہ آنکھوں کے سامنے ابھرنے لگتا ہے ایک خط ملاحظہ ہو:

"اب میرا پروگرام سنو: صبح ساڑھے چھے بجے اٹھ جاتا ہوں تھوڑی سی ورزش کے بعد دس منٹ باغیچے میں گھومتا ہوں پھر چائے اور اخبار، ساڑھے آٹھ بجے تک نہا دھو کر تیار نو ساڑھے نو بجے تک پھر اخبار یا کسی اور کتاب کی پڑھائی، اس بیچ اگر کوئی آیا اور اجازت ملی تو جیل کے دروازے پر گیا، پھر ساڑے بارہ اور ایک کے درمیان جو گھر سے کھانا آتا ہے وہ کھایا، کھانے کے بعد ادھر ادھر ٹہلا پھر پلنگ پر کوئی اچھی سی سہل سی کتاب پڑھی، ہندی کا سبق لیا اور اونگھا یا سو گیا۔"

زنداں کی تمام تر مشغولیات باوجود اپنے ذوق و تحسین کے لیے پڑھنا لکھنا اور ادبی پروگراموں کا انعقاد کرنا سجاد ظہیر کے محبوب مشغلوں میں سے تھا۔ قید و بند کی مشکلات کے برعکس سجاد ظہیر اپنے ادبی ذوق کو برقرار رکھتے اور بیشتر ادبی کتابوں کا مطالعہ کرتے رہتے تھے۔ خط و کتابت اور ادبی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ لکھنے کا کام بھی بڑے ذوق سے کرتے۔ سجاد ظہیر نے جیل ہی میں دو اہم کتابیں تخلیق کیں 'روشنائی' اور 'ذکر حفظ' اس کے علاوہ ان کے خطوط میں ادبی رسائل واخبار شعرا کے دواوین اور فنونِ لطیفہ سے متعلق خوب ذکر ملتا ہے۔ فراق گورکھپوری، فیض احمد فیض، مجاز، اور جوش کی شاعری پر بھی تبصرہ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

سجاد ظہیر ترقی پسند ادبی تحریک کے سربراہ تھے اور یہی ان کی زندگی کا نصب العین تھا اسی لیے ان کے خطوط میں بھی یہ خیالات سامنے آتے ہیں۔ زمانے کی بربادی، مظلوم طبقے کی مصیبتیں اور پریشانیاں ان کے دل کو جھنجوڑ کر رکھ دیتی ہیں۔ سجاد ظہیر جہاں ایک طرف ان حالات سے عاجز نظر آتے ہیں تو دوسری طرف مستقبل میں امن وسکون کے خواہاں ہیں۔ اپنی کاوشوں کی بدولت پرامن واطمینان بخش مستقبل کی آمد کو محسوس بھی کرتے ہیں۔ ان کو یقین ہے کہ ان کی یہ قربانیاں رائگاں نہیں جائیں گی۔ ایک خط میں رضیہ سے کہتے ہیں:

"کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ صدیوں سے بنی نوع انسان طرح طرح کے مظالم، مصیبتوں اور صعوبتوں کا شکار ہے، خاص طور سے وہ لوگ محنت کرتے ہیں۔ اور زندگی کی تمام مادّی، ذہنی اور روحانی اقدار کے خالق ہیں، اور جن کے کندھوں پر تمدن اور تہذیب کی ساری عمارت کا بوجھ ہے، ہماری یہ خوش قسمتی ہے کہ ہم تاریخ کے ایسے دور میں سانس لے رہے ہیں جب بالآخر اس ہولناکی کے صرف ختم ہونے کے ہی آثار نہیں ہیں بلکہ جگہ جگہ انصاف اور سچائی کا پرچم، آزاد لا محدود انسانی تخلیق اور ترقی کی راہوں پر سایہ فگن ہے۔ اب سے دو سال بعد زندگی میں کتنا زیادہ اطمنان، خوشی، اور سکون ہوگا لیکن تبدیلی کی جہد اور کاوش میں خود شریک ہونا اور نئی تعمیر کی نیو رکھنا، اور اس کے ابتدائی نقوش کو خود ابھرتے دیکھنا ہماری روح کو کتنا زیادہ لطیف بلندیوں کی طرف لے جاتا ہے۔"

سجاد ظہیر کے خطوط ادبی اعتبار سے بھی کافی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان کے خطوط کی ادبی قدر و قیمت کے تعین میں جو بات ظاہر ہوتی ہے وہ جا بجا فن سے متعلق ان کی تنقیدی آرا ہیں۔ سجاد ظہیر ادب میں مقصدیت کے ساتھ ساتھ فن برائے فن کے بھی حامی تھے۔ وہ ادب کو مقصدیت پر قربان ہوتے دیکھنا نہیں چاہتے تھے۔ ایک خط میں رضیہ سجاد ظہیر کے افسانے کے متعلق لکھتے ہیں:

"تمھاری کہانی 'ٹیپو' پڑھی۔ مجھے تمھارا یہ اسکیچ یا کہانی بہت اچھی لگی۔ البتہ اس کے خاکے کے بارے میں مجھے یہ محسوس ہوا شاید افسانے کے 'مورال' کو بیان کرنے کے لیے اس کی افسانویت کو کسی حد تک چوٹ پہچائی گئی ہے۔ بہتر صورت یہ ہوتی کہ ٹیپو کے متعلق جو چھوٹے بڑے واقعات ہیں ان کا ذکر کر کے بات ختم کر دی جاتی تا کہ انھیں سے مطلب ومقصد ظاہر ہو جاتا تشریح کی ضرورت نہ ہوتی۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ افسانوں اور خاکوں میں ہم مقصدیت نہ رکھیں یا مقصدیت کو گول کر دیں۔ لیکن آرٹ زیادہ مؤثر اسی صورت میں ہوتا ہے جب ہم زندگی، جذبات اور احساسات کا اصلی اور حقیقی نقشہ یوں کھینچیں کہ سچائی کی تصویر آپ سے آپ ابھر آے اور پڑھنے والے کے لیے وہی نتیجہ نکلنا ناگزیر ہو جو آرٹسٹ چاہتا ہے، وہ اسی طرح متاثر ہو جو آرٹسٹ کا مقصد ہے۔"

سجاد ظہیر کے خطوط مکتوب نگاری کے اصولوں پر کسی حد تک پورے اترتے ہیں یعنی کسی حد تک انھوں نے خطوط نگاری کے لیے وضع کی گئی شرائط کو پورا کیا ہے۔ جس طرح غالب نے عہد قدیم کے مروجہ اصولوں کو رد کیا اسی طرح سجاد ظہیر بھی اس سے انحراف کرتے ہوے نظر آتے ہیں۔ جیسے خط لکھتے وقت القاب و آداب کی طوالت سے پرہیز کیا ہے، وہ نہایت ہی مختصر اور موزوں القاب لکھتے ہیں۔ مثلاً اپنی رفیقہ حیات کو اس طرح مخاطب کرتے ہیں۔ جان سے زیادہ عزیز رضیہ، میری زندگی کی بہار، میرے دل وجان کی مالک، میری جان، یا کبھی سیدھی جانب صرف تاریخ ڈال کر اوّل سطر سے خط لکھنے پر اکتفا کرتے ہیں۔

خط لکھنے کی دوسری شرط کہ خط کو اس طرح لکھا جائے کہ کاتب اور مکتوب الیہ کے درمیان فاصلوں کے باوجود آمنے سامنے محوِ گفتگو نظر آئیں یعنی خط لکھنے کا انداز مکالماتی ہو۔ سجاد ظہیر بھی غالب کی

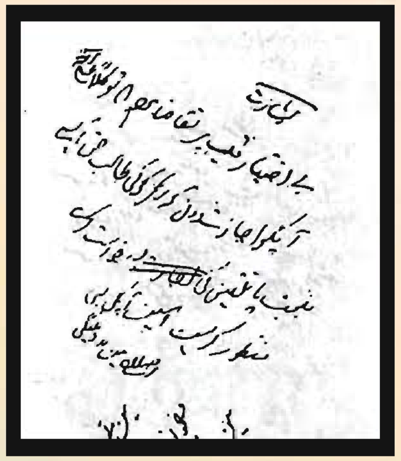

طرح مکالماتی انداز اپناتے ہیں ایک خط ملاحظہ فرمائیں:

"یہ بتاؤ۔۔۔؟ کتنی نئی، پر شور، ہنگامہ خیز کتابیں پڑھیں۔ اس زمانے میں، ہم یہ نہیں مانتے کہ وقت نہیں ملا۔ وقت نکالو۔ نہیں تو تمھارا ذہن تمھارے ارد گرد بیشتر پڑھے لکھے دوستوں کی طرح زنگ آلودہ ہو جائے گا۔"

ایک جگہ اور لکھتے ہیں:

"ارے، لو وہ سب سے خوشی کی بات کہنا بھول ہی گئے، یعنی وہ حافظ والا مضمون، ایک چھوٹی سی 'کتاب' بن گیا ہے۔"

سجاد ظہیر کی شخصیت کا اہم پہلو جو ہمیں ان کے خطوط سے ہی پتا لگتا ہے کہ وہ بہترین نثر ہی نہیں بلکہ خوبصورت شاعری بھی کرتے ہیں ان کی نثر کی طرح ان کی شاعری میں بھی ترقی پسند عناصر کی جھلک دیکھنے کو ملتی ہے۔ قید خانے کی زندگی ہو یا باہر کی، کہیں پر بھی وہ اپنے عزم سے پیچھے نہیں ہٹتے۔ انقلاب کا نعرہ ہر جگہ بلند کرتے نظر آتے ہیں۔ جیل میں مشاعرے کے دوران انھوں نے کچھ اشعار پڑھے ملاحظے ہو:

جب وہ اٹھتے ہیں مٹانے خم کا، میخانے کا نام
شورشِ مے سے چمک جاتا ہے پیمانے کا نام
کچھ تو بدنامی کا کھٹکا، کچھ گرفتاری کا ڈر
آج کل لیتے نہیں وہ اپنے دیوانے کا نام
شیخ صاحب بھی لگے آتے ہیں ان کے ساتھ ساتھ
اور پھر حضرت کبھی لیتے نہیں جانے کا نام
سازِ آزادی کے نغمے تیز ہوتے ہیں یہاں
کون کہتا ہے کہ یہ زنداں ہے غم خانے کا نام

سجاد ظہیر کے خطوط سے ان کی شخصیت کے کئی پہلو اجاگر ہوتے ہیں۔ سیاسی سماجی اور ادبی زندگی کے ساتھ ساتھ ذاتی شوق اور قید خانے کی مصروفیات کا بھی بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ادبی و تخلیقی صلاحیتوں کے ساتھ باغبانی کا بھی ذوق رکھتے ہیں۔ گھر کی طرح جیل میں بھی باغیچہ بناتے، اس کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ سجاد ظہیر کو پھول پودوں سے بے پناہ محبت ہے۔ طرح طرح کے پیڑ پودے لگاتے ہیں جس سے قید خانے کی فضا خوش نما معلوم ہوتی ہے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:

"آج کل کافی وقت اپنے چھوٹے سے احاطے میں صرف کرتا ہوں۔ جاڑوں کی فصل کے پھول بوئے جا رہے ہیں۔ زمین تیار کرنا، کھاد ڈلوانا، کیاریاں درست کرنا، آبپاشی، تخم ریزی، قلمیں لگانا، کافی دل چسپ مشغلہ ہے ایک سوکھے ہوئے پودے کو مرنے سے بچایا۔ زمین کو روز غور سے دیکھ رہے ہیں کہ بیج جم گیا کہ نہیں۔ اس کی پریشانی کہ کہیں دانہ نہ اگے۔ اور اگنے پر روز روز اس کی نشوونما کو دیکھنا، ایک ایسی دنیا ہے جس میں انسان تھوڑی دیر کے لیے اتنا مشغول ہو جاتا کہ باقی باتیں پریشان نہیں کرتی۔"

ان کے خطوط کو پڑھ کر ان کی شخصیت کی جو تصویر ہمارے سامنے آتی ہے وہ ایک بے لوث ایماندار، جذبۂ ایثار سے لبریز، ادب اور فنون لطیفہ کے عاشق کی ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ رشتے داروں اور لواحقین کے لیے مشفق ہیں، عوام کے لیے جمہوریت پسند اور اپنے فرائض کو پوری طرح بجا لانے والے فرد ہیں۔ سب سے بڑی بات کہ ایک اچھے اور شفقت ومحبت کرنے والے شوہر کی تصویر بھی ابھرتی ہے جو اپنی بیوی کے لیے ایک کھلے دل کے دوست کی طرح سامنے آتے ہیں۔ زبان واسلوب کی سطح پر بھی اگر دیکھا جائے تو ان کے خطوط اردو نثر میں گراں قدر اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ سادگی اور خلوص کی بنا پر یہ سرسید اور حالی کی نثر کی ترقی یافتہ شکل بھی معلوم ہوتی ہے۔

■

Rahat Afza, R-206, Lane No 5, 3rd Flood, Frnt Side, Sir Syed Road, Batla House, New Delhi - 110025

20 ستمبر 1857: حالات، واقعات واثرات

معصوم عزیز کاظمی

20 ستمبر 1857 کو کمپنی حکومت کی افواج نے جنرل وِلسن کی قیادت میں دہلی کو فتح کرلیا۔ 337 سالہ مغلیہ سلطنت کا آفتاب غروب ہوگیا۔ قلعۂ معلّی میں کوئی زندہ نہ بچا۔ کمپنی حکومت کی افواج نے اپنا ہیڈکوارٹر لال قلعے میں منتقل کردیا۔ برطانوی سامراج کی سازشوں اور آہنی پنجوں سے ملک وملّت کو نجات دینے کی پہلی قربانی 23 جون 1857 میں سراج الدولہ نے پلاسی کی جنگ میں پیش کی تھی۔ ہندوستان میں انگریزوں کے بڑھتے ہوئے قدم کو روکنے کی دوسری اہم کوشش بنگال کے نواب میر قاسم، اودھ کے نواب شجاع الدولہ اور شاہ عالم نے مشترکہ طور پر کی تھی۔ 23 اکتوبر 1764 میں بکسر کی جنگ میں انھیں شکست نصیب ہوئی اور اس طرح انگریزوں کو بنگال، بہار اڑیسہ کی مال گذاری وصول کرنے اور غیرفوجی مقدموں کا فیصلہ کرنے کا اختیار مغل شہنشاہ شاہ عالم دوئم سے حاصل ہوگیا۔ فرنگی استعمار سے ملک کو آزاد کرنے کی تیسری سرفروشانہ کوشش شہید ٹیپو سلطان نے کی تھی۔ 4 مئی 1799 کو سرنگاپٹنم میں انگریزوں کے خلاف جنگ میں ٹیپو سلطان نے جام شہادت نوش کیا۔ اس کے جسم پر سیکڑوں زخم کے نشان تھے اور بعداز مرگ بھی اس کے ہاتھ میں شمشیر تھی۔ اس جنگ میں شیر میسور کو اپنوں کی خودغرضی، خباثت، بدنیتی اور انگریزوں کی سازش و عیاری کی بنا پر شکست نصیب ہوئی۔ علّامہ اقبال نے پلاسی اور سرنگاپٹنم کی جنگ کے پس منظر میں کہا:

جعفر از بنگال، صادق از دکن
ننگ ملت، ننگِ دیں، ننگ وطن

......ان فتوحات کے زعم میں کمپنی حکومت نے 3 فروری 1856 کو اودھ کا الحاق من مانے ڈھنگ سے کرلیا۔ یکم مارچ 1856 کو نواب واجد علی شاہ کو معزول کرکے شہر بدر کرکے کلکتہ لے جایا گیا۔ ان صورت حال میں فرنگی استعماریت سے ملک و قوم کو آزاد کرنے کی خواہش وکوشش صرف حکمرانوں اور والیان ریاست تک محدود نہ رہی بلکہ اس میں علما، فضلا، اور عوام نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ مولانا آزادؒ نے جدوجہد آزادی کی وجوہات کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا ہے کہ اس کی شروعات کسی سازش کے تحت نہیں ہوئی بلکہ پچھلے سوسالوں سے کمپنی حکومت سے عام ہندوستان بدظن ہوچکا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ انھیں اس بات کا احساس رفتہ رفتہ ہوا کہ وہ اپنے ملک میں غلامانہ زندگی جینے پہ مجبور ہیں۔ یہ احساس کسی خاص طبقہ، گروپ یا کمیونٹی تک محدود نہ تھا بلکہ عوامی طور پر یہ احساس شدت میں تبدیل ہورہا تھا، لہٰذا اس بغاوت کا کردار بھی عوامی تھا۔

حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی ولی اللّٰہی کی تحریک اور مولوی احمداللہ شاہؒ کی مجاہدانہ کوششوں سے ملک کے خاص و عام کا ایک بڑا طبقہ عملی طور پر ملک کی آزادی کے لیے برسرپیکار رہا۔ پہلی جنگ آزادی 1857 کی سب سے اہم وجہ ہندوستانیوں کے مذہبی عقائد کا مسلسل مجروح ہونا تھا۔ کمپنی حکومت نے ہندوستانی سپاہیوں کے مذہبی عقائد کو منصوبہ بند طریقے سے قصداً مجروح کیا۔ برہان پور کی انیسویں نیوانفنٹری نے نئے قسم کے ان فیلڈ رائفلوں کو جب استعمال کرنے سے انکار کردیا تو نتیجتاً اس ریجمنٹ کو تحلیل کر دیا گیا۔ سات اودھ ریجمنٹ کے سپاہیوں نے بھی اپنے افسروں کے احکام کو ماننے سے جب انکار کر دیا تو اس ریجمنٹ کا بھی وہی حشر ہوا جو برہان پور ریجمنٹ کا ہوا تھا۔ بیرک پور میں 26 مارچ 1857 کو انیسویں پلٹن کے منگل پانڈے نے چربی لگے کارتوس کو منھ سے کاٹ کر استعمال کرنے پر احتجاج بلند کیا۔ اس احتجاج پہ پلٹن کے انگریزی افسران جب اسے گرفتار کرنے کے لیے آگے بڑھے تو اس نے میجر ہٹسن اور لیفٹیننٹ واگ پر گولی چلا کر اُن کا خاتمہ کر دیا۔ اس نے اپنے دیگر ساتھیوں کو بغاوت کا علم بلند کرنے کی صدادی۔ لیفٹیننٹ بف جب گھوڑے پہ سوار موقعۂ واردات پر پہنچا تو منگل پانڈے نے اس پہ گولی چلادی۔ گولی گھوڑے کو لگی اور لیفٹیننٹ بف گھوڑے سے گر پڑا۔ منگل پانڈے نے اس پر پستول سے فائر کیا لیکن نشانہ چوک گیا۔ آخرکار منگل پانڈے گرفتار کرلیا گیا۔ 8 اپریل 1857 کو اسے پھانسی دے دی گئی۔ ریجمنٹ کو تحلیل کر دیا گیا لیکن منگل پانڈے کی شہادت رنگ لائی۔ اس شہادت نے ہندوستانی سپاہیوں کے سوئے ہوئے ضمیر کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ اس جرأت رندانہ کی خبر جنگل کی آگ کی طرح دیگر مقامات پر تعینات افواج میں پھیل گئی۔ انبالہ کے ٹریننگ سنٹر (مرکز) میں ہندوستانی سپاہیوں نے نئے نئے کارتوسوں کے استعمال پر اپنی بے چینی کا کھلے عام اظہار کیا۔ یکم مئی 1857 کو لکھنؤ کی چھاونی میں ہندوستانی سپاہیوں نے کارتوس لینے سے انکار کر دیا۔ سپاہیوں کو صبح 8 بجے پریڈ پر حاضر ہونے کا حکم صادر ہوا۔ پریڈ پر حاضر ہندوستانی سپاہیوں کو چاروں طرف سے مسلح گھوڑا افواج نے گھیرلیا۔ سامنے توپ خانہ نصب کر دیا گیا اور گولہ باری کے لیے آگ روشن کر دی گئی۔ حالات کا اندازہ کرکے جب ہندوستانی سپاہی افراتفری کے عالم میں جائے پناہ کے لیے بھاگنے لگے تو پیچھا کرکے انھیں گرفتار کرلیا گیا۔ ہندوستانی سپاہیوں پر حکم عدولی کا الزام عائد کرکے سخت ترین سزائیں دی گئیں۔

23 اپریل 1857 کو میرٹھ چھاونی میں کرنل اسمتھ نے حکم دیا کہ نوّے (90) منتخب چھلپہ مار پریڈ پر حاضر ہوں گے۔ اس کا یہ خیال تھا کہ ہندوستانی سپاہی کارتوسوں کے استعمال کے لیے تیار ہوجائیں گے۔ امید کے برخلاف پریڈ پر حاضر نوّے میں سے پچاسی (85) سپاہیوں نے کارتوس لینے سے انکار کردیا۔ نافرمان سپاہیوں کو گرفتار کرکے ان کا کورٹ مارشل کیا گیا۔ 9 مئی 1857 کی صبح ان سپاہیوں کو پوری بریگیڈ کی موجودگی میں دس سال قید کی سزا دی گئی۔ ان کی وردیاں اتروالی گئیں۔ لوہاروں نے ان کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں اور پیروں میں بیڑیاں پہنادی۔ یہ دل خراش منظر پلٹن کے دیگر ہندوستانی سپاہیوں نے دیکھا اور ان کی آنکھیں نم ہوگئیں۔ انقلاب کے علمبردار اور قائد نے جوش میں ہوش نہ کھونے اور انتظار کی صلاح دی۔ بقول وِلسن، سابق جج مرادآباد

"9 مئی کی صبح جب کچھ سپاہی بغرض سیر شہر کی طرف گئے تو کچھ عورتوں نے انھیں طعنہ دیتے ہوئے یہ کہا کہ تمہارے ساتھی جیل خانے میں ہیں اور تم یہاں بازار میں مکھیاں مار رہے ہو، لعنت ہے تم پر......"

یہ الفاظ ان سپاہیوں کے دل و دماغ پر تیر کی طرح لگے۔ ان کے لیے اب برداشت کرنا اور مناسب وقت کا انتظار کرنا مشکل ہوگیا۔ 10 مئی 1857 کو نفرت وغصے کا جوالہ مکھی پھوٹ پڑا۔ مزید برطانوی افواج کی آمد کی افواہ نے سارے صبر وضبط کو توڑ دیا اور ہندوستانی سپاہیوں نے ہتھیار اٹھالیے۔ تیسری ریجمنٹ کے گھوڑسوار اور عوام پرانی جیل کی طرف آگئے اور انھوں نے جیل کا دروازہ توڑ کر قید کیے گئے سپاہیوں کو آزاد کرالیا۔ بازار بند ہو گئے۔ بغاوت کا بگل بج گیا۔ غم و غصے سے بھرے ہوئے اشتعال انگیز گروہوں نے انگریزوں کے گھروں میں آگ لگاتے ہوئے انھیں موت کی آغوش میں پہنچادیا۔ شہر میں پولس نے باغیوں کا ساتھ دیا۔ ہر طرف افراتفری کا عالم پھیل گیا۔ پورا نظام درہم برہم ہوگیا۔ میرٹھ کے کمانڈنگ افسر جنرل ہیوٹ کے اوسان خطا ہوگئے۔

باغی سپاہی زیادہ دیر تک میرٹھ میں نہیں رُکے۔ کثیر تعداد نے دلّی کی طرف کوچ کرنے کا فیصلہ کیا۔ 10 مئی 1857 کی شب یہ سرفروشانِ وطن دلّی کی طرف روانہ ہوئے۔ متعیّن وقت سے پہلے میرٹھ میں بغاوت پھوٹ پڑنا ایک فطری عمل تھا جس میں ہوش سے زیادہ جوش کارفرما تھا۔ اگر یہ بغاوت متعیّنہ تاریخ کو رونما ہوتی تو شاید ایک نئی تاریخ رقم کی جاتی۔ تاریخ داں مالیسن کے الفاظ میں۔

دلّی میں تاجدار ہند بہادر شاہ ظفر جو 1837 میں تخت نشیں ہوئے تھے، کا اقتدار لال قلعہ تک محدود تھا۔ حقیقتاً وہ کمپنی حکومت کا وظیفہ خوار تھا۔ ولیم رسل (نامہ نگار اخبار لندن ٹائمس) نے لکھا ہے:

"ہم نے انھیں قلعہ میں حقارت آمیز، پس ماندہ اور مقروض زندگی گذارنے پر مجبور کر دیا تھا۔"

انقلابیوں کے دلّی میں داخل ہونے کی خبر جب بہادر شاہ ظفر کو ملی تو وہ بے چینی واضطراب میں مبتلا ہوگئے۔ انقلابی جوق در جوق لال قلعے کی پشت پر جھروکے کے نزدیک جمع ہو گئے۔ اس جمعیت نے مغل تاجدار سے قیادت کی گذارش کی۔ اسّی (80) سالہ بہادر شاہ ظفر نے انقلابیوں کو ان الفاظ میں خطاب کیا۔

"سنو بھائی! مجھے بادشاہ کون کہتا ہے؟ میں تو فقیر ہوں، ایک تکیہ بنائے ہوئے اپنی اولاد کے لیے بیٹھا ہوں۔ یہ بادشاہت بادشاہوں کے ساتھ گئی۔ میرے باپ دادا بادشاہ تھے جن کے قبضے میں ہندوستان تھا۔ سلطنت تو برسوں پہلے میرے گھر سے جا چکی تھی............ مجھے ستانے کیوں آئے ہو۔ میرے پاس خزانہ نہیں ہے کہ تمھیں تنخواہ دوں گا۔ میرے پاس فوج نہیں ہے کہ تمھاری امداد کروں گا۔ میرے پاس ملک نہیں ہے کہ تحصیل کرکے تمھیں نوکر رکھوں گا۔ میں کچھ نہیں کرسکتا ہوں، مجھ سے کسی طرح کی توقع، استطاعت کی نہ رکھو......"

بادشاہ کے حکم پر قلعہ دار کپتان ڈگلس نے انقلابیوں کو بادشاہ کو پریشان نہ کرنے اور وہاں سے چلے جانے کا حکم دیا۔ انقلابی راج گھاٹ کی طرف چلے گئے لیکن ان کی ایک بڑی تعداد محل کے طرف روانہ ہوگئی۔ قلعے کے پہریداروں نے ان کا ساتھ دیا اور صدر دروازہ کھول دیا گیا۔ ڈگلس فریزر ہیمنسن وِلفرڈ اور دیگر انگریز قتل کر دیے گئے۔ شہر میں لوٹ پاٹ شروع ہوگئی۔ بدامنی شباب پر پہنچ گئی۔ سورج جب نصف النہار پہ پہنچا تو لوگ جوق در جوق بادشاہ کے حضور میں فریاد کرنے کے لیے آئے۔ یہ سبھی تحفظ اور امن کی فریاد کررہے تھے۔ نام نہاد تاجدار ہند بہادر شاہ ظفر بے چارگی اور بے بسی کی تصویر بنے بیٹھے رہے۔ کافی پس وپیش کے بعد وہ انقلابیوں کی قیادت کے لیے تیار ہوئے جس میں بے بسی اور بے چارگی شامل تھی۔ نصف شب کو اکیس توپیں داغ کر بہادر شاہ ظفر کو بادشاہ تسلیم کرتے ہوئے سلطنت مغلیہ کے احیا کا اعلان کیا گیا۔ انقلابیوں کی طرف سے دلّی میں یہ منادی کرائی گئی:

"سب جانتے ہیں کہ انگریزوں نے ان دنوں کیا گندے طریقے اپنائے ہیں۔ پہلے تو انھوں نے سارے ہندوستانی فوج کے مذہب کو برباد کیا اور پھر لوگوں کو جبراً عیسائی بننے پر مجبور کیا۔ اس لیے ہم پوری طرح مذہب پر قائم رہتے ہوئے لوگوں کے ساتھ ایک جٹ ہوئے ہیں اور ہم نے کسی ملیچھ کو زندہ نہیں چھوڑا ہے اور اس بنیاد پر ہم نے دلّی کی سلطنت پھر سے قائم کی ہے۔"

تمام افواج کی کمان مرزا ظہیرالدین بخت بہادر عرف مرزا مغل کو سونپی گئی۔ دوسرے شہزادوں کو بھی اہم عہدوں سے نوازا گیا۔ مرزا مغل اور مرزا عبداللہ کو افواج کی مدد سے شہر میں جلد از جلد امن وامان قائم کرنے کی اہم ذمے داری سونپی گئی۔ 12 مئی 1857 کو بہادر شاہ ظفر نے دربار عام منعقد کیا......شہر کے عمائدین کی ایک مجلس عاملہ تشکیل دی گئی۔ بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے نام پر دس سکّے ڈھالے گئے اور شاہی فرمان بھی انھی کے نام پر جاری کیا جانے لگا۔ بہادر شاہ ظفر نے آزادی کے لیے برسرپیکار ہونے کے لیے ایک عام اعلان ان الفاظ میں کیا:

"ہندوستان کے ہندو مسلمان اٹھو...... بھائیو! اٹھو......خدا نے انسان کو جتنی برکتیں دی ہیں ان میں سب سے زیادہ قیمتی برکت آزادی کی ہے۔ وہ ظالم فرنگی جس نے دھوکے سے یہ برکت چھین لی ہے کیا ہمیشہ کے لیے ہمیں اس سے محروم رکھ سکے گا۔ نہیں، کبھی نہیں۔ فرنگیوں نے اتنے ظلم کیے ہیں کہ ان کے گناہوں کا پیمانہ لب ریز ہوچکا ہے۔ خدا اب نہیں چاہتا ہے کہ تم خاموش رہو، کیونکہ اس نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے دلوں میں انگریزوں کو اپنے ملک سے نکالنے کی خواہش پیدا کردی ہے۔ خدا کے فضل سے تم لوگوں کی بہادری سے جلد ہی انگریزوں کو اتنی کامل شکست ملے گی کہ ہمارے ملک میں ان کا ذرا بھی نشان نہیں رہ جائے گا......"

کچھ سماج دشمن عناصر انگریزوں کی تلاش کے پسِ پردہ لوٹ پاٹ کرنے لگے۔ ہر طرف خوف و ہراس کا ایک عالم طاری ہوگیا جس کی وجہ سے دکانیں بند اور کاروبار ٹھپ ہو گیا۔ امن وامان بحال کرنے کے لیے بادشاہ خود ہاتھی پر سوار ہوکر شہر کے معائنے کے لیے نکلے۔ بہادر شاہ ظفر نے پنجاب

کے والیانِ ریاست کو جدوجہد آزادی میں شامل کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ انھوں نے اپنے مراسلے کے ساتھ ایلچی تاج الدین کو ان لوگوں کے پاس روانہ کیا لیکن نتیجہ حسب خواہش نہیں نکلا۔ دیگر رجواڑوں سے بھی رجوع کیا گیا۔ انھیں یہ پیش کش کی گئی کہ اگر وہ جنگ میں بادشاہ کا ساتھ دیں گے کہ بادشاہ اپنے شاہی اختیارات منتقل کردیں گے۔

ہندوؤں اور مسلمانوں میں اتحاد برقرار رکھنے کے لیے گائے کے ذبیحہ پر پابندی لگادی گئی۔ 9 جولائی 1857 کو کوتوال شہر کے نام اِس بابت حکم نامہ جاری کیا گیا تھا۔

میرٹھ چھاونی میں سپاہیوں کی بغاوت اور دلی پر قبضے کے بعد پورے شمالی، مغربی و مرکزی ہندوستان میں سپاہیوں اور عوام میں حکم عدولی اور بغاوت کی ایک لہر چل پڑی۔ جنو ہندوستان پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑا۔ پنجاب اور بنگال میں اس کے اثرات کم تھے۔ افواجِ انگلشیہ کے تقریباً چالیس ہزار سوار، بارہ ہزار پیدل جس میں تیس توپیں شامل تھیں، نے اپنی اپنی پلٹن کو چھوڑ دیا تھا۔ اس کے علاوہ تین ہزار پیدل اور ایک ہزار سوار ایسے تھے جو آزاد تھے۔

دلّی پر قبضے کے ایک ماہ کے اندر انقلاب کی لہر کانپور، لکھنؤ، فیروز پور، علی گڑھ، اٹاوا، بنارس، الٰہ آباد، بریلی، جگدیش پور جھانسی، متھرا، مراد آباد، بدایوں، اعظم گڈھ اور سیتا پور تک پھیل گئی۔

6 جون 1857 کو کانپور میں مراٹھا کے آخری پیشوا باجی راؤ دوئم کے پوس پالک نانا صاحب کو انقلابیوں نے اپنا سربراہ اور مختار تسلیم کرلیا۔ انگریزوں نے نانا صاحب کو باجی راؤ کا جانشیں تسلیم نہیں کیا تھا اس لیے وہ کانپور میں جلاوطنی کی زندگی گزار رہے تھے۔ 27 جون 1857 کو نانا صاحب نے کانپور فتح کرلیا۔ اودھ، جس کا الحاق 13 فروری 1856 کو من مانے ڈھنگ سے کمپنی حکومت نے کرلیا تھا اور نواب واجد علی شاہ کو کلکتہ بدر کردیا تھا، انقلاب کی کمان بیگم حضرت محل نے سنبھالی۔ بیگم حضرت محل کے صاحبزادے برجیس قدر نے 5 جولائی 1857 کو خود کے نواب ہونے کا اعلان کیا اور حکومت کے انتظام کی کمان سنبھال لی۔ بریلی میں روہیل کھنڈ کے سابق حکمراں کے جانشیں خان بہادر نے انقلاب کی دستک پر لبیّک کہا۔ ابتدا میں وہ کچھ پس وپیش کے شکار تھے لیکن انقلابیوں کی سرگرمی، کامیابی اور عوام کی حمایت نے انھیں سر پر کفن باندھنے پر مجبور کیا۔ انھوں نے چالیس ہزار سپاہیوں کی ایک فوج تیار کی اور انگریزوں کے خلاف برسرپیکار ہوگئے۔ جھانسی کی رانی لکشمی بائی نے انقلابیوں کی کمان سنبھالی اور 7 جولائی 1857 کو جھانسی کا قلعہ فتح کرلیا گیا۔ بہار میں جگدیش پور کے ستر سالہ زمیندار بابو کنور سنگھ نے انگریزوں کے خلاف علم بغاوت بلند کردیا۔ داناپور چھاؤنی کے باغی سپاہی جب ارہ پہنچے تو انھوں نے ان کی مدد سے 27 جولائی 1857 کو ارہ پہ قبضہ کر لیا۔ دلّی پر انقلابیوں کا قبضہ اور بہادر شاہ ظفر کی بادشاہت کمپنی حکومت کے ارباب اقتدار کے لیے ہر طرح سے ناقابل قبول تھی۔ انھیں اس بات کا احساس تھا کہ عوام کے تعاون سے اگر والیانِ ریاست اور انقلابیوں کے قدم جم گئے تو ہندوستان میں برطانوی سامراج کا خاتمہ ہوجائے گا۔ دلّی پر انقلابیوں کے قبضے کے وقت کمپنی حکومت کی افواج کے کمانڈر جنرل اینی سَن شملہ میں تعینات تھے۔ پنجاب کے کمشنر جان لارنس نے جنرل اینی سَن کو دلّی پر دوبارہ اقتدار قائم کرنے کی ہدایت دی۔ جنرل اینی سَن انبالہ ہوتے ہوئے کرنال پہنچا لیکن 27 جون 1857 کو دیگر سپاہیوں کے ساتھ ہیضے کا شکار ہوگیا۔ جنرل اینی سَن کے بعد کمپنی حکومت کے افواج کی کمان سر ہنری برناڈ نے سنبھالی۔ اس نے دلّی پر دوبارہ قابض ہونے کا منصوبہ تیار کیا اس منصوبے کو نافذ العمل کرنے کی حکمت عملی میں سپاہیوں کی تعداد میں اضافے کے ساتھ سازش، عیاری، نفاق، رشوت اور منافرت کے عنصر شامل تھے۔ اس منصوبے کے تحت میرٹھ کی ٹکری بریگیڈیئر ولسن کی قیادت میں باغپت آکر سر ہنری برناڈ سے مل گئی۔ اس فوج نے غازی نگر میں بنڈن ندی کے پاس انقلابیوں کو شکست دی۔ 8 جون 1857 کو اس نے دریائے جمنا کو عبور کیا۔ دلّی سے پانچ میل مغرب میں واقع باؤلی کی سرائے میں اس فوج کا مقابلہ انقلابیوں سے ہوا۔ اس مقابلے میں فتح حاصل کرکے انگریز افواج دلّی کی بیرونی پہاڑیوں اور پرانی چھاؤنی پہ قابض ہوگیا۔ انقلابیوں نے 10 جون 1857 کو عقب سے حملہ کیا لیکن انگریزی افواج مٹکاف ہاؤس پر قابض ہونے میں کامیاب ہوگئیں اور وہاں بھی ایک دستہ تعینات کردیا گیا۔ انگریز افواج اور انقلابیوں کے بیچ لڑائی جاری رہی۔ پنجاب سے کمپنی حکومت کی معاون افواج کی آمد سے ان کی نفری میں برابر اضافہ ہو رہا تھا۔ ایک وقت پر ان کی تعداد سات ہزار تک پہنچ گئی۔ شہنشاہِ ہند کے وفادار سپاہیوں کو بھی کمک مل رہی تھی۔ ترک سوار کی آمد کے بعد 2 جولائی 1857 کو کمانڈر بخت خان کی سربراہی میں بریلی سے کثیر تعداد میں افواج دہلی پہنچیں۔ بہادر شاہ ظفر نے بخت خاں کو مرزا مغل کی جگہ وفادار و جانثار افواج کا کمانڈران چیف بنادیا۔ کمپنی حکومت نے ایک حکمت عملی کے تحت عوام میں بدگمانی، بے اعتمادی اور حوصلہ شکنی پیدا کرنے کے لیے سازش، عیاری، نفاق، رشوت اور منافرت کا سہارا لیا۔ ہندو مسلم اور شیعہ سُنّی کے درمیان نفاق پیدا کرنے کی ہر ممکن کوشش کی گئی۔ بہادر شاہ ظفر کے متعلق یہ افواہ پھیلائی گئی کہ وہ اپنے مسلک سے منحرف ہوکر شیعہ ہوگئے ہیں۔ سر ہنری لارنس نے ایک میٹنگ طلب کر ہندوؤں کے ذہن میں یہ بات بیٹھانے کی کوشش کی کہ مسلمان صدیوں سے ان کا استحصال کر رہے ہیں۔ اگر مسلمانوں کی غلامی سے نجات حاصل کرنا ہے تو اِس جنگ میں ہندو انگریزوں کا ساتھ دیں۔ لارڈ کیننگ نے پٹیالہ، جند، نا کی سکھ ریاستوں اور راجستھان، نیپال، حیدرآباد اور گوالیار ایلچی بھیج کرکے اور خطوط روانہ کر مدد حاصل کرنے میں کامیابی حاصل کی۔

قلعہ معلّٰے بھی سازشوں سے مستثنیٰ نہ تھا۔ زمام حکومت وسلطنت کے حصول کے لیے در پردہ رسہ کشی جاری تھی۔ بہادر شاہ ظفر کے ولی عہد چھوٹے بھائی اور فیروز بخت کے ساتھ بادشاہ کے مقرب خاص احسان اللہ خاں اور محبوب علی خاں کے علاوہ دیگر سر برآوردہ افراد خصوصاً بیگمات نے سازش کا بازار گرم کر رکھا تھا۔ بخت خاں کو افواج کا کمانڈران چیف اور بااختیار بنانے کی وجہ سے مرزا مغل اور دوسرے شاہزادے نالاں تھے اور ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہو گئے۔ زینت محل انگریزوں سے ساز باز کرنے لگیں۔ انگریزوں نے بہادر شاہ ظفر کے سمدھی مرزا الٰہی بخش کو بلند عہدہ ومقام کا لالچ دے کر ملا لیا۔ اس طرح کمپنی حکومت نے ملکی حکومت کے سارے راز اور منصوبوں سے واقفیت حاصل کرلی۔ کمپنی حکومت نے جاسوسوں کو فقیروں اور سنیاسیوں کی بھیس میں ہندوستانی افسران اور عوام کے پاس انھیں ورغلانے کے لیے بھیجا۔ اس بے یقینی کے ماحول میں بہادر شاہ ظفر کی ناتوانی و نااہلی نے حالات کو مزید سنگین بنادیا۔ اس خلفشار اور انتشار کے عالم نے سب کو تذبذب میں مبتلا کردیا تھا۔ تاجر پیشہ، تعلیم یافتہ اور والیانِ ریاست نے نہ صرف انقلابیوں کی حمایت نہ کی بلکہ یہ سب انگریزوں کی حمایت اور تعاون میں سرگرم رہے۔ بہادر

شاہ ظفر نے بدامنی کو دور کرنے کے لیے دس ممبران کی ایک کمیٹی تشکیل دی لیکن وہ موثر ثابت نہ ہوسکی۔ بادشاہ کا خزانہ خالی تھا۔

مئی 1857 کے اختتام کے بعد مالی بحران نے سنگین صورت اختیار کرلی جس سے بدگمانی اور بدامنی کو ہوا ملی۔

کمپنی حکومت کی افواج کو اپنے جاسوسوں سے خبر مل رہی تھی کہ بادشاہ کے وفادار سپاہی تنخواہ کے لیے ہنگامہ آرائی پر آمادہ ہیں۔ ان میں بے چینی ہے جس کی وجہ سے کچھ سپاہی بد دل ہوکر بھاگ بھی رہے ہیں۔ انگریز افواج کا حوصلہ نیپال، پٹیالہ، جند، نابھ کی سکھ ریاستوں اور راجستھان، حیدرآباد اور گوالیار سے کمک ملنے کے بعد بڑھ گیا۔ اس کے علاوہ انگلستان سے تازہ دم افواج کی آمد نے کمپنی حکومت کی افواج کو مزید حوصلہ بخشا۔ جنرل ولسن نے سکھ اور گورکھا سپاہ کی مدد سے دلّی کو پورے طور پر گھیر لیا۔ اندرونی دلّی کا رابطہ کلّی طور پر بیرونی علاقے سے منقطع ہوگیا۔ بخت خاں کی قیادت میں بادشاہ کی وفادار افواج اور عوام نے داد شجاعت دیکر انگریز افواج کے حملوں کو پسپا کیا۔ یکم اگست 1857 کو کیے گئے حملے کے دوران انقلابیوں کی ٹکڑی انگریز افواج کی صفوں تک پہنچنے میں کامیاب ہوئیں لیکن تیز گولہ باری کی وجہ سے اسے پیچھے ہٹنا پڑا۔ دو مہینے تک مسلسل برسرپیکار رہنے کے بعد کوئی خاطر خواہ کامیابی نہ ملی۔ اس کی ایک وجہ جنگی حکمت عملی کا فقدان تھا......اس کے علاوہ جدید اسلحہ اور سامان جنگ کی فراہمی بھی نہیں کے برابر تھی۔ 8 اگست 1857 کو ایک المیہ ہوا۔

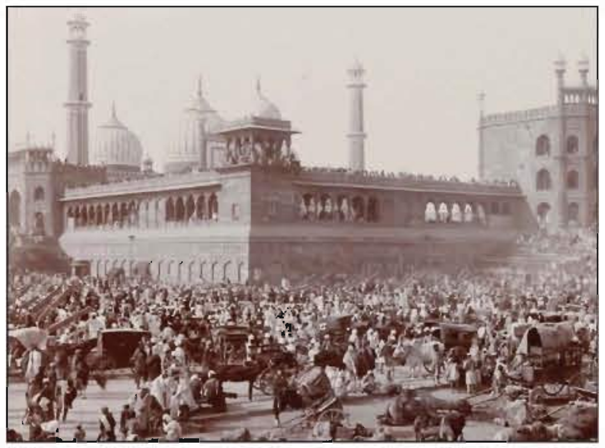

سازش کے تحت انقلابی افواج کا بارود خانہ ایک دھماکے سے تباہ ہوگیا۔ یہ بارود خانہ بیگم سُمرو کی حویلی میں تھا جو چوڑی والان میں واقع تھا۔ اس میں روزانہ سات سو من بارود تیار کیا جاتا تھا۔ دھماکے میں کارخانے میں کام کرنے والے سیکڑوں سپاہی بھی ہلاک ہو گئے۔ انقلابیوں کو بادشاہ کے رفیق حکیم احسن اللہ پر شک ہوا اس لیے ان کا گھر نذر آتش کردیا گیا۔ 11 ستمبر 1857 سے انگریزی توپ خانوں نے فصیلوں پر تیز گولہ باری شروع کردی۔ 13 ستمبر 1857 کو کشمیری گیٹ کی فصیل پر شق پڑ گئی۔ انگریز افواج کے لیے یہ ایک اہم کامیابی تھی۔ فوج کے کمانڈر ولسن اور اسمتھ نے حالات کا تجزیہ کرنے کے بعد آخری حملے کی منصوبہ بندی کی۔ انگریز افواج کو چار حصوں میں منقسم کیا گیا۔ پہلی ٹکڑی کو ولسن کی قیادت میں کشمیری گیٹ کے پاس کی فصیل میں پیدا شدہ شگاف پر حملہ کرنا تھا۔ جونس کی رہنمائی میں دوسری ٹکڑی کو پیدا شدہ شگاف کو کسٹم ہاؤس تک وسعت دینا تھا۔ کیمپ بیل کی قیادت میں تیسری ٹکڑی کو کشمیری گیٹ کو اڑا کر شہر میں داخل ہونا تھا۔ چوتھی ٹکڑی کو میجر ریڈ کی کمانڈ میں پہاڑیوں کی طرف سے تمام رکاوٹوں کو دور کرتے ہوئے لاہوری گیٹ کی طرف سے شہر میں داخل ہونا تھا۔ 14 ستمبر کی صبح دلّی شہر پر چو طرفہ حملہ کرکے فیصلہ کن لڑائی کی حکمت عملی تیار کی گئی۔ 14 ستمبر تک یعنی پانچ دن لگاتار شہر میں جنگ ہوتی رہی۔

20 ستمبر کو سلیم گڈھ قلعے اور لال قلعے میں انگریز افواج داخل ہوگئیں۔ لال قلعے میں کوئی زندہ نہ بچا۔ 19 ستمبر کو بہادر شاہ ظفر اور مغل شاہزادے پوشیدہ طور پر نظام الدین کے اطراف میں پناہ لے چکے تھے۔ غدّارِ ملک وقوم مرزا الٰہی بخش اور حکیم احسن اللہ خاں نے بہادر شاہ ظفر کو ہمایوں کے مقبرے میں منتقل ہونے پر راضی کرلیا۔ انگریزوں کے جاسوس مولوی رجب علی نے انگریز فوج کے کمانڈر ہڈسن کو اس کی اطلاع دی۔ 21 ستمبر کو ہڈسن پورے کرّ وفر کے ساتھ وہاں پہنچا۔ بہادر شاہ ظفر سے اس نے خودسپردگی کی مانگ کی اور بہادر شاہ ظفر نے بلا کسی مزاحمت کے اپنے آپ کو ان کے حوالے کردیا۔ انھیں بیل گاڑی میں بٹھا کر انگریزی کیمپ لایا گیا۔ 22 ستمبر کو گرفتار شدہ مغل شاہزادے مرزا مغل، مرزا ابوبکر، مرزا خضر سلطان اور مرزا امّد کو دیوانِ عام کے سامنے ہڈسن نے گولی ماردی اور ان کے سر کاٹ کر بہادر شاہ ظفر کو بطور تحفہ پیش کیا۔ ہڈسن نے گرفتار بہادشاہ ظفر کو لال قلعے کے دروازے پر سانڈرس کے حوالے کر دیا۔ گرفتار بادشاہ کو ناظر حسین مرزا کے مکان میں قید کردیا گیا۔ دہلی کو خیرآباد کہنے تک وہ اسی مکان میں رہے۔

دلّی پر انگریزوں کا قبضہ ہوگیا لیکن اس کی ایک بڑی قیمت انھیں ادا کرنی پڑی۔ اس جنگ میں تین ہزار آٹھ سو سینتیس (3837) انگریز سپاہی اور افسر مارے گئے۔ انگریز افسر ولسن کے خیال کے مطابق قریب چالیس ہزار انقلابی اور بادشاہ کے وفادار سپاہی اس جنگ میں شریک ہوئے۔ جاں بحق ہونے والے انقلابی اور سپاہیوں کی تعداد کیا رہی اس کی صحیح تعداد کا علم آج تک کسی کو نہیں ہے۔ دلّی پر تسلّط قائم کرنے کے بعد کمپنی حکومت اور انگریز افواج نے قتل، غارتگری، ظلم و بربریت کا ایسا ننگا ناچ کیا جس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ انتقام کی آگ میں بلاتفریق ہندوستانیوں کا قتل عام شروع کیا گیا۔ راستے میں جو ملا اسے گولی ماردی گئی۔ عمائدینِ شہر کی ایک بڑی تعداد کو عوام کے ساتھ گرفتار کرکے راج گھاٹ کی طرف لے جایا گیا۔ چودہ (14) ہزار افراد کو گولی مار کر لاشوں کو جمنا میں پھینک دیا گیا۔ عورتوں نے اپنے ناموس کی عزت وحفاظت کے لیے کنویں میں کود کر جان دے دی۔ لوگوں کی جائیداد ضبط کرلی گئیں اور وظیفے بند کردیے گئے......غالب جیسا باکمال شاعر اپنے وظیفے کے لیے دردر کی خاک پھانکنے پر مجبور ہوا۔

جامع مسجد کو اصطبل بنادیا گیا اس میں شراب نوشی کے ساتھ رقص وسرور کی محفلیں منعقد کی گئیں۔ فتح پوری مسجد کو ایک ہندو کے ہاتھ بیچ دیا گیا۔ اگلے بیس برسوں تک یہ مسجد اس کے قبضے میں رہی۔ شہر کی سب سے خوبصورت مسجد 'زینت المساجد' کو بسکٹ اور پاؤروٹی بنانے کے کارخانے میں تبدیل کردیا گیا۔ اگلے پچاس سالوں تک یہ کارخانہ اسی مسجد میں چلتا رہا۔ زندہ مسلمانوں کے جسم پر سور کی چربی لگا کر اسے سور کی کھال میں سلوا دیا گیا اور زندہ جلادیا گیا۔ انقلابیوں اور باشندگانِ دلّی کے جذبۂ حرّیت کے اظہار وعمل کی پاداش میں تمام اصول وضوابط کو درگزر کرکے انھیں تہہِ تیغ کیا گیا۔ ایسے انسانیت سوز مظالم سے خود انگریز بھی شرمسار ہوئے۔ جونٹ گری کے الفاظ میں:

"ہماری فوج کے شہر میں داخل ہونے پر تمام ایسے لوگ جو شہر کی چہار دیواری میں چلتے پھرتے نظر آئے سنگینوں سے وہیں ختم کردیے گئے۔ ایسے بدقسمت لوگوں کی تعداد بہت بڑی تھی......"

مسٹر جون لارنس نے فخریہ لکھا ہے:

"چونکہ یہ ہمارے خلاف لڑتے ہوئے گرفتار ہوئے اس لیے کسی رحم کے مستحق نہیں ہیں۔"

مندرجہ ذیل الفاظ لارڈ ابرسن کے ہیں:

"ان بدمعاش مسلمانوں کو بتادیا جائے کہ خدا کے حکم سے صرف انگریز ہندوستان پر حکومت کریں گے۔"

امرت سر کے انگریز کمشنر کا بیان ہے:

لیفٹیننٹ رابرٹس نے اپنے خط میں لکھا ہے:

"ہم پیشاور سے جہلم تک یا پیادہ سفر کرتے ہوئے پہنچے۔ راستے میں کچھ کام بھی کرتے چلے آئے یعنی باغیوں

سے اسلحہ چھیننا اوران کو پھانسی پہ لٹکانا۔اس کالوگوں پرخاص اثر ہوایعنی ہماری ہیبت ان کے دلوں میں بیٹھ گئی۔"

ایک انگریز گریفتھ نے 21 ستمبر 1857 کے منظر نامے کوان الفاظ میں پیش کیا ہے۔

"سڑکیں خالی اورویران تھیں۔دلّی موت کا ایک ایسا شہرلگ رہاتھاجہاں بہت بڑاالمیہ ہوا ہو۔اس دن شہر کے جن حصوں سے ہم گذرے وہ مکمل طور سے تباہ ہو چکے تھے۔ ہر طرف سپاہیوں اور عام شہریوں کی لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔"

مرزا غالب نے اس دور کی آنکھوں دیکھی تصویر ان الفاظ میں بیان کی ہے:

"یہاں میرے سامنے خون کا وسیع سمندر ہے۔ اور صرف اللہ ہی جانتا ہے کہ مجھے ابھی کیا کیا دیکھنا باقی ہے۔ میرے ہزاروں دوست مارے گئے۔کس کس کو یاد کروں، کس سے شکایت کروں؟ شاید میری موت پر آنسو بہانے کے لیے بھی کوئی نہیں بچا ہے۔"

بہادر شاہ ظفر کو گرفتاری کے بعد کینڈل کوگ ہِل کی نگرانی میں قید رکھا گیا۔ ان پر کمپنی حکومت کے خلاف بغاوت کا الزام عائد کر کے مقدمہ چلایا گیا۔ مقدمے کی کاروائی لال قلعے کے دیوان خاص میں عمل میں آئی۔ یہ کاروائی یوروپین فوجی کمیشن کے تحت کرنل ڈیوس کی صدارت میں 27 جنوری 1857 کو شروع ہوئی۔ 9مارچ 1858 کو مقدمے کا فیصلہ سنایا گیا۔

19اپریل 1858 کو میجر جنرل این پینی نے عدالت کے فیصلے کو منظور کرتے ہوئے سزا کی تصدیق کر دی۔ بہادر شاہ ظفر کو جلا وطن کر کے رنگون بھیجنے کی سزا دی گئی۔ 19اکتوبر 1858 کو تین پالکی نما گاڑیوں کے قافلے کی صورت میں بہادر شاہ ظفر، زینت محل، جواں بخت اور عباس شاہ کو دلّی سے رنگون کے لیے روانہ کر دیا گیا۔ چار سالہ جلاوطنی کا زمانہ اذیت ناک رہا۔ 7نومبر 1862 کی صبح ہندوستان کا معزول وجلاوطن بادشاہ دیارِغیر میں جسم وجاں کی قید سے آزاد ہوگیا۔اس کی تجہیز وتکفین کے لیے ایک ملاّ کی خدمات حاصل کی گئیں۔ 7نومبر کی شام 4 بجے ان کے جسم خاکی کو ساگوان کے صندوق میں رکھ کر سرخ رنگ کے سوتی کپڑے سے ڈھانپ کر اینٹوں کی قبر میں دفن کر دیا گیا اور اوپر سے مٹی ڈال کر زمین برابر کر دی گئی۔ بہادر شاہ ظفر نے قبل از مرگ دو وصیتیں کی تھیں۔

(1) ان کا جنازہ سپرد خاک کے لیے ان کے خاندانی قبرستان دہلی بھیجا جائے۔

(2) ان کی اولاد کو قید سے آزادی دی جائے۔

بہادر شاہ ظفر کی یہ دونوں آرزوئیں پوری نہ ہوئیں ان کا یہ شعر ان کی حسرت کو اجاگر کر گیا:

کتنا ہے بدنصیب ظفر دفن کے لیے
دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں

پہلی جنگ آزادی کی ناکامی اور دلی کی فتح کے بعد انگریزوں کی عسکری طاقت میں اضافہ ہوا۔انھیں اس بات کا یقین ہوگیا کہ ہندوستانیوں کا آپسی نفاق، مصلحت پسندی اور خودغرضی پورے ہندوستان پر غلبہ حاصل کرانے میں ان کی مددگار ثابت ہوگی۔ یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ ہندوستان کو غلامی کا طوق پہنانے کا کام انگریزوں سے زیادہ ہندوستانیوں نے انجام دیا۔قریب پچاس فیصد ہندوستانی سپاہیوں نے صرف بغاوت کا علم بلند نہ کیا بلکہ وہ ہم وطنوں اور انقلابیوں سے صف آرا ہو کر انگریزوں کی شکست کو فتح میں بدل دینے میں مددگار ثابت ہوئے۔ انگریزوں نے پانچ دستوں کی مدد سے دلّی پر قبضہ کرنے میں کامیابی حاصل کی ان میں سترہ سو(1700) انگریز سپاہی اور بتیس سو(3200) ہندوستانی سپاہی شامل تھے۔ کشمیری گیٹ کو اڑانے کا کام انجام دینے والوں میں چھ(6) انگریز افسر اور چوبیس ہندوستانی شامل

تھے۔ 20 ستمبر 1857 کو لال قلعے پر قابض ہونے کے بعد کمپنی حکومت یکے بعد دیگرے ہندوستانی ریاستوں پر قابض ہونے لگی۔ جھانسی کی رانی نے 18جون 1858 کو میدانِ جنگ میں جام شہادت نوش کیا۔انگریز افواج کے سپہ سالار جنرل ہیوز روز نے تمام تر اختلافات اور معرکہ آرائی کے باوجود رانی لکشمی بائی کو ان الفاظ میں خراج عقیدت پیش کیا۔

"یہاں وہ عورت سوئی ہے۔ جو باغیوں میں ایک ہی مرد تھی۔"

ناناصاحب نے انگریزوں کے سامنے سرخم کرنے سے انکار کر دیا۔ بہتر تیاری اور نئے عزم کے ساتھ دوبارہ جنگ آزادی کے خواب لے کر وہ 1859 کے شروع میں ہی نیپال چلے گئے۔ اعظم گڑھ میں انگریزوں سے منتخب معرکہ آرائی کے بعد بابو ویر کنور سنگھ دریا عبور کر کے جگدیش پور (آرہ) میں داخل ہو گئے۔ گنگا عبور کرتے ہوئے انگریز افواج نے ان پر گولیوں کی بارش کی۔ ایک گولی ان کی کلائی پر لگی۔ نفرت اور حقارت کے جذبے سے مغلوب ہو کر انھوں نے اپنا زخمی بازو گنگا کو سپرد کرتے ہوئے کہا۔

"ماتا! اپنے سپوت کی آخری قربانی قبول کر......"

کنور سنگھ نے 9 مئی 1858 کو آخری سانس لی۔ تانتیا ٹوپے نے اپنے سرفروشوں کے ساتھ اپریل (1859) تک گوریلا لڑائی جاری رکھی اور انگریزوں کو ان کی اوقات بتا دی۔ 21جنوری 1859 کو سکھ کی لڑائی میں انھیں شکست ہوئی لیکن وہ فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ مراعات کا طالب ایک زمیندار نے مخبری کر کے تانتیا ٹوپے کو 7اپریل 1859 کو گرفتار کروا دیا۔ انگریزوں نے 18اپریل 1859 کو انھیں پھانسی دے دی۔

پہلی جنگ آزادی کے بعد کی تصویر حالی نے ان اشعار میں پیش کی ہے:

تذکرہ دہلیِ مرحوم کا اے دوست
نہ سنا جائے گا ہم سے یہ فسانہ ہرگز
لے کے داغ آئے گا سینے پہ بہت اے سیاح
دیکھ اس شہر کے کھنڈروں میں نہ جانا ہرگز
چپے چپے پہ ہیں یاں گوہر یکتا تہہ خاک
دفن ہوگا نہ کہیں اتنا خزانہ ہرگز
مٹ گئے تیرے مٹانے کے نشاں بھی اب تو
اے فلک اس سے زیادہ نہ مٹانا ہرگز
جن کو زخموں کے حوادث سے اچھوتا سمجھیں
نظر آتا نہیں ایک ایسا گھرانہ ہرگز

1857 میں انگلینڈ میں عام انتخاب ہوئے۔ لارڈ پامسٹرن وزیراعظم منتخب کیے گئے۔

پامسٹرن کی پہل پر برطانوی پارلیامنٹ نے 13اگست 1858 کو ایک ایکٹ پاس کر کے ہندوستان میں کمپنی حکومت انتظامیہ اور افواج کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں لے لی۔ لارڈ کیننگ کو ہندوستان کا پہلا وائسرائے مقرر کیا گیا۔ گرمکھ نہال سنگھ نے یہ لکھا ہے کہ ہندوستان کی تاریخ کا یہ ایک اہم موڑ ہے کیونکہ اس ایکٹ کے تحت 1600 میں قائم ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کا خاتمہ کر کے حکومت برطانیہ کو عظیم الشان ہندوستان کا مالک ومختار بنا دیا گیا۔

1857 میں شروع ہوئی پہلی جنگ آزادی اپنوں کی غداری اور انگریزوں کی عیاری کے سبب ناکام ہوگئی۔ ملک و قوم کی روح پر ایک افسردگی چھا گئی۔

لارڈ میکالے نے 1835 میں لکھے اپنی تجویزات میں یہ تحریر کیا تھا کہ ہندوستانیوں کو انگریزی پڑھا کر ایسی نسل تیار کی جائے جو رنگ سے کالی اور ذہن سے انگریز پرست ہو۔

1835 میں انگریزی کو سرکاری زبان کا درجہ مل گیا۔ حکومت انگلشیہ کی حوصلہ افزائی سے ملک میں انگریزی ذریعۂ تعلیم کا ایک جال سا بچھ گیا۔ 1857 میں ہی کلکتہ، مدراس اور بمبئی میں یونی ورسٹی قائم کی گئی۔ والیان ریاست، نواب، زمیندار اور اشرافیہ طبقے نے ان تعلیمی اداروں کی سرپرستی کی۔

1857 تک دلّی اور اس کے نواح میں تقریباً ایک ہزار مدارس تھے۔ اِن مدارس میں لائق وفائق اساتذۂ کرام نے علم وعمل کی شمعیں جلا رکھی تھیں۔ 1858 کے بعد یہ سارے مدراس بند کر دیے گئے۔ بیشتر اساتذہ کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ جن ذرائع سے یہ مسلم تعلیمی ادارے زندہ تھے ان کی بیخ کنی کی گئی۔ جائیدادوں اور جاگیروں کی جس آمدنی پر ان مدرسوں کے تعلیمی نظام کا انحصار تھا انھیں ضبط کر لیا گیا۔ اس طرح مسلمانوں کو تعلیم بالخصوص مذہبی تعلیم سے بے بہرا کر کے منصوبہ بند طریقے سے نوجوان نسل کو دہریہ بنانے کی حکمت عملی اختیار کی گئی۔

حکومت انگلشیہ نے 1861 میں پولیس ایکٹ کے تحت پولیس کو بے انتہا اختیار عطا کیا لیکن ان کی تنخواہ قلیل رکھی گئی۔ اس کی ایک خاص وجہ یہ تھی کہ اس طرح پولیس کی غیر مشروط وفاداری حکومتِ انگلشیہ کے ساتھ رہے گی۔ اپنی ضروریات کے لیے پولیس ہندوستانی عوام کو لوٹنے گھسوٹنے پر مائل ہوگی۔ ان حالات میں پولیس کے افراد کو اپنی بقا کے لیے حکومت کی سرپرستی لازم رہے گی۔

1857 میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے چیئرمین کے یہ الفاظ برطانوی پارلیامنٹ میں گونجے تھے۔

"پروردگار نے ہندوستان کا وسیع وعریض ملک انگلستان کو اس لیے سونپا ہے کہ ہندوستان میں ایک سرے سے دوسرے تک عیسیٰ مسیح کا فاتحانہ جھنڈا لہرانے لگے۔ ہم میں سے ہر ایک کو اس اہم فریضہ کو انجام دینے میں اپنی تمام قوت صرف کر دینی چاہیے۔"

کنیڈی کے الفاظ میں:

"ہمارے خاص فرائض ہندوستان کی سر زمین پر عیسائیت کی تبلیغ کرنا ہے...... ہمیں اپنی ساری سیاسی طاقت اس میں لگا دینی چاہیے......"

اس نظریے اور منصوبے کو عمل میں لانے کے لیے لارڈ ولیم بینٹنگ، لارڈ ڈلہوزی، سرجان لارنس، ہنری لارنس اور سر رابرٹ، ماؤنٹ مگری وغیرہ ہر طرح سے فعال رہے۔ 1823 میں لارڈ بینٹنگ کے دورِ حکومت میں ایک قانون پاس کر کے عیسائی مذہب قبول کرنے والے کو وہ سارے حقوق عطا کر دیے گئے، جس میں خاندانی جائیداد میں حق کا حصول بھی شامل تھا۔

فتح مندی کے نشے میں انگریزوں نے انتقامی کارروائی کو صرف قتل وغارتگری اور استحصال تک محدود نہیں رکھا۔ انھوں نے مسلمانوں کے تشخص اور ذہن کو پامال کرنے کے لیے دلّی اور اس کے نواح میں قائم تعلیمی اداروں کو بالجبر بند کرا دیا۔ سر ولیم ہنٹر نے اپنی کتاب "ہمارے ہندوستانی مسلمان" میں لکھا ہے:

"سرکاری دفاتر میں مسلمان اب اس سے بڑھ کر کوئی امید نہیں رکھ سکتے کہ قلی چپراسی، دواتوں میں سیاہی ڈالنے والا یا قلموں کو ٹھیک کرنے کے سوا کوئی اور ملازمت حاصل کر سکیں۔"

ان معاندانہ پالیسیوں کا یہ نتیجہ نکلا کہ 1869 تک ایک بھی شریف اور آسودہ حال مسلمان باقی نہ رہا جو کسی سرکاری عہدے پر مامور ہو۔ علمائ، فضلا، نوابین، اور شرفا کی اولادیں سقہ اور لکڑ ہارا بن جانے پر مجبور ہو گئیں۔

1853 میں کمپنی حکومت نے 'انعام کمیشن' مقرر کیا تھا۔ اس کمیشن کے تحت والیانِ ریاست وحکومت کے ذریعے عطا کی گئی زمینوں کی جانچ شروع کی گئی۔ پہلی جنگ آزادی کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہا۔ کسی طرح کے ٹیکس سے مستثنیٰ زمینوں کو جو سیکڑوں برسوں سے زمینداروں کے قبضے میں چلی

آ رہی تھیں ضبط کر لیا گیا۔ ایک مختصر عرصے میں تقریباً بیس (20) ہزار سے زائد جاگیریں ضبط کر لی گئیں۔ اس طرح زمیندار، متوسط طبقہ اور کسان برباد گئے۔ انگریزوں کی شیطانی حکمت عملی نے بہت کم عرصے میں والیانِ ریاست کے ساتھ زمیندار، کسان، صنعت کار، تجارت پیشہ، کاریگر، معلّم اور ہنرمند وغیرہ کو مفلوک الحال بنا دیا۔ اس مفلوک الحالی نے ہندوستانی سماج میں ضمیر فروشوں کی ایک بڑی جماعت پیدا کر دی۔ یہ جماعت انگریزوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اپنا سب کچھ قربان کرنے کے لیے تیار رہا کرتی تھی۔

پہلی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد اربابِ حکومتِ انگلشیہ نے ہندوستانی تہذیب وثقافت کے ساتھ ساتھ مشرقی ادب پر بھی منظم ومؤثر حملہ کیا۔ انگریزی طرزِ تعلیم کو رائج کرنے کے ساتھ 'دارالترجمہ' کا قیام عمل میں لایا گیا۔ یہ بات شعوری یا غیر شعوری طور پر ذہن نشیں کرائی گئی کہ مغربی ادب ہی دانشوری کے معیار پر کھرا اترتا ہے۔ حامیان علی گڑھ تحریک اور زندہ دلان پنجاب نے اس خیال کو فروغ بخشا اور یہ وبا کی طرح ادب میں پھیل گیا۔ حالی نے علی الاعلان کہا:

حالی آؤ پیروِیِ مغرب کریں
بس اقتدائے مصحفی و میر ہو چکی

ماضی کی عظمت قصۂ پارینہ بن گئی۔ مستقبل کے اندیشوں اور تقاضوں نے نئے شعور کو فروغ بخشا جو حقیقت پرستی اور جدید تقاضوں پر مبنی تھا۔ فرسودہ عقائد، توہمات، اور مذہب کے ساتھ وابستہ بندشوں اور سماجی اونچ نیچ کی پابندیوں سے نجات کی آوازیں بھی ادبی وصحافتی تحریروں میں بلند ہوئیں۔ لمحاتی خوشی اور سرخوشی کی جگہ ادب میں تعمیری ومقصدی نظریات کو فروغ حاصل ہوا۔ سرسید احمد خاں، خواجہ الطاف حسین حالی، مولانا محمد حسین آزاد، شبلی نعمانی، ڈپٹی نذیر احمد، مولوی ذکاء اللہ، چراغ علی، محسن الملک اور وقار الملک نے ادب کی افادیت واہمیت پر زور دے کر اسے زندگی آمیز رخ عطا کیا۔ داستان کی جگہ ناول اور افسانوں کو شرف قبولیت حاصل ہوتی۔ مثنویوں کا دور ختم ہوا۔ قصیدے پر زوال آ گیا۔ مذہبی واخلاقی خیالات ونظریات کی جگہ فلسفیانہ موضوعات کو فوقیت ملی۔ مرصع نثر کی جگہ سادہ وسلیس نثر کو فروغ حاصل ہوا۔ ان سارے عمل اور کوششوں میں مرعوبیت اور سجدہ ریزی کا عنصر کارفرما تھا۔ علی گڑھ تحریک کے ہمنوا اور زندہ دلان پنجاب نے نہ صرف مغربی نظریات کو اردو ادب میں رائج کیا بلکہ اسے غلو کی حد تک لے گئے۔ انگریز دوستی نے انگریز پرستی کی شکل اختیار کر لی۔ خوشنودی اور خباثت ایک شعار بن گیا۔ خم نہ ہونے والے سر انگریز حاکمان کی قربت واطاعت کے لیے صف بستہ ہو گئے۔ بقول مصحفی:

ہندوستانیوں کی دولت وحشمت جو کچھ کہ تھی
کافر فرنگیوں نے بہ تدبیر کھینچ لی

پہلی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد غلامی کا طوق ہندوستانی عوام کا مقتدر بن گیا تھا۔ والیان ریاست، زمیندار، اور صاحب ثروت انگریز حکمراں کی نظر عنایت کے طالب بن گئے لیکن عوام میں حصول آزادی کا جذبہ برقرار رہا۔ وقت کے ساتھ ہندوستان کا معاشی اور صنعتی نظام بدلا۔ نئی تعلیم نے جدوجہد، ایثار اور قربانی کا نیا شعور عوام کو بخشا۔ رسل ورسائل کی ترقی، آمدو رفت کی سہولت اور صحافت کے فروغ نے ملک میں سیاسی شعور کو بالیدہ کیا۔ انجام کار طویل جدو جہد اور قربانی کے بعد 15اگست 1947 کو ہندوستان نے غلامی کا طوق اتار پھینکا۔

Masoom Aziz Kazmi, Rtd. IPS, Gaya, Bihar

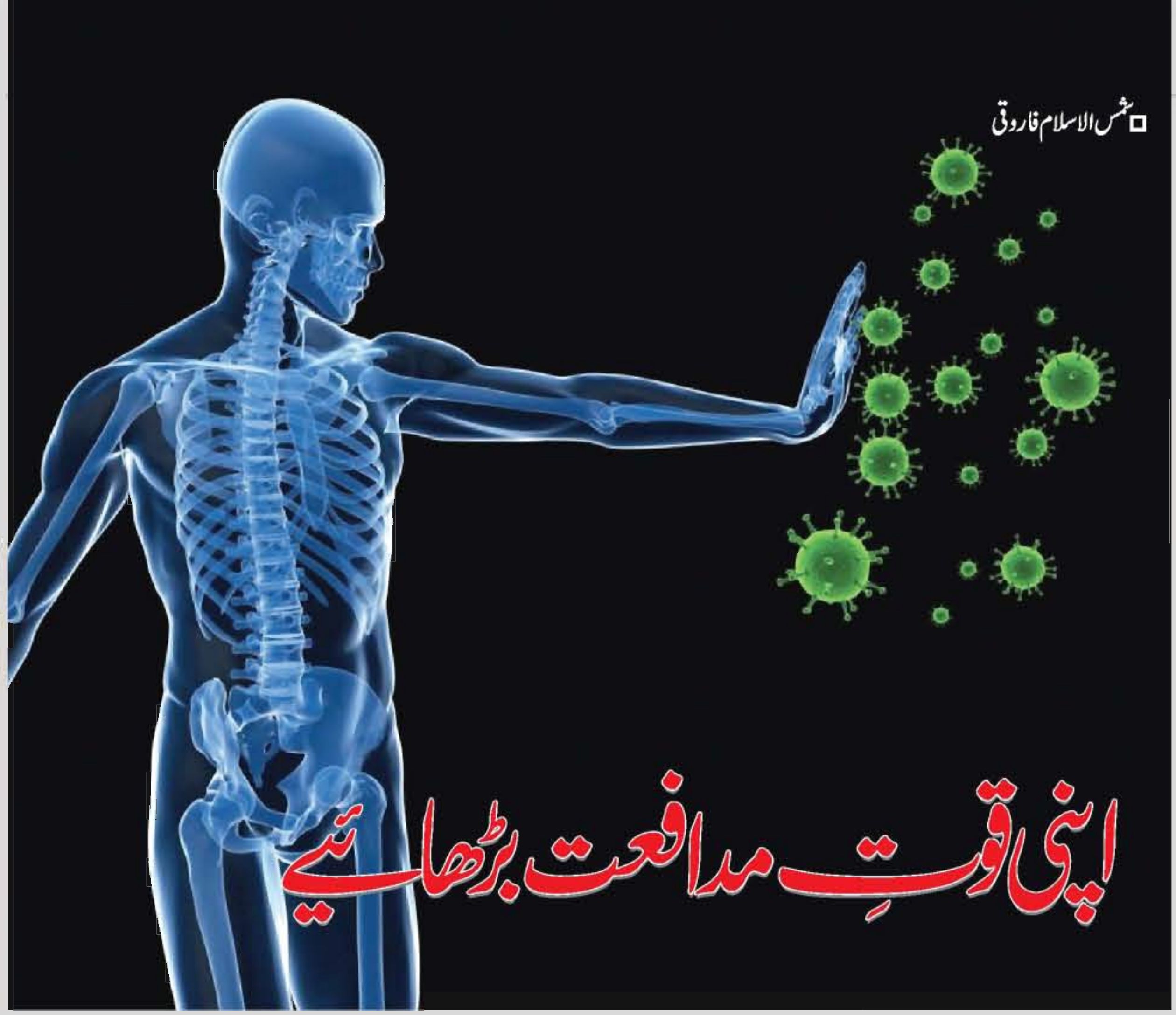

شمس الاسلام فاروقی

اپنی قوتِ مدافعت بڑھائیے

ہماری قوت مدافعت قدرت کا ایک بیش بہا تحفہ ہے، اس کے لیے جتنا بھی شکرادا کیا جائے کم ہے۔ ہمارا ماحول نظر نہ آنے والے بے شمار خورد بینی مہلک جراثیم سے بھرا پڑا ہے۔ سائنس دانوں کے اندازے کے مطابق ہر روز ہماری سانس کے ذریعے جو اشیا اور جراثیم ہماری ناک میں پہنچتے ہیں صرف اُن ہی کی تعداد 20 ملین ہے۔ یہ تو خالق کا انتہائی کرم ہے کہ ناک میں موجود رطوبت اور بال انھیں وہیں روک لیتے ہیں اور جسم کے اندر پہنچنے نہیں دیتے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو شاید ہمارا زندہ رہنا ہی ممکن نہ ہوتا۔ اس کے علاوہ کھانے پینے کے ساتھ یا پھر دوسرے لوگوں یا اشیا سے رابطے میں آنے سے بھی جراثیم ہمارے جسم میں راہ بنا لیتے ہیں۔ چوٹ لگ جائے یا جلد کٹ جائے تب بھی مختلف قسم کے جراثیم اور بیکٹر یا ہمارے جسم میں داخل ہوکر ہلاکت کا باعث بنتے ہیں مگر واہ ری قدرت جس نے ہمارے جسموں کے اندر ایسے کیمیائی مادّے اور سیلس پیدا کردیے ہیں جو ہمیں ان کے حملوں سے محفوظ رکھتے ہیں۔

ہمارے خون میں موجود کچھ وائٹ بلڈ سیلس ہمارے مدافعتی نظام کا ایک اہم حصہ ہیں۔ یہ سیلس فیگو سائٹس کہلاتے ہیں۔ خون کے اندر دوڑتے ہوئے یہ فیگو سائٹس جیسے ہی کسی جراثیم یا بیکٹر یا کے رابطے میں آتے ہیں وہ فوراً ہی انھیں نگل جاتے ہیں۔ جلد ہی ان سے ایک تیز کیمیائی مادہ سے جسے آکسی ڈینٹ کہتے ہیں افراز ہوکر انھیں گلا کر ہضم کردیتا ہے۔ علاوہ ازیں بعض مخصوص سیلس اینٹی باڈیز پیدا کر کے جسم کے اندر داخل ہونے والے جراثیم کو ختم کرنے میں مدد کرتے ہیں۔ ساتھ ہی کچھ دوسرے سیلس مخصوص قسم کے پروٹینس جیسے امیّو نوگلوبن اور انٹر فیرونس بھی پیدا کرتے ہیں۔ جن کا کام وائرسسز، بیکٹیر یا اور دیگر حملہ آور جراثیموں سے لڑکر انھیں ختم کردینا ہے۔ خون ہی میں کچھ مزید وائٹ بلڈ سیلس ہوتے ہیں جو جراثیموں سے لڑنے والے سیلس کہلاتے ہیں۔ انھیں ٹی۔ سیلس، بی۔ سیلس اور کِلر سیلس کے ناموں سے جانا جاتا ہے۔

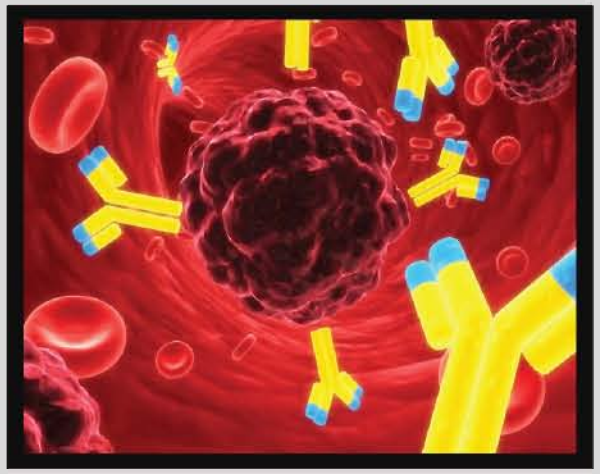

ہمارے جسم کی بعض کیفیات ہمارے مدافعتی نظام کو کمزور کرتی ہیں جیسے شکر کی بیماری ذیابیطس، شراب نوشی یا دیگر نشہ آور اشیا کا استعمال، سوئے تغذیہ یعنی ناقص اور ناکافی غذا کا استعمال۔ اس کے علاوہ دواؤں بالخصوص کینسر میں استعمال کی جانے والی تیز ادویات بھی مدافعتی نظام کی کمزوری کا باعث ہوتی ہیں۔ مختلف قسم کے جسمانی و ذہنی تناؤ اور غیر معمولی تھکاوٹ بھی جہاں ایک طرف دمے جیسی بیماریوں میں اضافہ کرتی ہیں، وہیں ان سے جسم کا مدافعتی نظام بھی کمزور ہوتا ہے۔ تجربات بتاتے ہیں کہ شہد اور دارچینی کا سفوف استعمال کرنے سے جسم میں بیکٹر یا اور وائرسسز کے خلاف لڑنے کی قوت میں اضافہ ہوجاتا ہے۔ سائنسدانوں نے معلوم کیا ہے کہ شہد میں کئی وٹامنس اور کثیر مقدار میں آئرن ہوتا ہے جو قوت مدافعت کو بڑھاتا ہے۔ پابندی سے شہد استعمال کرنے سے خون کے سفید ذرات قوی ہوتے ہیں اور وہ وائرسسز اور بیکٹیر یا کا زیادہ اچھی طرح مقابلہ کرپاتے ہیں۔

ہمارے مدافعتی نظام کو قوی بنانے کے لیے ایسے ہوادار مکانوں میں رہائش ہونا چاہیے جہاں ہوا کا گزر آر پار

ہو۔ اس کے ساتھ ہی ورزش کی پابندی، وہ سبھی طریقے جن سے ہر قسم کے ذہنی اور جسمانی تناؤ کم ہوتے ہوں، ایک متوازن غذا اور کم از کم چھ گھنٹوں کی اچھی نیند بھی انتہائی ضروری ہے۔

غذائیت سے بھرپور متوازن غذا ہر قسم کے جراثیمی حملوں سے محفوظ رہنے کے لیے بے حد ضروری ہے۔ اناج، دالیں، پھلیاں، خشک میوے، پتے دار اور دیگر سبزیاں، دودھ، پنیر اور پھلوں کو خصوصیت سے غذا میں شامل کرنا چاہیے۔ ان کے استعمال سے ہمارا جسم جراثیمی حملوں سے محفوظ رہتا ہے اور ہماری قوت مدافعت میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ دہی کا استعمال بھی مدافعتی نظام کو قوی بنانے میں اہم پایا گیا ہے۔ انٹرنیشنل جرنل آف امیّونولوجی میں شائع ایک رپورٹ کے مطابق 68 لوگوں کو تین مہینے تک روزانہ دو کپ دہی کھلایا گیا۔ دہی کے استعمال سے ان کے وائٹ بلڈ سیلس نے گاما۔ انٹر فیرون نامی کیمیا پیدا کردیے جو مدافعتی نظام کو قوی بنانے میں اہم رول ادا کرتے ہیں۔ مدافعتی نظام کو قوی بنانے میں کچھ وٹامنس اور منرلس بھی بہت اہمیت کے حامل ہیں۔ ان میں وٹامن۔ سی سرفہرست ہے۔ یہ وٹامن کچھ وائٹ بلڈ سیلس میں جو لمفوسائٹس کہلاتے ہیں جراثیم کے خلاف لڑنے کی قوت میں اضافہ کرتے ہیں اور ساتھ ہی اس کے استعمال سے جسم میں مختلف قسم کی بیماریوں سے لڑنے کی مجموعی قوت میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ اس لیے ان تمام اشیا کا استعمال مفید ہے جن میں وٹامن۔ سی پایا جاتا ہو۔ آملہ اس کا ایک بہترین ذریعہ ہے۔ جو لوگ پابندی سے آملے کے رَس کا استعمال کرتے ہیں وہ مختلف بیماریوں بالخصوص نزلہ، زکام، کھانسی وغیرہ سے بالکل ہی محفوظ رہتے ہیں۔

وٹامن۔ ڈی بھی مدافعتی نظام کو قوی بنانے میں بہت اہم ہے۔ اس کی کمی جسمانی مدافعت کو کمزور کردیتی ہے۔ اس وٹامن کا بہترین وسیلہ سورج کی روشنی ہے جس کے حصول کے لیے روزانہ کچھ وقت کے لیے جسمانی حصوں کو سورج کی روشنی کے سامنے لانا ضروری ہے۔

کمزور ہوتے ہوئے مدافعتی نظام کو قوی کرنے کے لیے ورزش ایک بہترین طریقہ ہے۔ پابندی کے ساتھ ورزش کرنے سے نہ صرف ہمارے عضلات اور ہڈیاں مضبوط ہوتی ہیں بلکہ دورانی نظام بھی بہتر ہوتا ہے۔ ورزش سے جسم کی فالتو کلوریز جل جاتی ہیں اور اس کے نتیجے میں جسم میں چربی کا جماؤ نہیں ہوپاتا۔ اس سلسلے میں یوگا بالخصوص سانس کی ورزشیں زیادہ مفید ہوتی ہیں۔

مایوسی اور نا امیدی کے خیالات مدافعتی نظام پر برا اثر ڈالتے ہیں جب کہ خوش دلی اور امید بھرے احساسات اُسے قوت بخشتے ہیں۔ جدید سائنس ایپی جنیٹکس بھی اس کی تصدیق کرتی ہے۔ اس کے مطابق ہمارے ڈی این اے مالیکیولس کے باہر موجود ایپی جنیٹک مارکس صاف ستھرے پاکیزہ ماحول، متوازن سادہ غذا، پاکیزہ اور نیک خیالات اور اچھے محبت بھرے عادات واطوار اُن جینس کو متحرک کرتے ہیں جو مدافعتی نظام کو قوی کرنے میں مددگار ہوں اور ان جینس کو ساکن اور غیر متحرک بنادیتے ہیں، جو مضر اور بیماریاں پھیلانے والے ہوں۔

■

Dr. Shamsul Islam Farooqi, 90-B/1, Ahata Tablib, Gali No.1, Noor Nagar, Jamia Nagar, Okhla, New Delhi - 110025

مختصراً آپ اپنی قوت مدافعت میں اضافہ کرنے کیلئے

1. ہمیشہ منہ سے سانس لیں تا کہ بہت سے جراثیم سے محفوظ رہ سکیں۔
2. غذائیت سے بھرپور متوازن غذا کھائیں جس میں سبزیوں اور پھلوں کا استعمال زیادہ ہو۔
3. روزانہ ایک چمچہ شہد اور دارچینی سفوف ملا کر استعمال کریں۔
4. علی الصباح نہار منہ اور سہ پہر کے وقت آملے کا رس پئیں۔
5. چہل قدمی کو معمول بنالیں اور ہلکی ورزش بالخصوص یوگا کی سانس والی ورزشیں ضرور کریں۔
6. رہائش کے لیے ہوادار مکان کا انتخاب کریں۔
7. مایوسی اور نا امیدی کے احساسات کو پاس نہ پھٹکنے دیں۔
8. خیالات اچھے رکھیں اور صاف ستھرے ادب کا مطالعہ کریں، پاکیزہ مجلسوں میں شامل ہوں۔

حسب ذیل سے اجتناب کریں

1. سیگرٹ نوشی نہ کریں کیونکہ اس سے وٹامن۔ سی کی سطح گھٹ جاتی ہے، جو مدافعتی نظام کے لیے نقصان ہے۔
2. شراب نوشی اور دیگر نشہ آور چیزوں کا استعمال نہ کریں کیونکہ نشہ بالآخر آپ کے اندر ڈپریشن اور مایوسی کے احساسات پیدا کرتا ہے جن سے مدافعتی نظام کمزور ہوتا ہے۔
3. چائے اور کافی اعتدال سے پئیں کیونکہ ان کی زیادتی آئرن کے انجذاب میں رکاوٹ پیدا کرتی ہے۔
4. جسمانی تھکاوٹ اور ذہنی تناؤ سے حتی الامکان بچنے کی کوشش کریں۔
5. گندے ماحول اور برے خیالات سے خود کو بچائیں۔

تبصرہ وتعارف

کلیات میر (جلداول ودوم)

مصنف: مرتب (جلداول): ظل عباس عباسی
تحقیق وترتیب (جلددوم): احمد محفوظ
زیرنگرانی: شمس الرحمٰن فاروقی

صفحات: جلداول: 870، جلددوم: 628

قیمت: جلداول: 340 روپے، جلددوم: 256 روپے
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئ دہلی
مبصر: عابدانور، ڈی 64، ابوالفضل، انکلیو، جامعہ نگر، نئ دہلی

اردو شاعری سے میرتقی میر کو حذف کردیا جائے تو ایک خلا سا پیدا ہوجائے گا، اردو شاعری کی تاریخ تشنہ رہ جائے گی۔ میرتقی میر نے نہ صرف اردو شاعری کا معیار مقرر کیا ہے بلکہ 'نکات شعراءٔ' لکھ کر شاعروں کی سوانح نگاری، تذکرہ نگاری اور تنقید نگاری کی بنیاد رکھی۔ بقول مولوی عبدالحق ''میرتقی میر سرتاج شعرائے اردو ہیں ان کا کلام اسی ذوق وشوق سے پڑھا جائے گا جیسے سعدی کا کلام فارسی میں، اگر دنیا کے ایسے شاعروں کی ایک فہرست تیار کی جائے جن کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا تو میر کا نام اس فہرست میں ضرور داخل ہوگا۔''

اردو شاعری میں میرتقی میر کا مقام اتنا بلند وبالا ہے کہ انھیں پرکھنے کی کوشش میں بڑے بڑے ادیبوں کی ٹوپیاں گرجاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے دور میں بہت سے کمزور شعرا نے شعر کہنا چھوڑ دیا تھا۔ کیوں کہ انھوں نے شاعری کے جو معیار مقرر کیے تھے وہ انھیں پورا نہیں کرتے تھے کیونکہ وہ شعری فن کے معاملے میں بہت سخت تھے۔ وہ اپنی شاعری میں فنی کمال کے عروج پر تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہ لکھنؤ گئے تو ان کی شاعری کی دھوم مچ گئی۔ وہ اپنے فن میں یکتائے روزگار تھے۔ بقول سید عبداللہ: ''بعض صاحب کمال ایسے ہوتے ہیں جن کے فن کی نمایاں خصوصیت نہ صرف اپنے دور کو متاثر کرتی ہے بلکہ مستقبل میں بھی لوگ ان کی طرز خاص کو مانتے ہیں میر بھی ایسے ہی صاحب کمال ہیں''۔ میرتقی میر نے جس صنف پرطبع آزمائی کی اس کو وقار بخش دیا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ غزل کی آبرو کہلائے۔ بقول رشید احمد صدیقی، ''غزل شاعری کی آبرو ہے اور میر غزل کے بادشاہ ہیں۔'' ایک اور جگہ لکھتے ہیں، ''میر کی بات دل سے نکلتی ہے اور سامع کے دل میں جگہ کرلیتی ہے۔''

اک بات کہیں گے انشا تمھیں ریختہ کہتے عمر ہوئی
تم لاکھ جہان کا علم پڑھے کوئی میر سا شعر کہا تم نے

کلام میر کی بہت سی اشاعتیں ہوئی ہیں مگر میر کے مکمل کلام کی یکجا تدوین نہیں ہوسکی تھی، قومی کونسل نے اس سمت میں ایک اچھا کام کیا ہے کہ کلیات میر کو ازسرنو مرتب کروایا ہے۔ اس طرح میر کا کلام یکجا ہوگیا ہے۔ ظل عباس عباسی نے میر کا کلیات مرتب کیا تھا مگر اس کی ایک ہی جلد شائع ہوسکی تھی۔ اس کے علاوہ اس میں کچھ غلطیاں بھی رہ گئی تھیں اس لیے قومی کونسل نے متن کی تصحیح، تدوین اور ترتیب کا کام ایک ایسے شخص کو سونپا جسے کلام میر سے خصوصی لگاؤ ہے اور جنھوں نے میر پر تحقیقی کام کیا ہے۔

کلیات میر کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں میر سے متعلق شمس الرحمان فاروقی کے دو مضامین، رشید احمد صدیقی، قاضی عبدالودود، ظل عباس عباسی، آل احمد سرور، فراق گورکھپوری، محمد حسن عسکری، گوپی چند نارنگ کے مضامین شامل ہیں۔ فاروقی صاحب نے اپنے مضمون میں میر کے حوالے سے بہت ہی عمدہ گفتگو کی ہے اور میر کے ممیّزات پر عالمانہ گفتگو کی ہے۔ انھوں نے اپنے مضمون کے آغاز میں لکھا ہے ''محمد حسن عسکری نے ایک تقریر میں بڑی عمدہ بات کہی تھی کہ ''لوگوں نے اردو کے ہر بڑے شاعر کی عظمت سے انکار کیا ہے مگر میر کا منکر ڈھونڈنے سے ہی ملے تو ملے''۔ انھوں نے اس بات کو آگے نہیں بڑھایا ورنہ وہ اس سوال تک ضرور پہنچتے کہ ایسا کیوں ہے؟ میر میں ایسی کون سی خاص بات ہے کہ ناسخ کی طرح سب ہی کہتے ہیں کہ:

شبہ ناسخ ہے کسے میر کی استادی کا آپ بے بہرہ ہے جو معتقد نہیں

خیال رہے کہ مضمون، کہ سبھی میری استادی کے قائل ہیں، میر کا ہے:

ریختہ رتبے کو پہنچایا ہوا اس کا ہے معتقد کون نہیں میر کی استادی کا

یعنی میر کی عظمت کے معاملے میں سبھی لوگ میر کے ہم خیال ہیں)۔ اگر یہ کہا جائے کہ میر کی عظمت سے کسی نے انکار اس لیے نہیں کیا کہ انھیں خدائے سخن کہا جاتا ہے، تو یہ استدلال سراسر دوری (Circular) ہے، کیوں کہ اسی بات کو یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ چوں کہ میر کو خدائے سخن کہتے ہیں اس لیے کسی نے ان کی عظمت سے انکار نہیں کیا۔ ظاہر ہے کہ دونوں بیانات محتاج ثبوت ہیں اور ان میں دعوے کو دلیل سمجھ لیا گیا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ میر کا کلام ہر زمانے میں مقبول رہا ہے تو بھی کوئی دلیل نہیں بنتی۔ مقبول تو ان شعراء کا کلام بھی رہا ہے، اور ہے، جن کی عظمت کے منکرین بھی موجود رہے ہیں۔ مثلاً اقبال کے کلام کی مقبولیت میں کوئی شک نہیں، لیکن ان کے منکرین ہر زمانے میں رہے ہیں، کبھی اکا دکا اور کبھی کثیر تعداد میں۔ جس تقریر کا میں نے ذکر کیا، اس میں حسن عسکری نے اردو غزل اور فارسی غزل کے حوالے سے کچھ بہت بنیادی باتیں کہی تھیں۔ ان پر غور کیا جائے تو شاید اس سوال کا جواب ڈھونڈنے میں مدد ملے کہ میر کی عظمت کا اقرار سبھی نے کیا تو کیوں کیا''۔

اس کلیات کو نہایت عرق ریزی اور محنت شاقہ کے بعد شائع کیا گیا ہے۔ شمس الرحمان فاروقی کی نگرانی میں اس کلیات کو تصحیح واضافے کا کام احمد محفوظ نے انجام دیا ہے۔ انھوں نے اپنے دیباچہ اول میں لکھا ہے کہ'' زیر نظر کلیات میں متن کو درست کرنے کے علاوہ میر کا وہ غیر متداول کلام بھی شامل کردیا گیا ہے جو دیوان اول نسخہ محمود آباد اور کلیات میر نسخہ نول کشور (اشاعت اول 1868) میں شامل ہے۔ ظل عباسی مرحوم نے میر کے غیر مطبوعہ کلام کو کلیات میر کی دوسری جلد میں شامل کرنے کا ارادہ کیا تھا جس کا ذکر انھوں

نے کلیات کی جلد اول کی ''خصوصیات'' کے زیر عنوان کردیا تھا لیکن موت نے انھیں فرصت نہ دی اور وہ دوسری جلد کی ترتیب کا کام نہیں کر سکے''۔

کلیات اول میں میر کے کلام کے ساتھ مشاہیر ادیب کے مضامین کو شامل کیا گیا جس سے میر کے دیوانوں کے لیے مواد فراہم ہوتا ہے اور میر کا مختلف زاویوں سے مطالعہ کرنے کا موقع ملتا ہے۔ پروفیسر آل احمد سرور اپنے مضمون ''میر کے مطالعہ کی اہمیت'' میں میر کی شاعری کا ذکر تے ہوئے لکھتے ہیں کہ'' میر کی شاعری کی اہمیت کے اسباب ظاہر ہیں۔ ان کے خیالات میں گہرائی، جذبات میں خلوص اور اظہار میں کیفیت ہے۔ یوں تو ان کی نظر انتخابی ہے یعنی زندگی کے مخصوص پہلوؤں کی زیادہ کامیاب مصوری کرتے ہیں۔ مگر انتخاب میں بھی قوس وقزح کی سی دلآ ویزی اور رنگا رنگی ہے۔ وہ اپنی ذاتی زندگی کے اور اپنے ماحول دونوں میں کئی بڑے بڑے طوفانوں سے گزرتے ہیں''۔

کلیات کی جلد اول میں فہرست غزلیات ردیف وار، دیوان اول، دیوان سوم، دیوان چہارم، دیوان پنجم، دیوان ششم، ہے۔ دیوان اول میں ردیف الف کے تحت میر کا کلام ہے۔

کلیات میر دوم میں احمد محفوظ نے قصیدہ، مثنوی، مرثیہ وغیرہ کو جمع کیا ہے۔ اس میں انھوں نے دیباچہ اول اور دوم لکھا ہے۔ اسی کے ساتھ اس کلیات کی اہمیت شمس الرحمان فاروقی کے اس مضمون سے بڑھ جاتی ہے جس کا عنوان ہے 'میر صاحب کا زندہ عجائب گھر: کچھ تعجب نہیں خدائی ہے'۔ اس مضمون میں شمس الرحمان فاروقی نے میر کی قصیدہ نگاری، مثنوی اور مرثیہ کا جائزہ لیا ہے۔ بہت سی ایسی باتوں سے پردہ اٹھایا ہے جس سے ادبی دینا نا آشنا تھی۔ فاروقی صاحب نے میر کی عظمت بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ'' میر کا معاملہ نظیر اور اکبر دونوں سے الگ ہے۔ یہ ہے ہی کہ میر نے ڈھونڈ ڈھونڈ کر اپنی غزلوں میں تازہ الفاظ استعمال کیے ہیں۔ ایک دیگر جگہ انھوں نے لکھا ہے کہ'' پیکر استعارہ، مناسبت الفاظ، چھوٹی چھوٹی اشیا سے شغف اور ان کو بڑی چیز بنا دینا (مثلاً عشق کو 'آتش باز' کہنا، کہ آتش بازی معمولی بات ہے اور عشق بڑی بات، لیکن یہاں ان کا جوڑ کس قدر خوبصورت ہے، یہ کہنے کی ضرورت نہیں۔) جانور، اشیا، زندگی سے شغف، زبان پر ایسی مہارت کہ حد سحر کو بھی پار کر جائے، ان سب باتوں میں شیکسپیئر اور میر ہم پلہ ہیں''۔

یہ اچھی بات ہے قومی اردو کونسل نے ماضی کے قیمتی ورثے کی بازیافت کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ ان کتابوں کو از سر نو شائع کرنے کا عزم مصمم کیا ہے جو نایاب ہونے کے دہانے پر پہنچ چکی ہیں۔ ڈاکٹر خواجہ اکرام الدین نے اس کتاب کے پیش لفظ میں اس کی طرف بہت ہی خوبصورت انداز میں اشارہ کرتے ہوئے کونسل کے ایک اہم مقصد کو بیان کیا ہے۔'' اردو کی ادبی اور تہذیبی روایت سے نئی نسل کا بامعنی رشتہ قائم ہوسکے اور ساتھ ہی اردو زبان کے پھلنے پھولنے کی راہیں ہموار ہوں۔ اس مقصد کے حصول کے لیے قومی اردو کونسل کئی منصوبوں پر بیک وقت عمل پیرا ہے۔ انھیں میں سے ایک اہم منصوبہ اردو کی ان قدیم علمی اور ادبی کتابوں کی مکرر اشاعت بھی ہے۔ جو اردو زبان کے ارتقائی سفر میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں لیکن رفتہ رفتہ نایاب ہوتی جا رہی ہے۔ ان میں ادبی کتابوں کی اشاعت اس لیے بھی وقت کی اہم ضرورت ہے کہ یہ ماضی کا قیمتی ورثہ ہی نہیں بلکہ ایسا سرمایہ ہے جس سے رشتہ قائم کیے بغیر ہم اپنی زبان ادبی تہذیب کی حقیقی قدر و قیمت کا سچا احساس نہیں کر سکتے''۔

کلیات میر اول و دوم مجموعی طور پر ایسا کارنامہ ہے جو کسی ایک شخص کے بس کی بات نہیں تھی۔ اس کی تدوین و ترتیب میں یقینی طور پر شمس الرحمان فاروقی کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ جامعہ ملیہ کے شعبہ اردو کے استاد احمد محفوظ نے بھی نہایت عرق ریزی سے کام کیا ہے۔ اس کلیات کے متن کی تصحیح، املا کی درستگی اور اشعار کی صحت کا باریکی سے جائزہ لیا۔ یہ کام آنے والی نسل کے لیے بہت بڑا کارنامہ ہے۔

اشاعت کی ذمے داری شمس الرحمان فاروقی جیسے ماہر میر کے سپرد کی۔ یقیناً تشنگان ادب کے لیے یہ عظیم تحفہ ہے۔ کتاب کی اشاعت کے لیے قومی کونسل برائے فروغ زبان اردو مبارکباد کے لائق اور مستحق ہے۔

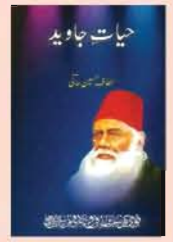

حیات جاوید

مصنّف: خواجہ الطاف حسین حالیؔ
صفحات: 907، قیمت: 250 روپے، چھٹی طباعت: 2013
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی
مبصّر: عبدالسّلام صدّیقی، B -N/139، قادری مسجد گلی
ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی

مولانا حالی نے مختلف موضوعات پر کتابیں لکھیں۔ ان کی مشہور کتابوں میں مقدمۂ شعر وشاعری، یادگار غالب، حیات جاوید اور حیات سعدی وغیرہ ہیں۔ حیات جاوید مولانا حالی کی مشہور کتاب ہے، جس میں سرسید کی سوانح پیش کی گئی ہے۔ اس میں انھوں نے سرسید کی شخصیت اور ان کے کارناموں کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ حالی سرسید کی خدمات کے معترف تھے اور ان کے عقیدت مند بھی۔ اس وجہ سے انھوں نے اپنا سارا زور قلم سرسید کی زندگی کے روشن پہلوؤں کو ابھارنے میں صرف کر دیا۔ حتی الامکان ان کی خامیوں پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی ہے۔

حیات جاوید کو مولانا حالی نے سہولت کے لیے دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے حصے میں سرسید کی زندگی کے تمام واقعات اور ان کے کام شروع سے آخر تک ترتیب وار تاریخ کے ساتھ بیان کیے ہیں۔ دوسرے حصے میں ان کی پوری زندگی اور کارناموں پر تبصرہ ہے۔ سرسید کی زندگی کا نمایاں حصہ جو 1857 غدر کے زمانے سے شروع ہوتا ہے۔ اس کے متعلق زیادہ تر حالات علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، تہذیب الاخلاق اور خطبات احمدیہ سے لیے گئے ہیں۔ بہت سی معلومات ان کے دوستوں کی زبانی یا سرسید کے خطوط سے لی گئیں ہیں جو انھوں نے وقتاً فوقتاً اپنے دوستوں کو لکھے تھے۔ اس کے علاوہ سرکاری رپورٹوں، انگریزی اخباروں اور بعض سلطنت کے مصاحبوں کی تحریروں اور معتبر ذرائع سے جن کی ہر موقع پر تصریح کی گئی ہے سے حاصل کی گئی ہیں۔

غدر 1857 سے قبل کے حالات ان کی قدیم کتابوں سے جو غدر سے پہلے لکھی گئیں تھیں یا سیرت فریدیہ سے جو حال ہی میں سرسید نے اپنے نانا کے حالات پر لکھی تھی یا ان کے بعض رشتے داروں کی زبانی حاصل کی گئی ہیں، زیادہ تر معلومات ایک مختصر تذکرہ جو مخدومی خاں بہادر غلام نبی خان نے 1894 مولانا حالی کی درخواست پر میرٹھ سے ایک رسالے کی صورت میں خود لکھ کر بھیجا تھا، سے حاصل کی گئیں ہیں۔ خاص طور سے خاندان، بچپن اور تعلیم کے حالات خود سرسید کی زبانی تحریر کیے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ کرنل گریہم کی کتاب اور منشی سراج الدین کے مسودات سے بھی لیے گئے ہیں۔ ان رسالوں اور اخباروں سے بھی اس سلسلے میں مواد اکٹھا کیا گیا ہے، جو کبھی کبھی جاری ہوئے۔ ان کے اخلاق و عادات کے متعلق معلومات کچھ حالی کی اپنی خاص واقفیت اور ان کے کچھ قدیم دوستوں کے بیانات سے اخذ کیے گئے ہیں۔

اس میں شک نہیں کی سرسید کی سوانح اگر ان کی زندگی میں شائع ہو جاتی تو وہ عظمت جس کی وہ مستحق تھی اس کو حاصل ہونا دشوار تھی۔ مگر ایک خاص وجہ سے ہم کو اس بات کا افسوس رہ گیا کہ وہ ان کی زندگی میں شائع نہ ہوسکی۔ بقول حالی'' سرسید کے سامنے جب کبھی ان کی لائف لکھنے کا ارادہ ظاہر کیا جاتا تھا تو وہ ہمیشہ یہ کہا کرتے تھے:۔

'' میری لائف میں سوا اس کے کہ لڑکپن میں خوب کبڈیاں کھیلیں، کنکوے اڑائے، کبوتر پالے، ناچ مجرے دیکھے اور بڑے ہو کر نیچری کافر اور بے دین کہلائے اور رکھا ہی کیا ہے۔''

مگر آخری وقت میں جیسا کہ عام انسانی طبیعت کا خاصہ ہے ان کو اس بات کا تجسس تھا کہ آخر ان کی (BIOGRAPHY) سوانح میں کیا لکھا جا رہا ہے۔ اسی وجہ سے وہ اپنی بایوگرافی کے شائع ہونے کے مشتاق معلوم ہوتے تھے۔ یہ بات قرین قیاس ہے کہ جس شخص نے 40 سال مذہب کی حمایت میں بسر کیا ہو اور سوائے الزام کفر اور ذلت کے قوم کی طرف سے کچھ انعام نہ پایا ہو اس سے زیادہ کون شخص اس بات کے دیکھنے کا خواہش مند ہوسکتا ہے کہ کوئی مسلمان اس کی مذہبی کتاب پر انصاف کی نظر سے بحث کرے۔

مولانا حالی کہتے ہیں کہ اگر ہم کو یہ معلوم ہو جاتا کہ سرسید کا وقت قریب آ پہنچا ہے تو کم از کم جو کچھ ہم نے ان کی مذہبی خدمات کے تعلق سے لکھا ہے وہ ضرور ان کی نظر سے گزار دیتے۔ مگر ہم کو امید ہے کہ جو دائمی سرور اور روحانی خوشی مرنے کے بعد ان کو اپنی خالص اور بے ریا خدمات کے صلے میں حاصل ہوئی ہوگی اس نے دنیا کی ناچیز و حقیر قدر دانیوں سے ان کو ہمیشہ ہمیش کے لیے مستغنی کر دیا ہوگا۔ حیات جاوید میں مولانا کہتے ہیں کہ دنیا کے بڑے سے بڑے انسانوں کی زندگی بظاہر اسی طرح شروع ہوتی ہے جس طرح عام انسانوں کی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔

سرسید کی زندگی میں کوئی ایسا کرشمہ صاف اور صریح نظر نہیں آتا جس سے ان کی آئندہ زندگی کی عظمت کا سراغ لگ سکے مگر جب ان کی اعلیٰ قابلیتوں کے جوہر دھیرے دھیرے اپنے موقع پر ظاہر ہوتے ہیں اس وقت معلوم ہوتا ہے کہ جو معمولی باتیں ان کی ابتدائی حالت میں ناچیز اور کم وزن نظر آتی تھیں وہی ان کی آئندہ کی ترقیات کی بنیاد تھیں۔ جہاں جہاں سرسید کی ترقی کے اسباب بیان کیے گئے ہیں اور دکھایا گیا ہے کہ جو کچھ ان سے چالیس برس بعد ظہور میں آیا وہ اس کے لیے بچپن ہی سے تیار ہو رہے تھے۔ اس طرح حیات جاوید سے سرسید کی پوری زندگی کا عکس ہمیں دیکھنے کو ملتا ہے۔ اس میں ان کی خوبیاں اور خامیاں دونوں بیان کی گئیں ہیں۔ اس اعتبار سے یہ کتاب حالی کی بہترین کتاب ہے۔ جس میں سرسید کی پوری زندگی کا احاطہ کیا گیا ہے۔ سرسید کے بارے میں کوئی بھی مضمون لکھنے والا اس کتاب کو حوالے کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ اردو ادب میں اس کی اس نوعیت کے اعتبار سے بڑی اہمیت رہے گی۔

شوگر اسٹریٹ

مصنف: نجیب محفوظ، مترجم: ظفر امام
صفحات: 238 قیمت: -/68
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
مبصر: محمد رضوان خان
ایم، ایم، آئی، پی D-307، دعوت نگر، ابوالفضل انکلیو، اوکھلا، نگر نئی دہلی

'شوگر اسٹریٹ' مصر کے معروف ترقی پسند مصنف نجیب محفوظ کی شہرہ آفاق تصنیف ہے، یہ پہلے عرب مصنف تھے جن کو 1988 میں نوبل انعام برائے ادب سے نوازا گیا۔ نجیب محفوظ قاہرہ میں پیدا ہوئے انھوں نے سترہ سال کی عمر میں لکھنا شروع کیا جب ان کی پہلی تصنیف آئی اس وقت ان کی عمر اڑتیس سال تھی۔ انھوں نے تقریباً پچاس ناول اور سیکڑوں کہانیاں لکھیں۔ چند سال قبل ان کی ایک کلیات پانچ جلدوں میں جو تین ہزار صفحات پر مشتمل ہے شائع ہو کر مقبول ہوئی، اس کے علاوہ انھوں نے دو سو سے زیادہ مضامین لکھے ہیں۔ پچاس کی دہائی میں ان کے تین ناولوں پر مشتمل 'ثلاثیۃ القاھرۃ' (قاہرہ ٹرائلوجی) شائع ہوئی، جو کافی معروف ہوئی۔ اس کا پہلا حصہ 1956 میں 'محل تا محل' دوسرا حصہ 1957 میں 'قصر شوق' اور تیسرا حصہ 1959 میں 'کوچہ شیریں' کے نام سے شائع ہوا۔ نجیب محفوظ کا متنازع ناول 'اولاد حارتنا' (جبلاوی کے بیٹے) جب الاہرام میں شائع ہوا تو ایک ہنگامہ کھڑا ہو گیا، جس کی وجہ سے انھیں 'مذہب کا گستاخ' قرار دیا گیا اور ناول کی اشاعت روک دی گئی، مگر صدر جمال عبدالناصر کے ذاتی فیصلے کے بعد اس کی اشاعت ممکن ہوسکی۔ اس ناول کو مصر میں کوئی پبلیشر شائع کرنے پر تیار نہ تھا، اس لیے یہ پہلی بار لبنان سے شائع ہوا۔

'شوگر اسٹریٹ' نجیب محفوظ کی عربی کتاب 'السکریۃ' کا انگریزی ترجمہ ہے، زیر نظر کتاب تلخیص کے ساتھ اس کا اردو ترجمہ ہے۔

'شوگر اسٹریٹ' دراصل مصر کے شہر قاہرہ کی ایک گلی کا نام ہے۔ یہ کتاب اس گلی میں رہنے والوں کی سرگذشت ہے۔ مصنف نے اس میں اپنی ذہانت، چابک دستی اور مہارت سے اس گلی کے رہنے والوں کی حکایت اس خوبی سے بیان کی ہے کہ ان کی تاریخ مرتب ہوگئی ہے۔ اس داستان کا محور سید احمد عبدالجواد اور اس کا خاندان ہے۔ اس ایک خاندان کے قصے کو نجیب محفوظ نے اپنے فن داستان گوئی سے اس ملک کے باشندوں کی دو صدیوں کی تاریخ مرتب کر دی ہے۔ اس کتاب کے ذریعے انیسویں صدی کے آخری دہائی اور بیسویں صدی کے وسط کے مشکل لحات کا ایک خوب صورت اور اچھا تجزیاتی مطالعہ ہمارے سامنے آ جاتا ہے۔ اور نئی صدی کی آمد سے نئی فضا کی بازگشت بھی سنائی دیتی ہے۔ اس کتاب کا سب سے نمایاں پہلو یہ ہے کہ اس میں مصر کی آزادی اور اس کے بعد نئے مصر کی داستان کو بڑے ہی انوکھے اور خوب صورت انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مصنف کو بدلتے ہوئے حالات اور نئی فضا نے ایک الگ انداز سے داستان حیات لکھنے پر مجبور کیا تھا۔

نجیب محفوظ کی زبان عربی ہے اس لیے ان کی داستانوں میں عربی طرز اور اسلوب کی جھلک نظر آتی ہے۔ چوں کہ یہ کتاب انگریزی سے اردو میں تلخیص ہے اس وجہ سے اس میں اصل کتاب کی بات نہیں پائی جاتی۔ بہتر ہوتا کہ تلخیص کے بجائے مکمل کتاب کا ترجمہ کیا جاتا۔ اس سے کتاب: روانی، تازگی اور ناول کا ذائقہ برقرار رہتا اور قاری کی دل چسپی برقرار رہتی۔

'شوگر اسٹریٹ' اپنی لطافت، طرز اور اسلوب بیان کے اعتبار سے بہت دل چسپ ہے۔ اس میں چھوٹے چھوٹے قصوں کو ناولٹ کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ چوں کہ نجیب محفوظ کو اپنے اسلوب، رمزیت اور تہہ داری کی بنا پر دیگر مصنفوں میں امتیاز حاصل تھا اسی وجہ سے انھیں انیسویں صدی کے صاحب اسلوب مصنفین میں شمار کیا جاتا ہے۔ ہمارے یہاں کچھ لوگ ان کا موازنہ پریم چند سے کرتے ہیں کیوں کہ ان کی تحریروں میں بھی حقیقت نگاری کا احساس ہوتا ہے اور ان کے موضوعات بھی مفلسی، غربت، مظلومیت، ستم رسیدہ لوگوں اور افلاس کے مارے انسانوں کی زندگی ہے۔ اسی وجہ سے ان کے ناولوں میں ہمیں مصر اور مصری عوام کی ایسی داستان پڑھنے کو ملتی ہے کہ اسے پڑھ کر آنکھیں اَشک بار ہو جاتی ہیں اور کلیجہ منھ کو آنے لگتا ہے۔ اصل میں یہی ان کی حقیقت نگاری ہے۔

نجیب محفوظ کا کمال یہ ہے کہ وہ جس چیز کو بیان کرتے ہیں وہ ہر دل کا احساس، ہر فکر کی سوچ اور ہر انسان کے دل کی آواز بن جاتی ہے۔ یہ ناول ان کے دیگر ناولوں کی طرح الگ شناخت رکھتا ہے۔ اس میں کل چھتیس چھوٹے چھوٹے ناول ہیں۔ جو ابواب میں منقسم ہیں (باب اول تا باب چھتیس) اس کتاب کا موضوع ایک ہے اور اسی مرکزی موضوع سے تمام ناولوں کا تانا بانا بنا گیا ہے۔ ان ناولوں کی ایک خاص بات یہ ہے کہ وہ اختصار کے ساتھ تحریر کیے گیے ہیں۔ جس سے قاری گراں بار نہیں ہوتا اور اس کی دل چسپی باقی رہتی ہے۔ امید ہے کہ ادبی حلقوں میں اس کتاب کی پزیرائی ہوگی، اس کا سرورق دیدہ زیب ہے پروف کی غلطیاں نہیں کے

برابر ہیں۔ یقیناً یہ کتاب موضوع کی انفرادیت کی بنا پر فکشن سے دل چسپی رکھنے والے طلبہ وراساتذہ کے لیے مفید ہوگی۔

جدید دنیا میں تعلیم

مصنف: نیاز احمد اعظمی
صفحات: 179، قیمت: 73 روپے، سنہ اشاعت: 2013
پبلشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
مبصر: امتیاز احمد علیمی، ریسرچ اسکالر، شعبہ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

تعلیم کے موضوع لکھنے والے نیاز احمد اعظمی نے اپنی کتاب 'جدید دنیا میں تعلیم' میں بہت ہی اختصار اور جامعیت سے کام لیتے ہوئے تعلیمی موضوعات میں موجودہ تعلیمی صورت حال، معاشی ترقی میں تعلیم کی اہمیت کا عالمی سطح پر جائزہ لینے کی کوشش کی ہے ساتھ ہی حصول علم کے لیے تدریس کے جس طرح نئے نئے طریقے دریافت کیے جارہے ہیں، نیز تعلیم معاشی اور صنعتی ترقی میں کس طرح کا کردار ادا کررہی ہے اور مستقبل میں کرسکتی ہے اس کا اجمالی خاکہ پیش کرنے کی سعی کی گئی ہے نیز تعلیم کے سماجی مطالبے میں جمہوری رجحانات کے رول اور جمہوری اقدار کے فروغ میں تعلیم کی اہمیت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

اس کتاب میں بہت سارے تعلیمی مسائل اور حقائق کی نشاندہی کی گئی ہے۔اس میں تعلیم اور معاشی ترقی کے باہمی رشتے کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور اس کے لیے افریقی، ایشیا اور لاطینی امریکہ جیسے ترقی پذیر ممالک اور یوروپ وشمالی امریکہ جیسے ترقی یافتہ ممالک کی مثالیں دی گئیں ہیں۔ نیز امریکہ، سویت یونین اور یوروپ کی تعلیمی ترقی کا ایک خاکہ بھی پیش کیا ہے۔ کچھ ابواب میں اس بات کی بھی نشاندہی کی کوشش کی گئی ہے کہ فلسفیانہ ونفسیاتی نظریات کس حد تک تعلیم کو متاثر کرتے ہیں اور خود تعلیم اپنے اندرونی دباؤ سے کس طرح اپنی ہیئت تبدیل کرتی ہے مثالوں کے ساتھ سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔اس کے علاوہ اس کتاب میں جو سماجی تجزیہ پیش کیا گیا ہے وہ ترقی یافتہ معیشت کے سماجیاتی تجزیے سے ماخوذ ہے جس میں سماج اور تعلیم کے باہمی رشتوں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے تاکہ مختلف سماجی پس منظر میں تعلیم کے بنیادی مسائل کا احاطہ کیا جاسکے۔

اس کتاب میں تعلیمی نظام کو متاثر کرنے والے عناصر کو تو بیان کیا ہی گیا ہے ساتھ ہی تعلیمی میدان میں ان جدید رجحانات کا بھی احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو قدرتی سائنس اور سماجی سائنس دونوں سے ماخوذ ہیں۔اس کے علاوہ تعلیمی میدان میں تعلیمی کامیابی اور ناکامی کے اسباب دریافت کرنے نیز تعلیمی اداروں کی کارکردگی اور ذہنی پراگندگی میں مبتلا طلبہ کے مسائل کو معروضی ڈھنگ سے سمجھنے میں نفسیاتی خصوصیات کی پیمائش جس طرح کارآمد ثابت ہوئی ہے اس پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

اس کتاب میں ان اسباب کے تجزیے کی کوشش کی گئی ہے جو اس تیز رو تغیر کے پیچھے کارفرما ہے۔ان رجحانات کی نشاندہی کی کوشش بھی کی گئی ہے جن کی جھلک موجودہ صورت حال میں نظر آتی ہے۔اس کتاب سے تعلیم کا یہ پہلو بھی نمایاں ہوتا ہے کہ تاریخ انسانی میں ایک نسل سے دوسری نسل تک تہذیب کی ترسیل منظّم طور پر رسمی تعلیم کے ذریعے ہی ہوتی رہی ہے۔اس طرح پہلا سوال جو اس کتاب میں زیر بحث آتا ہے وہ یہ ہے کہ دنیا کو ایک تعلیم یافتہ دنیا بنانے میں رسمی تعلیم کا عمل کس حد تک کامیاب رہا؟ اس پر تفصیلی گفتگو کی گئی ہے۔

اس کتاب مین جن موضوعات پر خامہ فرسائی کی کوشش کی گئی ہے ان میں ''تمہید، انقلاب اور اس کی جڑیں، موجودہ تعلیم، تعلیم اور معاشی ترقی، غریب معاشروں میں تعلیم، ریاستہائے متحدہ امریکہ اور سویت یونین، چند دیگر ممالک، سماجی نابرابری جمہوریت اور تعلیم، نئے طریقے، مالیات اور پالیسی، نتائج رویے اور قدرین وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ مذکورہ عناوین کے علاوہ کچھ ذیلی عناوین بھی قائم کر کے اس پر اجمالاً روشنی ڈالی گئی ہے۔مثلاً موجودہ تعلیم میں آبادی کے اضافے سے اسکول اور بچوں کی تعداد میں کس طرح اضافہ ہوا ہے اور حصول آزادی اور قومی شعور کی بیداری نے حصول علم کی طلب کو کس طرح بڑھایا ہے اس پر روشنی ڈالتے ہوئے جدید دنیا میں معاشی ترقی کا انحصار کس پر ہے؟ معاشی ترقی میں تعلیم کا کیا رول ہے؟ جدید علوم کا اثر تعلیم کے کن کن میدانوں میں ہوا ہے؟ ان سب کے احاطے کی کوشش کی گئی ہے۔ساتھ ہی تعلیم اور معاشی ترقی میں کام کرنے کے جدید طریقوں سے روشناس کراتے ہوئے معاشی ترقی میں تعلیم کی اہمیت اور اس کے مناسب رخ کو پیش کیا گیا ہے۔اس کے علاوہ تعلیم کے مدارج کو طے کرتے ہوئے ترقی یافتہ ممالک میں تعلیمی صورت حال کی نشاندہی کی گئی ہے۔اس کے علاوہ بھی بہت ساری ایسی باتیں ہیں جو کتاب کے مطالعے سے کھل کر سامنے آئیں گی مثلاً تعلیم کا خرچ کون برداشت کرتا ہے؟ تعلیمی مندی کی خامیاں کیا ہیں؟ غریب معاشروں میں تعلیمی صورت حال کیا ہے؟ قرون وسطیٰ میں کس طرح کی تعلیم دی جاتی تھی؟ پس ماندہ ممالک میں تعلیمی صورت حال کیا ہے؟ نظام تعلیم میں اساتذہ کی تربیت کا کیا رول ہے؟ طلبا کی بے اطمینانی کا سبب کیا ہے؟ تعلیمی منصوبہ بندی کیسی ہونی چاہیے؟ عالمی سطح پر تعلیمی صورت حال کیا ہے؟ مذکورہ سارے مسائل پر اجمالی گفتگو کی گئی ہے اور مغربی مفکرین، ماہرین تعلیم، اور فلاسفروں کے گرانقدر خیالات کی روشنی میں جدید دنیا میں تعلیمی صورت حال کا جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے۔یہ کتاب تعلیم سے متعلق معلومات کے حصول میں زیادہ معاون ثابت ہوگی۔ کتاب کی املے اور ٹائپنگ کی غلطیاں بھی زیادہ ہیں مثال کے طور پر نقش کی جگہ نقس، تاثرات کی جگہ تااثرات، اسرار ورموز کی جگہ اسرار وامور، فرائڈ کی جگہ خرائد، پیتے کی جگہ پیتے، رویوں کی جگہ ریوں، بنیادیں کی جگہ بنیادیں نیں، وضع کی جگہ وضح وغیرہ ٹائپنگ اور املے کی غلطیاں ہیں جنھیں درست کرنے اور دوبارہ پروف ریڈنگ کی ضرورت ہے۔امید ہے کہ تعلیمی حلقوں میں اس کی پذیرائی ہوگی۔

فقط بیان تک

مصنف: نورالحسنین
صفحات: 192، قیمت 200 روپے
ملنے کا پتہ: عرشیہ پبلی کیشنز، سوریہ اپارٹمنٹ، دلشاد کالونی، دہلی 95
مبصر: حافظ محمد جہانگیر اکرم 482/11، ذاکر نگر (ویسٹ)
گڈھا کالونی، اوکھلا، نئی دہلی

زیر نظر کتاب 'فقط بیان تک' جناب نورالحسنین صاحب کے سترہ افسانوں کا مجموعہ ہے۔ گرچہ نورالحسنین کے متعلق یا ان کی دیگر تخلیقات کے متعلق زیادہ معلومات حاصل نہیں ہیں تاہم یہ ضرور ہے کہ ان کے افسانوں میں فن اور تخلیق کا جذبہ خلوص سے پیش کیا گیا ہے جس کا اندازہ ان افسانوں سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔نورالحسنین کو مختلف جذبات اور متنوع خیالات سے فکری تجربات کی بنیاد پر کہانی خلق کرنے کا ملکہ حاصل ہے۔ حالانکہ بہت سارے نئے پرانے لکھنے والوں کو اس کی پرکھ نہیں ہوپاتی ہے کہ کس جذبے کی پیش کش کس پیرائے میں کی جائے۔ لیکن نورالحسنین کی فکری جمالیات اور فنی حس بہت تیز اور متحرک ہے۔ لہٰذا انھیں جذبات اور کردار سازی پر حد درجہ عبور حاصل ہے۔

زیر تبصرہ کتاب کا پہلا افسانہ 'سبزۂ نورستہ کا نوحہ' ہے جس میں تقسیم ہند کا دردناک المیہ پیش کیا گیا ہے۔ تقسیم ہند، ایک ایسا سانحہ تھا جس کے درد وکرب کو رہتی دنیا تک محسوس کیا جائے گا۔ یہ افسانہ تملق پسند سیاست داں کے دل پر کاری ضرب لگاتا ہے جو اپنی ناپاک سیاست کے توے پر روٹیاں سینکتے ہیں۔اس افسانے میں انسانی فکر کا استفہامیہ پہلو کاش کاش کی صدائیں دیتا ہے۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں اس مجموعے کا سب سے اہم افسانہ 'فقط بیان تک' ہے۔شاید یہی وجہ ہے کہ مصنف نے اس افسانے کے عنوان کو اپنے مجموعے کے لیے منتخب کیا۔'فقط بیان تک' میں انھوں نے دہشت گردی اور اس کے عوامل کو موضوع سخن بنایا ہے۔کوئی انسان اس حد تک سوچ بھی نہیں سکتا کہ دہشت گردی کے پردۂ خفا میں آدمی خواہ وہ کسی مذہب، ذات پات یا ملک کا ہو درندگی کی اس حد تک پہنچ جائے گا اور اپنی تہذیبی اقدار اور اخلاقی قدروں کو فراموش کردے گا۔ حالانکہ والدین اپنے بچوں کی پرورش و پرداخت کرتے ہوئے سب سے پہلے اخلاقیات کی تعلیم دیتے ہیں اور مختلف قدروں سے روشناس کراتے ہیں۔ مگر مذکورہ بالا باتیں جب عملی زندگی سے دور ہوجاتی ہیں تو انسان پر شیطانیت اور درندگی کے سائے منڈلانے لگتے ہیں جس کا نتیجہ انسانیت کے حق میں نہایت ہی المناک اور دردناک ثابت ہوتا ہے۔نورالحسنین نے افسانہ 'فقط بیان تک' کے ذریعے دہشت گردی کا راگ الاپنے والوں پر نیز اس نظام پر زبردست طنز کیا ہے۔مثال کے طور پر اس افسانے کا ایک اقتباس دیکھیے:

''صاحب وہ خبر کوئی پہلی خبر تو نہیں تھی۔ ایسی خبریں تو ملک کے ایک ایک شہر سے نہ جانے کتنی بار دی گئی''

اس مجموعے کا دوسرا افسانہ 'ایک اداس شام' ہے۔ یہ ایسی سسکتی آواز ہے جو یہ کہتی ہے کہ پرانی قدروں کو تہ وبالا کرنے والوں کے لیے سوائے کفِ افسوس ملنے کے اور کچھ بھی ہاتھ نہیں آتا۔ یہ فقط حالات سے سمجھوتہ کرلینے کا استعارہ ہے۔

اس کتاب میں شامل آخری افسانہ 'زہر' ہے جو ازدواجی زندگی پر مبنی ہے۔اس افسانے میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ جو اولاد کی محرومی کے سبب شوہر، بیوی کے رشتے کو تار تار کرنے پر آمادہ رہتے ہیں اور خلاف عقل دلائل کے ذریعے وہ چاہتے ہیں کہ اولاد کی محرومی کا سبب دور ہوجائے۔ حالانکہ حقیقتاً وہ ماحول کو پراگندہ کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن جو لوگ صبر و تلقین کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے ہیں وہ ہمیشہ قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں اور انھیں قلبی سکون حاصل ہوتا ہے جو کہ خدا کی طرف سے ایک عطیہ ہے۔اس کہانی میں معاشرے کے ان لوگوں کو طنز کا نشانہ بنایا ہے جو گندی سوچ رکھتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ معاشرے کو بھی گندہ بنانا چاہتے ہیں۔ مذکورہ بالا افسانوں کے علاوہ 'سلامت روی و باز آئی'، 'ڈاکو پھر سے آگئے'، 'کلمہ گو'، 'بس شرط اتنی ہے'، 'کھڑکی سے آنے والا جھونکا'، 'بیساکھیوں پر کھڑے لوگ'، 'دھوپ میں جلتا گاؤں'، 'دوسرے کنارے تک'، 'ایک عذاب اور'، 'جنت کا پھول'، 'جال اندر جال'، 'بھیڑ میں اکیلا شخص' اور 'کرچیاں' یہ تمام افسانے اس کتاب میں شامل ہیں جو مختلف موضوعات پر مشتمل ہیں۔ جس میں سماج کے مختلف مسائل کو نہایت ہی خوبصورتی کے ساتھ مصنف نے اجاگر کرنے کی حتی الامکان کوشش کی ہے۔نورالحسنین کے افسانوں سے یہ پتہ چلتا ہے کہ معاشرہ اور ماحول پر ان کی گہری نظر ہے۔ افسانے کی زبان آسان ہے جس سے قاری اور متن کے درمیان کوئی پردہ حائل نہیں ہوتا۔ اچھے افسانے کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں آخر تک تجسس برقرار ہے، یہ خوبی ''فقط بیان تک' میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ کتاب کی طباعت کافی اچھی ہے قیمت بھی مناسب ہے۔امید ہے کہ یہ کتاب قاری اور طلبا کے لیے مفید ثابت ہوگی۔

عصمت چغتائی: فکر و فن

مصنف/ ناشر: توحید خان
صفحات: 249، قیمت: 148 روپے، سنہ اشاعت: 2014
مبصر: عبدالحی

زیر تبصرہ کتاب 'عصمت چغتائی: فکر وفن' ڈاکٹر توحید خاں کی تحقیقی وتنقیدی کاوش ہے۔ ڈاکٹر توحید خاں آل انڈیا ریڈیو کے نیوز سروس ڈویژن میں سینئر گریڈ آفیسر کے طور پر کام کررہے ہیں۔ 1994 میں انھوں نے جے این یو سے عصمت چغتائی کا فکری وفنی مطالعہ کے موضوع پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی تھی۔ پی ایچ ڈی کے مقالے کو ہی انھوں نے کتابی شکل دی ہے۔ یہ کتاب چار ابواب میں تقسیم کی گئی ہے۔ باب اوّل میں عصمت چغتائی کی شخصیت پر گفتگو کی گئی ہے، جس کے تحت ذیلی ابواب خاندان، پیدائش اور بچپن، تعلیم، شادی اور اولاد، تصانیف وغیرہ قائم کیے گئے ہیں۔ 54 صفحات پر مشتمل اس باب میں عصمت چغتائی کی شخصیت کے تمام پہلوؤں کو تفصیل سے اجاگر کیا گیا ہے۔ ایک باب میں ہی عصمت کی شخصیت کی تعمیر وتشکیل پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ عصمت کے خاندانی حالات بیان کرتے ہوئے صاحب کتاب نے چھوٹے چھوٹے واقعات کو بطور حوالہ پیش کرکے کتاب کی اہمیت وافادیت میں اضافہ کردیا ہے۔

کتاب کا دوسرا باب بعنوان 'عصمت چغتائی کا فکری ارتقا' ہے جس میں مصنف نے اردو افسانہ نگاری کے پیش رو پریم چند سے عصمت چغتائی کے دور تک کا جائزہ لیا ہے۔ یہ باب اس لیے بھی اہم ہے کہ اس میں اردو فکشن کی روایت سے بحث کرتے ہوئے عصمت کے افسانوی رجحان کو پروان چڑھانے میں معاون افکار کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔ عصمت کی اپنی تحریر اور خودنوشت سے دیے گئے اقتباسات وحوالہ جات مصنف کی گہری تحقیقی نظر کا پتہ دیتی ہے۔ عصمت کی زندگی میں آنے والے تغیر وتبدیلیوں کو ان کے افسانوں میں بھی محسوس کیا جاسکتا ہے۔ عصمت کے فکر وشعور میں پختگی یک بیک نہیں آئی تھی بلکہ زندگی کے نشیب وفراز سے گزرتے ہوئے کئی تلخ وشیریں تجربوں نے ان کی تحریری صلاحیتوں کو مزید جلا بخشی۔ انھوں نے جنسی مائل کے علاوہ دبے کچلے، مزدور طبقے کے مسائل، سماجی و سیاسی مسائل کو بھی افسانوں و ناولوں کا موضوع بنایا ہے۔ ان تمام موضوعات کے پیچھے کون سے عوامل کارفرما تھے اور کن محرکات نے عصمت سے ایسی تحریریں لکھوائیں ان سارے سوالوں کے جوابات اس باب میں ڈھونڈنے کی کوشش کی گئی ہے۔

کتاب کا تیسرا باب عصمت چغتائی کا سماجی شعور ہے۔ جس میں ان کی تخلیقات کی روشنی میں ان کی شعور نشو ونما پر گفتگو کی گئی ہے۔ باب کے آغاز میں سماجی شعور کی وضاحت بھی کی گئی ہے۔ عصمت کے افسانوں اور ناولوں کے موضوعات اور محرکات پر تفصیلی گفتگو کرتے ہوئے مصنف نے ان کے فکشن کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ عصمت چغتائی نے عورتوں کے مسائل، جنسی ونفسیاتی مسائل، جہیز، ذات پات، تحریک آزادی، جنگ عظیم، تقسیم ہند، فسادات وغیرہ موضوعات پر افسانے وناول لکھے ہیں۔ ڈاکٹر توحید خاں نے یہ ذیلی ابواب کے تحت تمام موضوعات کو سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔

کتاب کا چوتھا باب عصمت چغتائی کا فنی ارتقا ہے، جس میں مصنف نے عصمت چغتائی کے فن سے بحث کرتے ہوئے ان کے فکشن کے پلاٹ، کردار، تکنیک اور اسلوب پر بات کی ہے۔ کتاب بے حد عمدہ چھپی اور قیمت بھی نہایت مناسب ہے۔ کتاب میں پروف کی غلطیاں کافی ہیں جن کو کتاب کے دوسرے ایڈین میں دور کرنے کی ضرورت ہے۔ امید ہے کہ یہ کتاب عصمت شناسی کے باب میں ایک قابل قدر اضافہ تصور کی جائے گی اور باشعور قارئین اسے ضرور بنظر تحسین دیکھیں گے۔

سعادت حسن منٹو: عصر حاضر کے آئینے میں

مرتب: محمد حسین پرکار
صفحات: 152، قیمت: 150 روپے، سنہ اشاعت: جنوری 2013
ناشر: ہندوستانی پرچار سبھا، 7 نیتا جی سبھاش روڈ، ممبئی
مبصر: ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، کوہسار، بھیکن پور 3، بھاگلپور

ہندوستانی پرچار سبھا وقفے وقفے سے مختلف موضوعات پر اردو اور ہندی میں کتابیں شائع کرتی رہی ہے۔ سعادت حسن منٹو صدی کے موقعے پر جنوری 2013 میں ماہر تعلیم، سماجی خدمت گار اور چھ کتابوں کے مصنف و مرتب محمد حسین پرکار کی ترتیب دی ہوئی کتاب منٹو پر شائع کی ہے۔ اس میں 'منٹو اردو ادب کا سیاہ حاشیہ (کے کے کھلر)' اردو کی اوّلین نثری نظم اور منٹو (صادق)' منٹو کی حقیقت نگاری: چند اشارے (علی احمد فاطمی)' منٹو اور فلم (نور شاہ)، سعادت حسن منٹو کی ضدی فطرت (محمد ایوب واقف' بھونک کر بتانے والی بات (محمد اسلم پرویز، منٹو ایک سرسری جائزہ (م ناگ)، منٹو کی خاکہ نگاری کا تجزیاتی مطالعہ (سید منیر محی الدین قادری)، منٹو کی افسانہ نگاری (ظہیر محمد)، تقسیم وطن اور منٹو کا ٹوبہ ٹیک سنگھ (محمد تعظیم احمد کاظمی)، منٹو: شخصیت کا مختصر ترین مطالعہ (منیر حسین حرہ)، منٹو کی افسانہ نگاری (اوسیکر شہناز بانو علی مظہر)، منٹو (شاہد احمد دہلوی)، سچا اور کھرا منٹو (احمد ندیم قاسمی)، جیسے مضامین اور منٹو کی دو کہانیاں 'الو کا پٹھا' اور 'نیا قانون' شامل ہیں۔ ساتھ ہی آٹھ صفحے میں سولہ یادگار تصویریں بھی ہیں۔

منٹو نے نئی حقیقت نگاری کے ذریعے اردو افسانے کو کئی پل صراط سے گزارا ہے۔ سچائی کے خوشنما پھول سے سجایا ہے اور بلند بانگ فکر کو زندگی کا منقش رخ عطا کیا ہے۔ لفظ و معنی اور زبان و بیان کی مصورانہ خصوصیت جذبے کی نفسیاتی ترسیل کو عام فہم بناتی ہے اور تہذیب، تمدن اور سوسائٹی کے انواع و اقسام کو ان کے افسانے بلند پروازی کی صناعی بخشتے ہیں۔ کے کے کھلر نے منٹو کی شخصیت اور افسانے میں بے باکی کو اجاگر کیا ہے، پروفیسر صادق نے منٹو کی نظم نگاری، اولین نثری نظم کے خالق منٹو اور نظم پر منٹو کی آرا سے بحث کی ہے۔ یہ تحقیقی مضمون الگ ذائقہ رکھتا ہے۔ پروفیسر علی احمد فاطمی نے منٹو کی واشگاف حقیقت نگاری پر روشنی ڈالی ہے جس سے نئے پہلو سامنے آتے ہیں۔ نور شاہ نے منٹو کی فلمی زندگی کے بیشتر پہلو کو نشان زد کیا، محمد ایوب واقف نے منٹو کے حالات و کوائف کے مطالعے کے بعد ان کی شخصیت کے کئی ڈرامائی موڑ کو منعکس کیا ہے، محمد اسلم پرویز نے افسانہ 'ٹیٹوال کا کتا' کے تجزیے سے سماجی اور سیاسی تصویر کشی کی ہے، م ناگ نے منٹو کا سرسری جائزہ لیتے ہوئے وقت اور زندگی کے آر پار گزرنے کی صلاحیت کا مطلب سمجھایا ہے۔ ڈاکٹر سید منیر محی الدین قادری نے منٹو کی خاکہ نگاری کا تفصیلی جائزہ لیا ہے، ڈاکٹر ظہیر محمد نے منٹو کی افسانہ نگاری کو موضوع بنایا ہے، ڈاکٹر محمد تعظیم احمد کاظمی نے افسانہ 'ٹوبہ ٹیک سنگھ کے حوالے سے تقسیم وطن کی حقیقت کو سمجھایا ہے۔ منیر حسین حرہ نے منٹو کی شخصیت کے ادوار کو پیش کیا ہے، اوسیکر شہناز بانو علی مظہر کا مضمون قدرے تشنہ ہے، اس میں توضیح و توسیع کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ شاہد احمد دہلوی اور احمد ندیم قاسمی کے مضامین 'قند مکرر' کے تحت ہیں۔

منٹو شناسی کے لیے یہ کتاب جداگانہ اہمیت رکھتی ہے۔

بھلائے نہ بنے

مرتب: ڈاکٹر شکیل اختر

صفحات: 320، قیمت: 141 روپے، سنہ اشاعت: اگست 2013

ناشر: عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی 95

مبصر: مظہر حسنین، جے این یو، نئی دہلی

ذرائع ابلاغ یا جسے ماس میڈیا کہا جاتا ہے انسانی زندگی کا اہم ترین موضوع بن چکا ہے۔ قدیم زمانے سے لے کر اس دور جدید تک یہ اپنے ارتقائی مدارج طے کر رہا ہے، گرچہ یہ بہت وسیع عنوان ہے لیکن اردو میں اس جانب کم توجہ دی گئی ہے، میڈیا کے تعلق سے کتابوں کی نہایت کمی ہے۔ زیر نظر کتاب بھلائے نہ بنے ایک اہم ریڈیو ٹاک پر مبنی ہے۔ یہ کہیں نہ کہیں ڈاکٹر شکیل اختر کی عملی زندگی کا ایک اہم حصہ بھی ہے۔ کیونکہ مرتب ایک عرصۂ دراز سے اسی میدان میں برسر عمل ہیں اور احساسات اور تجربات کی روشنی میں ریڈیو ٹاک جیسے کمیاب موضوع پر اپنے قلم کو رواں کیا ہے۔ اردو میں ذرائع ابلاغ سے متعلق مواد کی قلت کا شکوہ ہمیشہ ہی رہا ہے لیکن گزشتہ کئی برسوں میں کوششیں تیز ہوئی ہیں جس کا ایک ثبوت زیر بحث کتاب بھی ہے۔ کتاب کی اہمیت اس لیے بھی ہے کہ اس میں آل انڈیا ریڈیو کی اردو سروس سے نشر شدہ ریڈیو ٹاکس کو یکجا کیا گیا ہے۔ اردو ادب کے اہم کرداروں پر مبنی آل انڈیا ریڈیو کا ریڈیو ٹاک پروگرام 1985 میں 'بھلائے نہ بنے' کے عنوان سے شروع کیا گیا۔

انسانی فطرت ہے کہ انسان جس چیز سے مانوس ہوتا ہے اس کے ہر پہلو پر گہری نظر رکھتا ہے۔ احساسات و تجربات کی پوشیدہ پرتوں کو کھولنے میں دلچسپی کا کردار بھی اہم ہوتا ہے، جس کے نتیجے میں ہی کسی خاص موضوع پر تفصیلی اور بامعنی تحریر وجود میں آتی ہے۔ کتاب کے مقدمے میں ریڈیو ٹاک کے فن پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے۔ ریڈیو کی اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے اس صورت حال کا جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے جو ہر بدلتے زمانے کے پیش نظر وجود میں آتی ہے۔ ہر عہد میں اس زمانے کی تبدیلی کا شکوہ بھی ہوا اور ارتقا کی مدح سرائی بھی۔ یہی وجہ ہے کہ جب ریڈیو کے بعد ٹیلی ویژن کی آمد آمد تھی تو یہ خیال تقویت حاصل کر رہا تھا کہ اب ریڈیو کے دن پورے ہو چکے۔ لیکن یہ تصور محض تصور رہ گیا اور ریڈیو نے دیگر شکلوں میں اپنے وجود کو ثابت کیا۔ ایف ایم چینلوں اور کمیونٹی ریڈیو کی شکل کے ساتھ ساتھ قدیم اور جدید دور کے امتزاج کے ساتھ آج بھی موجود ہے۔ ریڈیو آیا تو اخبارات کی اہمیت میں کمی نہیں ہوئی، ٹیلی ویژن آیا تو ریڈیو کا وجود ختم نہیں ہوا، اور انٹرنیٹ آیا تو یہ ساری چیزیں خاموش نہیں ہو گئیں بلکہ ٹکنالوجی نے انھیں مزید استحکام عطا کیا جس کی وجہ ریڈیو نشریات کے ذرائع میں اضافہ ہوا اور معاملہ کمیونٹی ریڈیو، ویب ریڈیو اور انٹرنیٹ بلٹن تک جا پہنچا ہے۔ جدید ٹکنالوجی نے اس میں مزید استحکام عطا کرتے ہوئے ذرائع ابلاغ کی لغت میں ویب ریڈیو، انٹرنیٹ بلٹن، انٹرنیٹ ٹیلی ویژن، انٹرنیٹ پروٹوکول ٹیلی ویژن اور ویب کاسٹنگ جیسی اصطلاحات کا اضافہ کیا ہے۔ اطلاعاتی جنگ کے زمانے میں بھی ریڈیو کی اہمیت کم نہ ہو سکی، گاؤں گاؤں تک ڈش ٹی وی کی رسائی کے باوجود ریڈیو پروگراموں کے شائقین میں اضافہ ہوا۔ گاؤں میں کھیتوں پر کام کرتا ہوا کسان ہو یا میٹروپولیٹن شہر کے نوجوان کانوں میں ایئرفون لگائے ریڈیو پروگرام سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ مرتب نے فضاؤں کی لہروں پر بکھرے ہوئے الفاظ کو صفحۂ قرطاس پر جمع کر کے نہ صرف محفوظ کیا ہے بلکہ اسے آنے والے زمانے کے لیے دستاویزی صورت دے دی ہے جو عوام تک قابل رساں ہے۔ چونکہ ریڈیو پر نشر ہونے والے پروگرام نشریاتی ادارے کی لائبریری میں محفوظ ہوتے ہیں۔ جن کو حاصل کرنا یا دیکھنا دشوار ہے۔ نشر شدہ پروگرام کو دوبارہ سننے یا اس میں دی گئی معلومات تک رسائی بآسانی ممکن نہیں ہے۔ جبکہ شکیل صاحب نے اس کو ممکن بنا دیا ہے۔

بھلائے نہ بنے کی اہمیت اس لیے اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ اس میں مشہور ناول، افسانہ، ڈرامہ اور مثنوی کے اہم کرداروں کو پیش کیا گیا ہے۔ مشہور ادبا، پروفیسروں اور افسانہ نگاروں نے الفاظ کا جامہ پہنا کر ریڈیو کے ذریعے سامعین تک پہنچایا جو لوگوں کے اذہان پر آج بھی گہرے اثرات مرتب کیے ہوئے ہے۔ ان کی یہ کوشش طلبا اور خصوصا میڈیا کے طلبا کے لیے مفید ثابت ہوگی۔

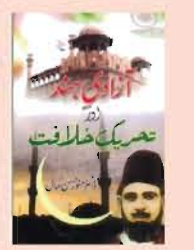

آزادی ہند اور تحریک خلافت

مصنف: ڈاکٹر منور حسن کمال

صفحات: 215، قیمت: 105 روپے، سنہ اشاعت: 2013

ناشر: ایم، آر، پبلی کیشنز، نئی دہلی

مبصر: عُزیر احمد، شعبۂ اردو، دہلی یونی ورسٹی، دہلی

ڈاکٹر منور حسن کمال کا شمار ملک کے معروف صحافیوں میں ہوتا ہے۔ وہ اپنی صحافتی تحریروں کی وجہ سے قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ منور حسن کمال کی تحریریں مدلل اور ادب کی چاشنی سے پر ہوتی ہیں۔ وہ اپنی بات کو ٹھوس دلائل کے ساتھ پیش کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب مور حسن کمال کی گران قدر تصنیف ہے جو انھوں نے جنگ آزادی کی بھولی بسری یادوں کو تحریک خلافت کے حوالے سے تازہ کرنے کے لیے لکھی ہیں۔ کسی دانشور نے کہا ہے کہ ہم اپنے حال اور مستقبل کو ہی نہیں بناتے ہیں بلکہ اپنے ماضی کو بھی تخلیق کرتے ہیں۔ ماضی تو ہمارے ہاتھوں سے نکل چکا ہوتا ہے مگر ماضی کی تخلیق دراصل اپنے اسلاف کی وراثت کو محفوظ کرنا اور اس کو آنے والی نسلوں تک پہنچانا ہے۔ دنیا کی ہر زندہ قوم ایسا کر کے اپنے زندہ ہونے کا ثبوت پیش کرتی ہے۔ اردو میں تحریک آزادی کے حوالے سے ایک بڑا ذخیرہ موجود ہے اس کے باوجود تحریک خلافت کے بارے میں معلومات کم ملتی ہیں۔ تحریک خلافت کے تعلق سے اس زمانے میں بھی سوالات اٹھے تھے اور اب بھی بعض دانشور اس تحریک کی معقولیت پر سوال اٹھاتے رہتے ہیں۔ اس وجہ سے ان سوالات کا جواب دینا اور ہندوستان کی جدوجہد آزادی میں اس تحریک کے کردار کا جائزہ لینا ضروری تھا۔ منور حسن کمال صاحب مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اس اہم ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے یہ اہم کتاب تحریر کی۔

منور حسن کمال نے اس کتاب کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے پہلے حصے میں انھوں نے تحریک خلافت کی تاریخ، جنگ آزادی میں اس تحریک کا کردار اور تحریک خلافت پر اٹھنے والے سوالات کے جواب جیسے اہم موضوعات کو شامل کیا ہے۔ انھوں نے تحریک خلافت کے تین اہم مقاصد شمار کرائے ہیں۔ ''الف۔ ترکی خلافت برقرار رکھی جائے، ب۔ مقامات مقدسہ ترکی کی تحویل میں رہیں۔ ج۔ ترکی سلطنت تقسیم نہ ہو۔'' تحریک خلافت کو سمجھنے کے لیے اس وقت کے حالات کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔ انگریزوں نے ہندستانی مسلمانوں سے ترکی خلافت کے بارے میں جو وعدہ کیا تھا اس کا پاس و لحاظ نہیں کیا جس کی وجہ سے مسلمانوں میں بے چینی کا پیدا ہونا ایک فطری عمل تھا۔ یہ تحریک اسی بے چینی کی پیداوار ہے۔ منور حسن کمال نے ان وجوہات کا جائزہ لیا ہے جن سے ہندوستانی مسلمان، جنھوں نے عثمانی خلیفہ کے انگریزوں کی فرمائش پر ٹیپو سلطان اور ہندوستانی مسلمانوں سے انگریزوں سے لڑائی نہ کرنے کی اپیل کو ناقابل اعتنا سمجھ کر نظر انداز کر دیا تھا، خلافت کی حمایت میں کمربستہ ہو گئے۔ منور حسن کمال کے مطابق اس کی وجہ یہ ہے کہ 1857 کی ناکامی نے مسلمانوں کو بے دست و پا کر دیا تو انھیں ایک مرکز کی تلاش ہوئی۔ انھوں نے ترکی خلیفہ کی طرف ایک امید کی نظر سے دیکھا۔ اسی زمانے سے ہندوستان میں ترکی خلیفہ کے نام کا خطبہ پڑھا جانے لگا۔ جب انگریزوں کی ریشہ دوانیوں کی وجہ سے ترکی خلافت خطرے میں پڑی تو مسلمان اس کی حمایت میں اٹھ کھڑے ہوئے۔ گاندھی جی نے جب اس تحریک سے مسلم عوام کو جڑتا ہوا دیکھا تو وہ بھی اس کی حمایت میں آ گئے۔ بعد میں اس تحریک کی قیادت بھی گاندھی جی کے ہاتھ میں آ گئی۔ منور حسن کمال کی نظر میں یہ تحریک پچھلے دو سو سالوں میں مسلمانوں کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ یہ تحریک کامیاب رہی یا ناکام اس سے قطع نظر اس تحریک کی بدولت پہلی بار ہندو مسلم کسی ایک کاز کے لیے ایک بینر تلے اکٹھا ہوئے۔ جس سے بعد میں آزادی کی تحریک میں مدد ملی۔ ہندوستان سے دور ترکی میں اس تحریک کے اثرات واضح ہوئے۔ وہاں پر ہندوستان میں چھپنے والے لٹریچر کا ترجمہ کرایا گیا۔ اس سے ترکی قوم میں اپنے ملک کی آزادی کے لیے جوش و ولولہ پیدا ہوا۔

کتاب کے دوسرے حصے میں منور حسن کمال نے تحریک خلافت کی اہم شخصیات اور ان کے کارناموں کو بیان کیا ہے۔ اس طرح سے یہ حصہ ان عظیم مجاہدین آزادی، جن میں اکثر علماء کرام ہیں، کو مصنف کی طرف سے نذرانہ عقیدت ہے۔

منور حسن کمال کا انداز تحقیقی ہے۔ اگرچہ بعض مقامات پر صحافیانہ رنگ جھلکتا ہے مگر اس کو ان کی تحریر کی خصوصیت کے طور پر دیکھنا چاہیے۔ کتاب میں چند فروگزاشتوں کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے۔ منور حسن کمال نے پہلے حصے کا عنوان ''خلافت اور اردو صحافت'' رکھا ہے لیکن اس پورے حصے میں مجھے اردو صحافت پر کوئی مضمون یا مواد نہیں مل سکا۔ ہوسکتا ہے کہ موصوف سے اس سلسلے میں کوئی بھول ہوئی ہو۔ مصنف نے خلیفہ کی تعریف کے تعلق سے علما کے کچھ ایسے اقوال بھی درج کیے ہیں جو ان بزرگوں کے زمانے میں بھی قابل اعتنا نہیں سمجھے گئے۔ جیسے کہ بعض علما کا یہ قول کہ حاکم کے لیے خوب صورت ہونا شرط ہے۔ ان اقوال کو درج کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ کتاب چونکہ ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے اس وجہ سے تاریخوں کے بارے میں بہت محتاط رہنا چاہیے تھا۔ کئی جگہوں پر اردو میں تاریخیں الٹ گئی ہیں۔ تھوڑی سی توجہ دی گئی ہوتی تو اس سے بچا جاسکتا تھا۔

مجموعی طور پر یہ کتاب تحریک خلافت کے تعلق سے ایک اہم دستاویز ہے۔ منور حسن کمال نے تحریک خلافت اور تحریک آزادی کے باہمی رشتوں کو جس خوب صورت انداز میں پرویا ہے وہ انھی کا حصہ ہے۔ اس خوب صورت کتاب کے لیے ڈاکٹر منور حسن کمال اردو دنیا کی طرف سے مبارک باد کے مستحق ہیں۔

تخلیق کی دہلیز پر

مصنف: فاروق اعظم قاسمی

صفحات: 288، قیمت: 110 روپے، سنہ اشاعت: 2013

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

مبصر: تابش مہدی، G-5/A ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی 25

فاروق اعظم قاسمی ایک نوجوان اور سرگرم اہلِ قلم ہیں۔ وہ ایشیا کی عظیم مذہبی دانش گاہ دارلعلوم دیوبند کے فاضل ہیں۔ میرے علم کے مطابق ان کی یہ قلمی سرگرمی اسی وقت شروع ہو گئی تھی، جب وہ دارالعلوم میں زیر تعلیم تھے اور دارلعلوم اور دیوبند ہی ان کے مطالعے، مشاہدے اور غور و فکر کا مرکز و محور تھا۔ وہ اس کی چہار دیواری سے باہر نہیں نکل سکے تھے۔ اب جب کہ وہ وہاں سے نکل کر عصری دانش گاہوں کا رخ کر چکے ہیں، ہندوستان کی مشہور دانش گاہ جواہر لعل یونی ورسٹی نئی دلی کے شعبۂ اردو سے وابستہ ہیں اور منٹو کی افسانہ نگاری پر ایم فل کر رہے ہیں، ان کی سوچ اور فکر کا کینوس وسعت پذیر ہے۔

'تخلیق کی دہلیز پر' فاروقِ اعظم قاسمی کی مستقل تصنیف نہیں بلکہ ان کے اکیس تنقیدی و تحقیقی مضامین کا مجموعہ ہے، جسے انھوں نے قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان کے مالی اشتراک سے شائع کیا ہے۔ ان مضامین کے مطالعے سے ان کی ناقدانہ انفرادیت، مشرقی روایت سے کامل وابستگی اور فکر و فہم کی سنجیدگی کا بھی اندازہ ہوتا ہے اور مثبت تلاش و جستجو اور صالح ذوق و شوق کا بھی۔ مکتوباتی ادب اور حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ، فضائل اعمال اور اردو ادب اور اردو میں صوفیانہ شاعری روایت اور بدلتے ہوئے رجحانات کے عنوان سے لکھے گئے مضامین ان کے اِسی ذوق و شوق کا مظہر ہیں۔ ان مضامین سے حقانی القاسمی کی اِس رائے کی تصویب ہوتی ہے کہ ''جامعات کے طلبہ کے لیے نصاب سے آگے کا راستہ یوں بند ہو چکا ہے کہ ان کی معلومات اور مقالات کا انحصار پیش رووں یا پروفیسروں کے مطالعات پر ہے۔ اِسی صورت میں نصابی حصار کو توڑ کر اگر کوئی آگے بڑھتا ہے تو وہ قابل ستایش ہے۔''

فاروق اعظم قاسمی نے اپنے مضمون 'علامہ سید مناظر احسن گیلانی کا شعری جہان' میں لکھا ہے:

’’علامہ کی بہت سی نظموں کے منظرِ عام پر آنے سے ان کی سادگی آڑے آئی، ان کی حد سے بڑھی ہوئی شفقت اور خردنوازی کا یہ عالم تھا کہ اپنی بہت سی نظموں کو وہ کسی عزیز یا شاگرد کے نام سے شائع کر دیتے تھے۔’اسلام کی روانی‘ اکبرالہ آبادی کی نظم ’پانی کی روانی‘ کے انداز پر لکھی گئی نظم قاری محمد طیب کے نام سے القاسم دیوبند ربیع الاوّل 1335 / 1917 میں شائع ہوئی جس کی تصدیق جناب مظفر گیلانی صاحب نے اپنے ایک مضمون میں کی ہے۔اس کی تائید مولانا یحییٰ ندوی صاحب نے بھی کی ہے، جو علامہ سے خاندانی نسبت رکھتے ہیں۔‘‘ (ص 163)

’اسلام کی روانی‘ حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب قاسمی رحمۃ اللہ علیہ سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند کی ایک معرکہ آرا نظم ہے۔ یہ نظم ان کے مجموعۂ کلام ’عرفانِ عارف‘ میں موجود ہے، جو کم و بیش نصف صدی پہلے شائع ہوا تھا۔ یہ نظم جس وقت ماہ نامہ القاسم میں شائع ہوئی تھی، اکبرالہ آبادی نے اس وقت کے سربراہِ دارالعلوم دیوبند کو بڑا جامع تحسینی خط لکھا تھا۔مولانا مناظر احسن گیلانی اور مولانا قاری محمد طیب قاسمی دونوں ہم عصر بھی تھے اور ہم عمر بھی۔ دونوں کی عمروں میں چار پانچ برس کا فرق تھا۔ دونوں کے درمیان استاذی و شاگردی کے رشتے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ میں کسی بھی اعتبار سے اِس مقام پر نہیں ہوں کہ دونوں کے مرتبہ و مقام کا تعین کروں۔ البتہ اتنا جانتا ہوں کہ دونوں ہی اپنے عہد کے آفتاب و ماہتاب تھے۔عزیز موصوف پر یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ اُن کی اِس تحریر سے حضرت مولانا گیلانی کی اچھی تصویر سامنے نہیں آتی۔اپنی تحریریں کسی دوسرے کے نام سے یا کسی فرضی یا خفیہ نام سے شائع کرانا سخت قسم کی بداخلاقی اور علمی بددیانتی ہے۔ یہ دونوں بزرگ علم و فضل اور اخلاق کے جس مقام پر تھے، ان سے کسی بھی صورت میں اس بات کی توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ کسی کے نام سے اپنی نظم شائع کرادیں گے اور وہ شائع ہوجانے کے بعد اُسے اپنے ذخیرۂ شعری میں بھی شامل کردیں گے۔آں عزیز ایک اسکالر ہیں اور تحقیق و جستجو ان کا مشغلہ ہے، انھیں یہ بات ضرور معلوم ہوگی کہ ریسرچ اور تحقیق میں مستند و معتبر بات ہونی چاہیے۔فلاں نے کہا اور فلاں نے تائید کی، اس لیے کہ وہ ان سے خاندانی نسبت رکھتا تھا، اِن سب باتوں کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔

میں جناب فاروق اعظم قاسمی کی اِس علمی، قلمی اور تحقیقی سرگرمی کا استقبال کرتا ہوں۔امید کرتا ہوں کہ ان کا یہ سفر خوب سے خوب کی تلاش و جستجو میں جاری رہے گا۔

مشام

مدیر: منصور عالم

صفحات: 378

ناشر: شعبۂ اردو، مگدھ یونیورسٹی، بودھ گیا

مبصر: غلام صمدانی، روم نمبر 217 لوہت ہاسٹل، جے این یو، نئی دہلی

مشام اردو ادب کا ایک معیاری ادبی مجلّہ ہے، جو کئی سالوں سے مگدھ یونیورسٹی شعبہ اردو سے پابندی سے نکل رہا ہے۔ مشام 2012 کا خصوصی شمارہ پروفیسر ڈاکٹر محمد منصور عالم صدر شعبۂ اردو مگدھ یونیورسٹی بودھ گیا کی ادارت میں نکلا۔ پورا شمارہ سید حسنین کی نذر ہے، جس میں ان کی پوری زندگی کا احاطہ کیا گیا بالخصوص ان کی زندگی کا وہ گوشہ جو اردو ادب سے عبارت ہے۔اس مجلّے میں ان کی ادبی، فکری، تہذیبی، تمدنی اور ذاتی زندگی پوری طرح کھل کر سامنے آتی ہے۔ چنانچہ سید حسنین کی گراں قدر خدمات جو اردو زبان و ادب میں ہیں، اس تعلق سے پروفیسر محمد منصور عالم نے بہت ہی محنت و جاں فشانی سے جملہ معلومات کو یکجا کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔اس کے مطالعے سے اردو ادب کا ہر قاری سید حسنین کی ہمہ جہت شخصیت اور ان کی ادبی خدمات کو بہت آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔

سید حسنین نے بچوں کی کہانیوں سے اپنی ادبی زندگی کا آغاز کیا اور پھر افسانے، انشائیے، خاکے، انشا پردازی اور مقالات و مضامین مختلف موضوعات پہ کام کیا، لیکن ان کا اصل میدان ’انشائیہ‘ تھا، اس میدان میں ان کی خدمات سب سے زیادہ ہیں، بقول علیم اللہ حالی ’’ڈاکٹر حسنین نے اس صنف کی ایجاد تو نہیں کی لیکن اس کے خدوخال متعین کرنے اور دوسری مماثل اصناف سے الگ کرکے دکھانے کی جو سنجیدہ کوشش کی ہے اس کا اقرار بہر حال کرنا ہوگا۔‘‘

مشام 2012 کا یہ شمارہ اسی لیے اہم ہے کہ اس میں ایک بڑے ادیب کی خدمات کو شمار کیا گیا ہے۔ چنانچہ اس شمارے میں کئی اہم مقالے ہیں جو ان کی ذاتی زندگی سے وابستہ ہیں، اور بعض مقالے ان کی ادبی زندگی سے عبارت ہیں۔ یہ نمبر منجملہ سات ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلا باب ’گلشن خاندان‘ ہے، جس میں ان کے خاندان اور حسب و نسب کا بیان ہے اور اس میں ان کی کچھ یادگار تصویریں بھی ہیں، ساتھ ہی ان کی زندگی، تصنیفات اور خاندانی تاریخ کی چند معلومات بھی موجود ہیں۔

دوسرا باب ’نگاہ حال‘ ہے جو بہت اہم ہے، اس میں سید حسنین کی زندگی کے تقریباً تمام شعبوں کا ذکر ہے، اس باب میں پروفیسر ڈاکٹر مجتبیٰ حسنین کا مقالہ ’پروفیسر ڈاکٹر سید محمد حسنین کی یاد میں‘، پروفیسر بیگ احساس کا مقالہ ’انشائیہ اور انشائیے‘، پروفیسر محمد ظفرالدین کا مبسوط مقالہ ’حسنین عظیم آبادی: کچھ یادیں اور کچھ نوائے دید‘ اور پروفیسر علیم اللہ حالی کا مقالہ ’پروفیسر ڈاکٹر سید محمد حسنین‘ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہ تمام مقالے جہاں سید حسنین سے وابستہ ہیں وہیں ادبی شگفتگی اور چاشنی بھی رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ معصوم عزیز کاظمی اور سید حسنین کے صاحب زادے ڈاکٹر سید امتیاز حسنین کی تحریر بھی ہے جو سید حسنین کی شخصیت کی گتھیوں کو سلجھانے میں معاون ہے۔

تیسرا باب ’نگاہ ماضی‘ ہے اس باب میں سید حسنین کی تخلیقات اور ان کی ادبی خدمات؛ ثریا کا خواب، بہار کے نو چراغ، برزخ کا مشاعرہ، صنف انشائیہ اور چند انشائیے، نیل مرام، نشاط خاطر، تلاش و جستجو اور خس و خار پر لکھے گئے پیش لفظ کو شامل کیا گیا ہے، جس کو پروفیسر رشید احمد صدیقی، پروفیسر سید محمد حسن، پروفیسر سید محمد احتشام حسین، پروفیسر آل احمد سرور، پروفیسر خلیل الرحمٰن اعظمی، پروفیسر کلیم الدین احمد اور پروفیسر ڈاکٹر قمر رئیس نے پیش لفظ کے طور پر تحریر کی تھیں۔ یہ ساری تحریریں شائع شدہ ہیں۔ لیکن افادیت کے مدنظر یہاں بھی شامل ہیں۔

چوتھا باب ’اعتراف اطراف‘ ہے اس باب میں سید حسنین کو ملے ہوئے وہ تاثرات ہیں جو خط و کتابت کے ذریعے حاصل ہوئے تھے، ان تاثراتی خطوط میں اس وقت کے نامور ادبا و شعرا کے نام ہیں، جس میں معین احسن جذبی، پروفیسر مسیح الزماں، پروفیسر بشیرالحق، پروفیسر سید حسن عسکری، ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی، پروفیسر سید محمد حسن، پروفیسر ظہیر احمد صدیقی قابل ذکر ہیں، اس کے علاوہ وہ خطوط بھی ہیں جو سید حسنین کے اپنے دوستوں احباب اور شاگردوں بالخصوص محمد منصور عالم کے نام ہیں، ان خطوط کی اصل تحریر کی اسکینگ کاپی بھی دوسرے صفحے پر بطور نمونہ موجود ہے۔

پانچواں باب ’نقد ناچیز‘ ہے، اس پورے باب میں مدیر منصور عالم کے مقالے ہیں، انھوں نے سید حسنین کی ادبی خدمات کا ناقدانہ جائزہ لیا ہے، ان مقالوں میں سید حسنین کے فن پاروں اور مضامین و مقالے کے حوالے سے جملہ معلومات اجمالی طور پر پیش کی گئی ہیں۔ منصور عالم نے سید حسنین کی افسانہ نگاری، انشائیہ نگاری، خاکہ نگاری، تنقید نگاری، تحقیق نگاری اور انشاپردازی پر تحقیقی اور تنقیدی نقطۂ نظر سے بہت ہی عمدہ گفتگو کی ہے، ان کی ان تحریروں کے مطالعے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ انھوں نے سید حسنین کی خدمات کو صرف میڈیم کے ذریعے سمجھنے کی کوشش نہیں کی بلکہ سید حسنین کی ذاتی زندگی اور ان کی کنہہ میں جا کر سمجھنے

کی کامیاب کوشش کی ہے، ان کے مقالوں میں یہ چیز خصوصیت کی حامل ہے۔

چھٹا باب ’نمونائے حسنہ‘ ہے، اس میں سید حسنین کا ایک افسانہ، ایک انشائیہ، ایک بچوں کی کہانی اور ایک تنقیدی مقالہ شامل کیا گیا ہے۔ ساتواں اور آخری باب ’حرف دلگیر‘ ہے، اس میں وہ تحریریں ہیں جو تعزیت نامے کے طور پہ اخبار و رسائل میں شائع ہوئی تھیں۔

مولانا آزاد کی غبار خاطر اور اس کا شعری سرمایہ

مصنف: ڈاکٹر عبید اقبال عاصم

قیمت: 150 روپے، صفحات: 232، سنہ اشاعت: 2013

مبصر: محمد شمس الدین، ریسرچ اسکالر،
شعبۂ اردو، دہلی یونی ورسٹی، دہلی

اردو ادب میں مولانا ابوالکلام آزاد کی تصنیف غبارِ خاطر کو کافی اہمیت حاصل ہے۔ اسے کسی نے خط تو کسی نے انشائیہ کہا ہے۔ جو بھی تسلیم کریں اس کے ادبی سرمایہ ہونے سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ حسرت موہانی نے تو ابوالکلام کی نثر کے تعلق سے یہاں تک کہہ دیا کہ:

جب سے دیکھی ابو الکلام کی نثر نظمِ حسرت میں کچھ مزا نہ رہا

ڈاکٹر عبید اقبال عاصم نے اپنی اس کتاب ’مولانا آزاد کی غبارِ خاطر اور اس کا شعری سرمایہ‘ میں ان اشعار کو جمع کیا ہے جو غبار خاطر میں شامل ہیں۔ اس کتاب کی ابتدا میں پروفیسر ریاض الرحمان شیروانی کا اہم مقدمہ ہے جو حبیب الرحمان خاں شیرانی کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ انھوں نے اپنے مقدمہ میں کتاب کی اہمیت، افادیت اور اسلوب پر تفصیلی گفتگو کی ہے۔ پدم شری پروفیسر حکیم سید ظل الرحمان نے کتاب کی تقریظ میں غبار خاطر پر نظر ڈالتے ہوئے مصنف کی خدمات کو پیش کیا ہے جبکہ پیش لفظ پروفیسر ابوالکلام قاسمی کا تحریر کردہ ہے۔ انھوں نے غبار خاطر اور مولانا آزاد کے حوالے سے اجمالی گفتگو کی ہے۔ ڈاکٹر تابش مہدی نے ’حرف اعتراف‘ میں مصنف کی تعلیمی و تدریسی خدمات پر نظر ڈالی ہے۔

غبار خاطر مولانا ابوالکلام آزاد کے ان خطوط کا مجموعہ ہے جو انھوں نے قلعہ احمد نگر کے قید خانے میں تحریر کیے تھے۔ اس مجموعے میں 24 خطوط شامل ہیں جو مختلف نوعیت کے حامل ہیں۔ اس میں مولانا آزاد نے جہاں اہم موضوعات کو شامل کیا ہے وہیں معمولی موضوعات جیسے چڑے چڑیا کا قصہ اور چائے نوشی کو بھی جگہ دی ہے۔ ان کے تمام خطوط میں فارسی، عربی اور اردو کے اشعار جا بجا ملتے ہیں جن میں سب سے زیادہ فارسی اشعار شامل ہیں۔ مولانا نے اپنے خطوط میں کئی سو اشعار تحریر کیے ہیں حالانکہ ان کے پاس جیل میں کوئی کتاب ایسی نہیں تھی جس سے وہ مدد حاصل کرسکیں۔ ان کا یہ کارنامہ ان کی قوت ذہانت اور یادداشت پر دال ہے۔ غبار خاطر میں زیادہ تر اشعار کا ایک ہی مصرع درج کیا گیا ہے۔ مالک رام کا یہ تحقیقی کارنامہ ہے کہ انھوں نے ایک مصرع والے تمام اشعار کو مکمل کیا اور کس کا شعر ہے، کس مجموعے سے لیا گیا ہے جیسی تمام چیزوں کو حوالے کے ساتھ پیش کیا۔ مالک رام کا مرتب کردہ غبار خاطر جسے ساہتیہ اکادمی نے شائع کیا ہے سب سے مستند ایڈیشن تسلیم کیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر عاصم نے اپنی کتاب ’مولانا آزاد کی غبار خاطر اور اس کا شعری سرمایہ‘ میں غبار خاطر کے تمام اشعار جمع کرنے کے ساتھ ساتھ اس میں موجود فارسی و عربی اشعار کا ترجمہ و تشریح بھی کی ہے جس سے عربی و فارسی زبان پر ان کی گرفت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اگر کوئی شعر کسی دوسرے خط میں بھی شامل ہے تو ڈاکٹر عاصم نے اس کی بھی نشاندہی کی ہے۔ غبار خاطر میں شامل چند خطوط کے تو عنوانات ملتے ہیں مگر کئی خطوط بلا عنوان ہیں۔ ڈاکٹر عاصم نے گہرا مطالعہ کرنے کے بعد جن خطوط پر عنوانات نہیں تھے انھیں خط کی مناسبت سے عنوان دیا ہے۔ اس کتاب میں تمام خطوط کو زمانی اعتبار سے ترتیب دیا گیا ہے۔ ہر خط پر اجمالاً گفتگو کرتے ہوئے اس کی اہمیت پر نظر ڈالی گئی ہے۔ اس کتاب میں ان خطوط کو بھی شامل کیا گیا ہے جن میں اشعار نہیں ہیں اور اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھ دیا گیا ہے کہ ان میں اشعار موجود نہیں تھے۔ اگر کوئی شعر ایک سے زیادہ خطوط میں شامل ہے تو اس کی نشاندہی کی گئی ہے۔ کتاب کے اخیر میں کس خط میں فارسی، عربی اور اردو کے کتنے اشعار استعمال ہوئے ہیں، اس کی نشاندہی بھی ملتی ہے۔ خط پر اجمالاً گفتگو کرنے کے بعد کئی جگہ باکس بنا کر غبار خاطر سے عبارت بھی درج کی گئی ہے جو غبار خاطر کی ادبی اہمیت کو ظاہر کرتی ہے، مثلاً صفحہ نمبر 29 کی عبارت ملاحظہ ہو:

’’رات کی کیفیتیں جتنی تند و تیز ہوتی ہیں، صبح کا خمار بھی اتنا ہی سخت ہوتا ہے۔ اگر رات کی سرمستیوں کے بعد اب صبحِ خمار کی تلخ کامیوں سے سابقہ پڑا تھا، تو ایسا ہونا ناگزیر تھا اور کوئی وجہ نہ تھی کہ ہم شکوہ سنج ہوتے۔ البتہ حسرت اس کی رہ گئی کہ جب ہونا یہی تھا تو کاش، جی کی ہوس پوری نکال لی ہوتی اور نپے تلے پیمانوں کی جگہ شیشوں کے شیشے لنڈھا دیے ہوتے۔‘‘

یہ کتاب قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے مالی تعاون سے شائع ہوئی ہے۔ اس کی قیمت بھی مناسب ہے۔ مجموعی طور پر یہ کتاب غبار خاطر کے بارے میں اہم معلومات فراہم کرتی ہے جیسے اس میں استعمال شدہ اردو، عربی فارسی کے اشعار اور ان کا ترجمہ، بلاعنوان خطوط کو باعنوان کرنا، ہر خط کے بارے میں اجمالی معلومات کے ساتھ ساتھ غبار خاطر سے عبارت بھی درج ہے۔ امید ہے کہ یہ کتاب غبار خاطر سے استفادہ کرنے میں ادب سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کے لیے کافی معاون ثابت ہوگی۔

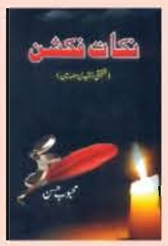

نکاتِ فکشن

مصنف: محبوب حسن

صفحات: 171، قیمت: 200 روپے، سنہ اشاعت: 2013

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی

مبصر: راحت افزا، ریسرچ اسکالر جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی

فکشن پر آج کل تواتر کے ساتھ کتابیں تصنیف ہو رہی ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شعری ادب کی تنقید کے مقابلے میں اردو فکشن کی تنقید کہیں پچھڑ گئی ہے۔ یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ محبوب حسن کی یہ دوسری کتاب فکشن کی تنقید کے تعلق سے منظرِ عام پر آئی۔ محبوب حسن آج کے روشن خیال تنقیدی بصیرت رکھنے والے نہایت سنجیدہ طالب علموں میں سے ہیں۔ ان کی حال ہی میں ایک کتاب ’’عصمت چغتائی اور جین آسٹن‘‘ کے عنوان سے شائع ہوئی۔ جس میں انھوں نے عصمت چغتائی اور جین آسٹن کے ناولوں کا تقابلی جائزہ پیش کیا ہے۔ زیر تبصرہ کتاب محبوب حسن کے تحقیقی و تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے جو کہ فکشن سے متعلق ان سے ذوق کا نتیجہ ہے۔ یہ کتاب گیارہ مضامین پر مشتمل ہے، شروع کے دو مضامین اردو ناول اور تانیثی مسائل سے وابستہ ہیں۔ اس میں اردو ادب کے ابتدائی دور کے ناولوں سے لے کر ترقی پسند تحریک سے ہوتے ہوئے جیلانی بانو، عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر، صغرا مہدی، ثروت خان، وغیرہ کے ناولوں کا جائزہ لیتے ہوئے عورتوں پر ہونے والے مظالم و بربریت اور اس کی شدت کے تلخ حقائق کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔

یہ صداقت ہے کہ آزادی سے قبل مذہبی، اصلاحی، اور اخلاقی موضوعات ہی اردو فکشن میں پیش کیے جاتے تھے۔ مگر آزادی کے بعد جو دردانگیز، خوں چکاں اور مہیب منظر سامنے آئے وہ فکشن لکھنے والوں کے لیے محرک بنے۔ کتاب میں شامل

دو مضامین میں تقسیم ہند کے دردناک انجام اور اس کے کرب سے تعلق رکھنے والے ناولوں اور افسانوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ناولوں میں عبدالرحمٰن کا ناول 'اداس نسلیں' کرشن چندر کا 'غدار' خدیجہ مستور کا 'آنگن' عبدالصمد کا 'دوگز زمین' وغیرہ کا تجزیہ کرتے ہوئے تقسیم ہند اور ہجرت سے پیدا شدہ مسائل کی طرف نشاندہی کی ہے۔ اس کے علاوہ قرۃالعین حیدر کے ناولوں کا بھی مجموعی جائزہ لینے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ اردو ادب کی تمام اصناف کی طرح اردو افسانے میں بھی تقسیم ہند اور اس سے پیدہ شدہ خوں آشام واقعات کو موضوع بنایا گیا، ہجرت تقسیم ہند کی ہولناکی کو بیان کرنے میں منٹو، عصمت، انتظار حسین، اور جوگندر پال وغیرہ خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ محبوب حسن نے اردو افسانے میں تقسیم ہند کے کرب اور اس کی المناکی کو تلاش کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ یہ امر سچ ہے کہ فسادات، خونریزی، اور ہجرت کے المیہ نے اردو فکشن کو نئے موضوعات عطا کیے یہی تہذیبی اور فکری فضا اردو فکشن کا محبوب موضوع بنی۔

اس کے علاوہ ایک مضمون ناز قادری کی افسانہ نگاری کے حوالے سے ہے محبوب حسن نے ناز قادری کے فن، موضوع، اور زبان و بیان سے متعلق مفصل بحث کی ہے یہ بات واضح کی ہے کہ ناز قادری کی کائنات افسانوی حسن و عشق اور داخلی جذبات واحساسات سے تخلیق پاتی ہے۔ ان کے افسانوں پر روحانیت کا غلبہ ہے۔ مضمون 'ناز قادری کی افسانوی کائنات' میں افسانہ نگاری کے فکروفن سے بحث کرتے ہوئے ان کی خوبیاں خامیاں بھی بیان کی ہیں۔ کتاب میں شامل دو مضامین سفرنامے سے متعلق ہیں ایک 'ظہیرانور کے سفرنامے 'دوسرا 'ہندوستان پاکستانی کی نظر سے' ظہیرانور دورِ جدید کے ڈرامہ نگار ہیں۔ انھوں نے سفرنامے بھی تخلیق کیے ہیں، ایک عرض تمنا'' دوسرا چراغ رہ گزر'' محبوب حسن نے دونوں سفرناموں پر سیر حاسل بحث کی اور ان کی ادبی قدر و قیمت متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔

کتاب خوبصورت ہے ہارڈ بائنڈنگ نے مزید دلکشی بخشی ہے۔ کتابت اور طباعت دیدہ زیب ہے امید ہے کہ کتاب ادبی حلقوں میں اپنی شناخت قائم کرے گی۔

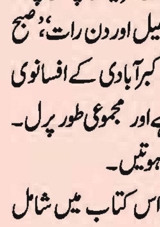

بنگال میں اردو افسانہ آغاز تا حال (حصہ اول)

مصنف: محمد عمران قریشی

صفحات: 176، قیمت: 250 روپے، سنہ اشاعت: جنوری 2013

ناشر: تنویر بک ڈپو، 112، جی ٹی روڈ، آسنسول

مبصر: نوشاد منظر، ریسرچ اسکالر،

شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

زیرتبصرہ کتاب کا پہلا مضمون 'ل۔ احمد اکبرآبادی: رومانیت سے حقیقت پسندی تک' ہے۔ ل۔ احمد اکبرآبادی کا شمار ترقی پسند شاعر اور ادیب میں ہوتا ہے مگر انھوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز رومانیت کے زیر اثر کیا تھا۔ بقول محمد عمران قریشی، نیاز فتح پوری نے جس اسلوب میں ٹیگور کی گیتانجلی کا اردو ترجمہ کیا تھا، اس کے اسلوب کا اثر ل۔ احمد کی تحریروں پر بھی پڑا۔ ل۔ احمد کے پانچ افسانوی مجموعے 'نغمات'، 'انشاء لطیف'، 'زندگی کے کھیل اور دن رات'، 'صبح وشام' اور 'ملاحظات نفسی' شائع ہوئے۔ محمد عمران قریشی نے ل۔ احمد اکبرآبادی کے افسانوی مجموعوں پر تعارفی نوٹ لکھا ہے۔ مگر یہ تحریر مختصر اور تاثراتی نوعیت کی ہے اور مجموعی طور پر ل۔ احمد اکبرآبادی کے افسانوں کے فنی محاسن کی تفہیم میں معاون ثابت نہیں ہوتیں۔

ایک مضمون بعنوان 'ڈاکٹر عندلیب شادانی کی سچی کہانیاں' اس کتاب میں شامل ہے۔ عندلیب شادانی کا شمار حقیقت پسند افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ یعنی عندلیب شادانی نے سچی کہانیوں اور واقعات کو افسانوی پیرائے میں پیش کرنے کا کارنامہ انجام دیا۔ عندلیب شادانی کی تاریخ پیدائش سے متعلق بعض غلط فہمیوں کے ازالے کی کوشش بھی مضمون نگار نے کی ہے۔

محمد عمران قریشی نے اپنے اس مضمون میں عندلیب شادانی کے افسانوں کا مختصر جائزہ بھی پیش کیا ہے۔ اس تحریر کی نوعیت تعارفی ہے اور افسانوں کا مرکزی خیال پیش کیا گیا ہے۔

کتاب 'بنگال میں اردو افسانہ: آغاز تا حال' میں ایک مضمون بعنوان 'بنگال کی پہلی ڈاکٹریٹ خاتون افسانہ نگار' شامل ہے۔ اس مضمون میں ڈاکٹر شائستہ بیگم سہروردی کی افسانہ نگاری پر گفتگو کی گئی ہے۔ ڈاکٹر شائستہ بیگم کی پیدائش، تعلیم، خاندان اور آخر میں ان کے افسانوی مجموعہ 'کوشش ناتمام' کے افسانوں کے حوالے سے ان کے فن کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ناتمام' ڈاکٹر شائستہ بیگم کا واحد افسانوی مجموعہ ہے جو دسمبر 1950 میں شائع ہوا تھا۔ اس مجموعے میں دس افسانے شامل ہیں۔ محمد عمران قریشی نے ان کے افسانوں کا مطالعہ پیش کیا ہے۔ ان کے بیشتر افسانوں میں خواتین کے مسائل کو ہی موضوع بنایا گیا ہے۔ ان افسانوں میں عورت ظالم بھی ہے اور مظلوم بھی۔ انھوں نے ناول بھی لکھا۔ ان کا واحد ناول 'مہر آراء بیگم' رسالہ 'عصمت' میں قسط وار شائع ہوا تھا۔

زیرنظر کتاب کا ایک مضمون 'شاہ خلیل الرحمٰن لکھنوی کی افسانہ نگاری' ہے۔ مصنف نے مضمون کی ابتداء میں یہ وضاحت کی ہے کہ ادارہ 'اردو ادب' کے زیر اہتمام ایک افسانوی مجموعہ بعنوان 'سنگ ریزے' شائع ہوا تھا۔ اس افسانوی مجموعے کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں تین افسانہ نگار (شاہ خلیل الرحمٰن لکھنوی، محمد یونس احمد اور قیصر نشاط مظفرپوری) کے پانچ پانچ افسانے شامل ہیں مگر مصنف نے اس بات کی وضاحت نہیں کی کہ آخر ایک افسانوی مجموعے میں الگ الگ افسانہ نگاروں کو شائع کرنے کی کیا وجوہات تھیں۔ مصنف نے لکھا ہے کہ ان افسانہ نگاروں کی تخلیقات کا جائزہ ان کی سنہ پیدائش کی ترتیب سے پیش کیا گیا ہے۔ ان کی اس تحریر سے یہ مغالطہ پیدا ہوتا ہے کہ مصنف نے ایک ہی مضمون میں یکے بعد دیگرے تینوں افسانہ نگار کی تخلیقات کا جائزہ پیش کیا ہوگا مگر دراصل ایسا نہیں ہے۔

محمد عمران قریشی کے مطابق شاہ خلیل الرحمٰن لکھنوی کے افسانوں میں ترقی پسند تحریک کا واضح تصور ملتا ہے۔ مصنف نے خلیل الرحمٰن لکھنوی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ انقلاب روس کا اثر تمام شعبۂ ہائے زندگی پر پڑا ادب بھی اس سے مستثنیٰ نہیں رہا، مگر مصنف نے افسانے کی جو کہانی بیان کی ہے اس سے انقلاب روس کا کوئی تعلق ہی نہیں معلوم ہوتا۔ یہ ایک نوکر اور مالک کے باہمی رشتے کی کہانی ہے، جہاں مالک اپنے نوکر کی ایک نہایت ہی معمولی بات سے خفا ہوکر اسے گھر سے نکال دینے کی بات کہتا ہے اور نوکر جواب میں کہتا ہے کہ مالک نے مجھے نکالا ہے، میں نے نہیں۔ اس کہانی سے بظاہر انقلاب روس کا کوئی تعلق نہیں معلوم ہوتا ہے۔ مصنف نے اس کہانی کو انقلاب روس کے پس منظر میں کیوں دیکھا یہ سوال اہم ہے، ممکن ہے افسانے کے عنوان 'انقلاب کے گہوارے' سے مصنف کو کچھ غلط فہمی پیدا ہوگئی ہو۔

زیرتبصرہ کتاب 'بنگال میں اردو افسانہ: آغاز تا حال حصہ اول' میں بیس مضامین کے ساتھ 'بیان اپنا' کے عنوان سے مصنف کا پیش لفظ اور آخر میں کتابیات کی فہرست شامل ہیں۔ مصنف نے بڑی محنت اور لگن کا مظاہرہ کرتے ہوئے صوبہ بنگال کے افسانہ نگاروں کے فن کا جائزہ پیش کیا ہے مگر پوری کتاب میں تفصیلات کی کمی کا احساس شدت سے ہوا۔

کتاب کی طباعت بہتر ہے مگر طلبہ اور ریسرچ اسکالرز کے لحاظ سے قیمت زیادہ ہے۔

■

عالمی اردو نامہ

بی بی سی اردو کے پروگرام جہاں نما کا اختتام

لندن: بی بی سی کے نیوز گروپ نے اعلان کیا کہ خبروں اور حالاتِ حاضرہ کے موجودہ پروگراموں میں کٹوتیوں کے ذریعے ملنے والی رقم کو دورِ جدید کے ذرائع ابلاغ پر خرچ کیا جائے گا اور بی بی سی اردو سروس کا پروگرام جہاں نما بھی اسی منصوبے کے تحت بند کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ تاہم بی بی سی اردو کے پروگرام جہاں نما کی بندش کا حتمی تاریخ کا اعلان نہیں کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں بی بی سی کے ڈائرکٹر نیوز جیمز ہارڈنگ نے اعلان کیا ہے کہ بی بی سی کا نیوز ڈپارٹمنٹ 415 ملازمتوں کی کٹوتی کرے گا۔ یہ اعلان بچت کے اس پروگرام کے تحت کیا جارہا ہے جس میں بی بی سی کو 2010 میں لائسنس فیس منجمد کیے جانے کے بعد 80 کروڑ پاؤنڈ کی لازمی بچت کرنا تھی۔ توقع ہے کہ حالیہ کٹوتیوں سے سالانہ چار کروڑ 80 لاکھ پاؤنڈ کی بچت ہوگی۔ بی بی سی نیوز میں فی الوقت 8400 کے قریب افراد کام کرتے ہیں، جن میں سے پانچ ہزار صحافی ہیں، جو لندن، برطانیہ اور دوسرے ملکوں میں خدمات انجام دیتے ہیں۔ ڈائرکٹر آف نیوز نے خبروں کے شعبے میں بڑے پیمانے پر انتظامی تبدیلیوں کا منصوبہ بھی پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ بی بی سی اس ڈیجیٹل دور میں نئی ٹیکنالوجی کی مدد سے دنیا بھر میں خبریں پیش کرنے میں سرفہرست ہے۔ اس منصوبے کے تحت 195 نئی ملازمتیں تخلیق کی جائیں گی، جس کا مطلب ہے کہ مجموعی طور پر 220 کل وقتی ملازمتوں میں کٹوتی ہوگی۔ جیمز ہارڈنگ نے کہا کہ بی بی سی کے سالانہ اخراجات کا 70 فیصد حصہ عملے کی مد میں جاتا ہے جس کا مطلب ہے کہ بچت کے پروگرام کا اثر ناگزیر طور پر اس شعبے پر ہوگا۔ 'یہ غیر یقینی تبدیلی کا صبر آزما وقت ہے۔' بی بی سی شعبے میں 13-2012 میں بھی 140 ملازمتوں کی کٹوتی کی گئی تھی، جبکہ گزشتہ برس مزید 75 ملازمتیں ختم کی گئی تھیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 18 جولائی 2014

قطر میں اردو ادبی سالانہ حمدیہ مشاعرہ کا انعقاد

قطر: قطر میں قدیم ترین اردو ادبی تنظیم بزم اردو قطر کا سالانہ طرحی حمدیہ مشاعرہ حسب روایت رمضان المبارک میں 10 جولائی 2014 بروز جمعرات کو گیارہ بجے شب میں علامہ ابن حجر لائبریری فریج بن عمران کے وسیع ہال میں منعقد ہوا۔ بزمِ اردو قطر کے سرپرست اور اردو عربی و فارسی کے عالم مولانا عبدالغفار نے صدارت کی جبکہ ہندوستان سے تشریف لائے شیدائے اردو محمد طیب شیخ نے بطورِ مہمان خصوصی شرکت کی۔ بزم کے جنرل سکریٹری افتخار راغب نے ابتدائی نظامت کی اور صدرِ مشاعرہ و مہمان خصوصی اور تمام شعرائے کرام و سامعین کا استقبال کیا۔ بزمِ اردو قطر جس کا سفر 1959 سے ہنوز جاری ہے، برسوں سے کافی اہتمام کے ساتھ کئی سالانہ مشاعرے منعقد کرتی آرہی ہے۔ جن میں ماہِ ربیع الاوّل میں سالانہ طرحی نعتیہ مشاعرہ اور رمضان المبارک میں سالانہ طرحی حمدیہ مشاعرہ شامل ہیں جو برسوں سے پابندی کے ساتھ منعقد ہورہے ہیں۔ مشاعرے کی نظامت حلقہ ادب اسلامی قطر کے نائب سکریٹری مظفر نایاب نے کی۔

حسب معمول پہلے ای میل سے موصول طرحی حمدوں سے منتخب اشعار پیش کیے گئے جن میں امریکہ سے موصول جناب تنویر پھول اور محترمہ رضیہ کاظمی اور دہلی سے جناب احمد علی برقی اعظمی کی حمدیں شامل تھیں جنھیں جناب سید آصف حسین اور جناب ڈاکٹر رضوان احمد نے عمدہ انداز میں پیش کرکے مشاعرے کو کامیاب بنانے میں اپنا تعاون پیش کیا۔ مقامی شعرا میں سب سے پہلے ناظم مشاعرہ جناب مظفر نایاب نے اپنے پراثر انداز میں اپنی طرحی حمد پیش کی جسے حاضرین نے خوب سراہا۔

مہمانِ خصوصی جناب محمد طیب شیخ نے تمام شعرا کے کلام کی پذیرائی کی۔ جناب محمد طیب شیخ سعودی عرب میں اردو کی تنظیموں سے برسوں تک وابستہ رہے ہیں اور ملازمت سے سبک دوش ہوکر ابھی وطنِ عزیز پونہ، ہندوستان میں سکونت پذیر ہیں۔ صدرِ مشاعرہ جناب مولانا عبدالغفار نے اپنے خطبۂ صدارت میں حمد کی تعریف بتائی اور اُس کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔ آخر میں بزم کے نائب صدر اور اس مشاعرے کے میزبان جناب فیروز خان نے تمام مہمانان و شعراوسامعین کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'عزیز الہند' دہلی، 27 جولائی 2014

کناڈا کی ادبی انجمنوں کی جانب سے پروفیسر ارتضیٰ کریم کا استقبال

نئی دھلی: دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے پروفیسر ارتضیٰ کریم کے کناڈا دورے کے دوران کئی نمائندہ ادبی تنظیموں نے زبردست خیرمقدم کیا اور ان کے خصوصی خطبے کا اہتمام کیا۔ ان میں فیملی آف دی ہارٹ، رائٹرس فورم، رنگ منچ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ رنگ منچ کے ڈائرکٹر جاوید دانش کے مطابق ارتضیٰ کریم کے کناڈا پہنچنے سے ادبی حلقوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ رائٹرس فورم کے صدر عابد جعفری نے انھیں یادگاری نشان پیش کرتے ہوئے کہا کہ اہالیان کناڈا کو عموماً اور رائٹرس فورم سے تعلق رکھنے والے ادیبوں اور شاعروں کو پروفیسر ارتضیٰ کریم کی آمد سے حددرجہ خوشی حاصل ہوئی۔ عابد جعفری نے ارتضیٰ کریم کی علمی اور ادبی خدمات کا خاص طور پر ذکر کیا۔ ادیب اور فیملی آف دی ہارٹ کے صدر خالد سہیل نے بھی اپنی تنظیم کے زیراہتمام ہونے والی ادبی تقریب میں ارتضیٰ کریم کا والہانہ خیرمقدم کیا۔ رنگ منچ کے ذریعے ہونے والی تین روزہ تقریب کے دوران مہمان خصوصی پروفیسر ارتضیٰ کریم کی ادبی اور علمی خدمات کے اعتراف میں انھیں لائف اچیومینٹ ایوارڈ پیش کیا گیا۔ ارتضیٰ کریم نے اس موقعے پر رنگ منچ کے اراکین اور حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ یہاں اردو زبان وادب کی جتنی رونق ہے اس کی بنیاد پر کناڈا کو اردو کا اہم مرکز کہا جاسکتا ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 17 جولائی 2014

قومی اردو کونسل کی سرگرمیاں
خبرنامہ

قومی اردو کونسل کے تعاون سے

اردو کے فروغ میں اردو اداروں، اسکولوں اور کتب خانوں کا کردار

(صفدر ایچ خاں کو مسیحائے اقلیت اور خواجہ اکرام الدین کو مسیحائے اردو ایوارڈ)

نئی دہلی: ہندوستان میں آج بھی ایسے اردو ادارے، اسکول اور کتب خانے موجود ہیں جو اپنی اپنی سطح پر اردو کے فروغ، ترقی و ترویج کے لیے کام کر رہے ہیں۔ اردو والوں کو اپنے طور پر بھی اردو کی ترقی کے لیے کام کرنا چاہیے۔ ان خیالات کا اظہار حرمین ایجوکیشن سوسائٹی کے زیر اہتمام انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر میں منعقد یک روزہ قومی سیمینار بعنوان 'اردو کے فروغ میں اردو اداروں، اسکولوں اور کتب خانوں کا کردار' کے موقعے پر مقررین نے کیا۔ یہ سیمینار قومی اردو کونسل کے اشتراک سے منعقد کیا گیا۔ اس موقعے پر جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ اسلامک اسٹڈیز کے سربراہ پروفیسر اختر الواسع نے کہا کہ ہم سبھی کو اپنے بچوں کو اردو میں تعلیم دینا ضروری ہے۔ اس موقعے پر سابق مرکزی وزیر آسکر فرنانڈیز نے کہا کہ اردو کو ہر مقام اور ہر سطح پر فروغ دیا جائے تاکہ اردو کے ساتھ ناانصافی نہ ہو۔ اپنی صدارتی تقریر میں انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر کے صدر سراج الدین قریشی نے کہا کہ اردو کے فروغ کے لیے آئی آئی سی سی کے دروازے کھلے ہوئے ہیں۔ دہلی وقف بورڈ کے چیئرمین چودھری متین احمد نے کہا کہ وہ ہمیشہ اس بات کے حامی رہے ہیں کہ بچے کو اس کی مادری زبان میں تعلیم حاصل کرنے کے مواقع ملنے چاہئیں۔ آئی آئی سی کے نائب صدر صفدر ایچ خان نے کہا کہ حرمین ایجوکیشن سوسائٹی کی طرز پر دوسری تنظیمیں بھی باہمی تال میل سے اردو کے فروغ کے لیے خدمات انجام دیں۔

اس موقعے پر دہلی پردیش کانگریس کمیٹی کے جنرل سکریٹری محمود ضیا نے بھی اظہار خیال کیا جبکہ نظامت، سیمینار کے کنوینر اشفاق احمد عارفی نے کی۔ آخر میں کنوینر مشتاق بیگ نے اظہارِ تشکر کیا۔ اس سے قبل فرید احمد نے تعارفی کلمات ادا کیے۔ سیمینار میں صفدر ایچ خان کو مسیحائے اقلیت ایوارڈ اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائریکٹر ڈاکٹر خواجہ اکرام الدین کو مسیحائے اردو ایوارڈ سے نوازا گیا۔ اردو میڈیم اسکولوں میں اردو زبان کے فروغ کے لیے محب اردو کا ایوارڈ، زینت محل سرودیہ کنیا ودیالیہ، جعفرآباد کی پرنسپل مینا کماری کو دیا گیا۔ اس موقعے پر معروف اردو شاعرہ ڈاکٹر عفت زریں کے مجموعہ کلام 'زریں نامہ' کا اجرا بھی عمل میں آیا۔ سیمینار میں دہلی اسٹیٹ حج کمیٹی کے چیئرمین ڈاکٹر پرویز میاں، حاجی قیام الدین، عالم بیگ، عمر دین، نعیم احمد، سید نثار حسین، سید عابد حسن بقائی، رحیم میاں، محمد فیصل وغیرہ نے بھی بطور خاص شرکت کی جبکہ پروفیسر انور پاشا، پروفیسر ارتضیٰ کریم، پروفیسر محمد نعمان اور ڈاکٹر مشتاق صدف وغیرہ نے مقالات پیش کیے۔

'خبرنامہ' اور 'عالمی اردو نامہ' کے تحت ملک کے مختلف اردو اخبارات میں اردو کے تعلق سے شائع ہونے والی خبروں کا ڈائجسٹ ہر ماہ اس لیے پیش کیا جاتا ھے تاکہ پورے ملک میں اردو سرگرمیوں کی مجموعی صورتِ حال سامنے آسکے۔ خبروں میں دیے گئے تمام حقائق اور تبصروں کے لیے متعلقہ اخبارات ذمے دار ھیں۔ (ادارہ)

اردو سے متعلق دیگر قومی اور علاقائی خبریں

قومی:

مدارس کی جدید کاری

نئی دہلی: مدرسوں کی جدید کاری کی اسکیم کے تحت مدرسوں میں جدید مضامین کی تعلیم جیسے سائنس، ریاضی، سماجی علوم وغیرہ اور انھیں سرٹیفکیشن کے لیے نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف اوپن اسکولنگ سے جوڑنا، ان مدارس کے لیے ہے، جو اس اسکیم سے رضاکارانہ طور پر جڑنا چاہتے ہیں۔ یہ

اطلاع فروغ انسانی وسائل کی مرکزی وزیر اسمرتی ایرانی نے لوک سبھا میں دی۔ 2011 کی مردم شماری کے مطابق مسلم معاشرے میں تعلیمی شرح 5.91 فیصد ہے، جب کہ قومی تعلیمی شرح 6.48 فیصد ہے۔ 2011 کی مردم شماری کے تحت مذہب کی بنیاد پر تعلیمی شرح سے متعلق ڈاٹا جاری نہیں کیا گیا ہے۔ 2012-13 میں بنیادی سطح پر مسلمان بچوں کی داخلہ شرح 13.52 فیصد تھی، جو 2013-14 میں بڑھ کر 13.73 فیصد ہوگئی۔ یہ شرح مسلم آبادی کے حصے کے مطابق ہے۔ 2013-14 کے یوڈی آئی ایس ای ڈیٹا کے مطابق بنیادی پرائمری سطح پر مسلم بچوں کے اسکول چھوڑنے (ڈراپ آؤٹ) کی سالانہ اوسط شرح 56 فیصد ہے۔ بہار میں مسلم بچوں کے اسکول چھوڑنے کی شرح 2012-13 میں 1.83 فیصد تھی، جب کہ 2013-14 کی سالانہ ڈراپ آؤٹ شرح سے متعلق مکمل ڈاٹا دستیاب نہیں ہے۔ اقلیتی طلبا کی تعلیم کے لیے حکومت نے کئی طریق کار اپنایا ہے جس کے تحت کثیر اقلیتی اضلاع میں مرکزی اسکیموں جیسے سروشکشا ابھیان، راشٹریہ مادھیمک شکشا ابھیان، مڈڈے میل اسکیم، ٹیچر ایجوکیشنگ اسکیم، تعلیم بالغان، جواہر نوودے ودیالیہ اسکیم (جے این وی)، لڑکیوں کے ہوسٹلوں کا قیام، ماڈل اسکول اسکیم، ماڈل ڈگری کالجوں کا قیام، خواتین ہوسٹل اور پولی ٹیکنیک وغیرہ کو ترجیح دی گئی ہے، تاکہ تعلیم کی تمام سطحوں پر اقلیتوں کی شراکت داری کو بڑھاوا دیا جاسکے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 31 جولائی 2014

ٹیگور کے یومِ وفات کے موقعے پر جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ٹیگور توسیعی خطبے کا انعقاد

نئی دہلی: ٹیگور کا تصورِ عشق متصوفانہ اور مثالی نوعیت کا بھی ہے اور حسیاتی نوعیت کا بھی۔ وہ جسم کی خواہشات اور ضرورتوں سے فرار کی تلقین نہیں کرتے بلکہ ان کے متوازن روحانی تقاضوں کے ادراک کی ضرورت پر بیک وقت اصرار کرتے ہیں کہ انسانی صداقت کا سب سے اہم پہلو عشق ہے۔ ان خیالات کا اظہار دہلی یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے سابق صدر اور معروف نقاد پروفیسر عتیق اللہ نے ٹیگور کے یومِ وفات کے موقعے پر جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ٹیگور ریسرچ اینڈ ٹرانسلیشن اسکیم، شعبۂ اردو جامعہ کے زیر اہتمام منعقد ایک توسیعی خطبے میں کیا۔ اس توسیعی خطبے کا موضوع 'ٹیگور کا عشق اساس وژن' تھا۔ انھوں نے مزید کہا کہ ٹیگور کسی ایک ملک کسی ایک شہر کے شہری نہیں تھے۔ بلکہ ان کے تصور انسان یا وحدت انسانیت یا یونیورسل مین کے تصور نے انھیں پوری دنیا کا شہری بنا دیا تھا۔ پروفیسر عتیق اللہ نے کہا کہ چین، امریکہ، برطانیہ اور مصر میں بھی ٹیگور کی یاد میں تقریبات کا انعقاد کیا گیا مگر جامعہ کا دامنِ موضوع سب سے وسیع اور متنوع رنگوں سے آراستہ ہے۔ جامعہ ملیہ کے شعبہ انگریزی کے استاذ پروفیسر انیس الرحمٰن نے صدارتی تقریر میں کہا کہ ٹیگور نے مشرق و مغرب کی قدروں سے استفادہ کیا اور ان سے نئے معنی اخذ کرنے کی کوشش کی۔ انھوں نے کہا کہ ٹیگور نے حافظ و رومی سے استفادہ کیا۔ ٹیگور اور اقبال کے یہاں فلسفیانہ گہرائی و گیرائی اور عشق کا تصور ہے۔ اس موقعے پر شعبہ اردو کے صدر پروفیسر وہاج الدین علوی نے مہمانوں کا استقبال کیا اور توسیعی خطبہ کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی۔ نظامت کے فرائض انجام دیتے ہوئے ٹیگور پروجیکٹ کے کوآرڈینیٹر پروفیسر شہزاد انجم نے کہا کہ گزشتہ دنوں ٹیگور پروجیکٹ کے زیر اہتمام دو کتابیں منظر عام پر آئی ہیں۔ پہلی کتاب 'میری یادیں' ہے

جو ٹیگور کی خودنوشت سوانح ہے اور جس کا ترجمہ فہیم انور نے بنگلہ سے اردو میں براہِ راست کیا ہے۔ دوسری کتاب 'ٹیگور اور اقبال ہے' جو ریسرچ اسکالرز کے تحقیقی و تنقیدی مضامین پر مشتمل ہے جسے ڈاکٹر ندیم احمد نے مرتب کیا ہے۔ عنقریب ٹیگور کے ڈرامے، ٹیگور کے مضامین، ٹیگور کی بازیافت، باغبان اور ٹیگور کا ناول 'گورا' کی اشاعت ہوگی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا'، 8 اگست، 2014

اردو اساتذہ کی تعداد بڑھانے کی کوشش

نئی دہلی: مولانا آزاد نیشنل یونیورسٹی حیدرآباد میں اردو ٹیچرس کی تعداد میں اضافہ کے لیے فاصلاتی نظام تعلیم کے ذریعے اس سال مزید پانچ سوسیٹیں منظور کی گئی ہیں

جس کے تحت بنگال کے آسنسول، مہاراشٹر کے اورنگ آباد، یوپی کے سنبھل، مدھیہ پردیش کی راجدھانی بھوپال اور ہریانہ کے فرید آباد دھوج میں بالترتیب سوسوسیٹیں تقسیم کی گئی ہیں۔ مذکورہ خیالات کا اظہار مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی دہلی کے ریجنل ڈائریکٹر ڈاکٹر شاہد پرویز نے

'عہدِ حاضر میں پریم چند کی معنویت' پر منعقدہ سیمینار میں دائیں سے ڈاکٹر علی جاوید، آنند سہائے، پروفیسر سلیل مشرا اور ڈاکٹر ارجمند آرا

کیا۔ انھوں نے کہا کہ اس سے قبل باضابطہ کئی سینٹرس پر ریگولر اور فاصلاتی نظام تعلیم کے ذریعے بی ایڈ کی تعلیم دی جارہی ہے۔ انھوں نے مزید بتایا کہ مولانا آزاد یونیورسٹی نے پہلی بار ایم اے اردو اسلامک اسٹڈیز میں فاصلاتی نظام شروع کیا ہے جو پورے ہندوستان میں مقبول ہورہا ہے۔ ملک کے ہر خطے میں یونیورسٹی کے سینٹرس قائم ہیں اور ہر جگہ ایم اے اسلامک اسٹڈیز میں داخلہ لینے کی سہولت موجود ہے۔ اس مرکزی یونیورسٹی نے کم سے کم فیس میں لوگوں کو تعلیم کی طرف راغب کیا ہے اور اردو میڈیم میں تمام کورس اور اس کے مواد مہیا کرائے ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 6 اگست 2014

عہدحاضر میں پریم چند کی معنویت

نئی دھلی: پریم چند نے اردو میں لکھنا شروع کیا لیکن انھوں نے زبانوں میں کبھی بھی تفریق پیدا نہیں کی، بلکہ ہر زبان کو اظہار بیان کا ایک ذریعہ سمجھا، مگر افسوس اردو اور ہندی تقسیم کی گئی جس کے ذریعے انگریزوں کا خواب شرمندہ تعبیر ہوگیا۔ آل انڈیا انجمن ترقی پسند مصنّفین اور پریس کلب آف انڈیا کے زیراہتمام اردو کے اولین افسانہ نگار پریم چند کے 134 ویں یوم ولادت کے موقعے پر بعنوان 'عہد حاضر میں پریم چند کی معنویت' پر منعقدہ سیمینار میں شعبۂ اردو کے سینئر استاد اور انجمن ترقی پسند مصنّفین کے صدر ڈاکٹر علی جاوید نے مذکورہ خیالات کا اظہار کیا۔ انھوں نے مزید کہا کہ پریم چند نے تمام مسائل کی نقاب کشائی کی ہے۔

اس موقعے پر پریس کلب کے صدر آنند سہائے نے کہا کہ ہر ادیب کا محاسبہ ہر دور میں کیا جانا چاہیے۔ انھوں نے آزادی کے تناظر میں جو کہانیاں لکھیں وہ ادب کے لیے بہت بڑا تعاون ہے۔ اردو اور ہندی میں جو توازن برقرار رکھا گیا ہے وہ پریم چند کی ہی ذات ہے۔ معروف محقق پروفیسر سلیل مشرا نے کہا کہ پریم چند نے سماج میں درپیش سبھی مسائل کو اپنے قلم کے ذریعہ وسعت دی اور اس کے حل سے بھی آشنا کرایا۔ پریم چند کی تحریریں وقت کی اہم ضرورت بن چکی تھیں۔

شعبۂ دہلی یونیورسٹی کی استاد اور انجمن ترقی پسند مصنّفین دہلی کی جنرل سکریٹری ڈاکٹر ارجمند آرا نے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ ایک ادیب جب پڑھتا ہے لکھتا ہے تبھی متاثر ہوتا ہے۔ مگر بچے اپنی معصومیت کے باوجود پریم چند کو پڑھنے کے بعد متاثر ہوجاتے ہیں کیونکہ پریم چند بچوں کے ضمیر کو بہتر سمت دینے والے ادیب ثابت ہوئے ہیں۔ پروگرام کے اخیر میں انل نے اظہار تشکر ادا کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 2 اگست 2014

ڈی ڈی نیشنل پر سیریل 'داستانِ اردو'

نئی دھلی: اردو کسی خاص طبقے کی زبان نہیں ہے، زبان کا کوئی مذہب نہیں ہوتا، اردو ایک مکمل تہذیب اور تاریخ ہے، تہذیبوں کا سنگم ہے، یہ ہماری مشترکہ تہذیب کا ایک ورثہ ہے۔ ضرورت اس ورثہ کو نئی نسل تک پہنچانے اور اس کا تحفظ کرنے کی ہے۔ اسی ضرورت اور اردو کے تعلق سے پیدا کی گئی بعض غلط فہمیوں کو دور کرنے کی غرض سے ہم نے 'داستان اردو' کے نام سے 13 قسطوں پر مشتمل سیریل بنانے کا فیصلہ کیا، جسے دوردرشن کے نیشنل چینل پر ہر اتوار رات ساڑھے نو بجے دیکھا جاسکتا ہے۔

یہ بات جشن بہار ٹرسٹ کی روح رواں کامنا پرساد نے دوردرشن کے منڈی ہاؤس دفتر میں منعقد پریس کانفرنس کے دوران بتائی۔ اس موقعے پر دوردرشن کے ڈائریکٹر جنرل تری پراری شرن، ڈپٹی ڈائریکٹر جنرل وی کے جین اور دیپا چندرا بھی موجود تھیں۔

کامنا پرساد نے بتایا کہ ان کا ڈاکیومنٹری، ڈرامہ سیریل 'داستان اردو' اس زبان کا قصہ ہے جو مشترکہ تہذیب کی پروردہ ہے۔ یہ سیریل ایک زبان کی تاریخ بھی ہے اور ایک دستاویز بھی اس میں خواص کے ساتھ عوام کو بھی جگہ دی گئی ہے اور صحت مند تفریح بھی شامل ہے۔

اس موقعے پر ایک کھلا مباحثہ بھی منعقد کیا گیا جس میں شرکت کرتے ہوئے ہوئے قومی کونسل برائے فروغ زبان اردو کے سابق وائس چیئرمین اور معروف شاعر پروفیسر وسیم بریلوی نے کہا کہ اردو ملک کی مشترکہ تہذیب کی پیداوار اور صدیوں کے سفر کا ثمرہ ہے، یہی وجہ ہے کہ اردو کی بنیادیں بہت مضبوط ہیں اور اسے اپنی بقا کے لیے کسی کی مدد کی ضرورت نہیں۔ انھوں نے کہا کہ 'داستان اردو' سیریل لوگوں کو ان کی بنیادوں سے جوڑنے کی ایک کامیاب کوشش ہے جس کے لیے کامنا پرساد قابل ستائش ہیں اور ان کے وجود سے ہی اردو کی خوشبو آتی ہے۔ معروف صحافی پرویز عالم نے مباحثہ میں حصہ لیتے ہوئے کہا کہ اردو صحافت اپنی منزلیں طے کررہی ہے اور ٹی وی پر آنے کے بعد اردو کو کافی فروغ حاصل ہوا ہے۔

ریختہ ڈاٹ کام کے سنجیو صراف نے کہا کہ انھوں نے تین سال پہلے یہ کوشش شروع کی تھی کہ اردو کو زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچایا جائے۔ انھوں نے کہا کہ وہ لوگ جو اردو رسم الخط سے واقف نہیں ہیں وہ اردو ادب اور شاعری سے کیوں محروم رہیں۔ اس بات کو ذہن میں رکھ کر ڈیڑھ سال قبل ریختہ ڈاٹ کام کی شروعات کی تھی جس پر 64 ممالک کے لوگوں نے وزٹ کیا۔ ایک سوال کے جواب میں دوردرشن کے ڈائریکٹر جنرل تری پراری شرن نے کہا کہ یہ پروگرام ڈی ڈی اردو کے لیے بنایا گیا تھا لیکن اس کے معیار کو دیکھ کر ہم نے اسے دوردرشن کے نیشنل چینل پر دکھانے کا فیصلہ کیا۔ ہمارا اردو چینل ملک کا نمبرون اردو چینل ہے اور مستقبل میں اس میں اور بھی بہتری لانے کی کوشش کی جائے گی۔ اس سیریل کی پروڈیوسر کامنا پرساد ہیں جبکہ اس کی ہدایت کار معروف صحافی اپرنا شریواستو ریڈی ہیں۔ شوبھا مدگل نے اس کی موسیقی دی ہے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 25 جولائی 2014

محمد علی جوہر یونیورسٹی کو اقلیتی یونیورسٹی کا درجہ حاصل

رام پور: محمد علی جوہر یونیورسٹی کو آخرکار اقلیتی یونیورسٹی کا درجہ حاصل ہو ہی گیا۔ ساتھ ہی یونیورسٹی کے تحفظ کو مزید مضبوطی دیتے ہوئے ترمیمی قوانین بل کو منظور کرلیا

گیا۔ گورنر اترپردیش ڈاکٹر عزیز قریشی نے گزشتہ سات سال سے زیرالتوا اترپردیش سرکار کے اس اہم بل کو منظوری دے دی۔ اس کے ساتھ ہی محمد علی جوہر یونیورسٹی ترمیمی بل 2007 کا نفاذ ہوگیا ہے۔ اس ترمیمی بل کے مطابق محمد علی جوہر یونیورسٹی اپنے مقاصد کے اعتبار سے فطری طور پر اقلیتی ادارہ ہے اس لیے اسے اقلیتی یونیورسٹی کا درجہ دینے کا اعلان کیا جاتا ہے۔ گورنر اترپردیش نے مستقل زرِتعاون کو بھی 10 لاکھ سے بڑھا کر 2 کروڑ کردیا ہے۔

روزنامہ 'عزیز الہند' دہلی، 17 جولائی 2014

دھلی:

اردو کی صورتِ حال

نئی دھلی: اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن (دہلی) کی ایک میٹنگ زیرصدارت پروفیسر خالد حامدی ہوئی جس میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قیام کے دوران اردو زبان کی اہمیت اور موجودہ صورت حال سے موازنہ کیا گیا۔ اس موقعے پر ڈاکٹر سید احمد خاں نے کہا کہ جامعہ میں دوبارہ اردو میڈیم کی حالت باعث خوشی ہے مگر اس پر تشویش کا اظہار کیا گیا کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے بانیان کے خاص طور سے اردو کے تعلق سے جو خواب دیکھا تھا آج معاملہ اس کے برعکس نظر آرہا ہے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں 5 فیصد اردو میڈیم کے طلبا کو داخلہ دیے جانے کا کوٹہ مقرر ہوا جس پر عمل ہونے کی ضرورت ہے۔ اسی طرح جامعہ میں ملازمت کے لیے اردو داں کو ترجیح دیے جانے کا بھی ذکر ہے۔ موجودہ وائس چانسلر کی روشن خیالی سے امید کی جاتی ہے کہ اس ادارے میں اردو کا کھویا ہوا وقار بحال ہوگا اور بانیانِ جامعہ کا خواب شرمندہ تعبیر ہوگا۔ اس موقعے پر متفقہ طور پر یہ طے پایا کہ ایک وفد اردو کی صورت حال کے مسئلے پر موجودہ وائس چانسلر سے ملاقات کرکے اہم مطالبات پیش کرے گا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 18 جولائی 2014

اردو میڈیم کی نصابی کتابیں

نئی دھلی: دہلی میں نئے تعلیمی سیشن کا آغاز ہوئے تقریباً 4 ماہ مکمل ہونے والے ہیں لیکن اردو میڈیم کے طلبہ کو نصاب کی تمام کتابیں ابھی تک دستیاب نہیں ہیں۔ اوّل تو اسکول میں طلبہ کو پڑھانے کے لیے اساتذہ نہیں ہیں، دوسرے اگر طلبہ خود پڑھنا چاہیں تو انھیں نصاب کی تمام کتابیں نہیں مل رہی ہیں۔ اردو میڈیم کے 11ویں جماعت کے طلبہ کو جغرافیہ، تاریخ اور پولیٹکل سائنس کی کتابیں تک نہیں مل سکی ہیں۔ اس سلسلے میں اردو نصاب کے کتب فروشوں کا کہنا ہے کہ یہ کتابیں انھیں دستیاب نہیں ہورہی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ کتابیں این سی ای آر ٹی شائع کرتی ہے لیکن کتابوں کی تقسیم کے لیے اردو اکادمی دہلی نوڈل ایجنسی کے طور پر کام کرتی ہے۔ اردو اکادمی کے 'بکس ڈویژن' کے انچارج محمد عزیز نے بھی بتایا کہ 11ویں جماعت کی جغرافیہ، تاریخ اور پولیٹکل سائنس کی کتابیں نہیں آئی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اکادمی میں این سی ای آر ٹی سے کتابیں آتی ہیں اکادمی انھیں بک سیلروں کے سپرد کردیتی ہے۔ اس سلسلے میں این سی ای آر ٹی کے پی آر او نے کہا کہ کچھ کتابوں کی اشاعت کا عمل جاری ہے اور یہ کتابیں جلد ہی مہیا کرادی جائیں گی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 19 جولائی 2014

لیڈی شری رام کالج اور سینٹ اسٹیفن کالج میں بی اے (اردو) پروگرام

نئی دھلی: دہلی یونیورسٹی کے ذاکر حسین دلی کالج، کروڑی مل کالج، ستیہ وتی کالج، ماتا سندری کالج اور

دیال سنگھ کالج کے علاوہ اردو کے طلبہ اب لیڈی شری رام کالج اور سینٹ اسٹیفن کالج میں بھی داخلہ لے سکتے ہیں۔ شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی کے صدر پروفیسر ابن کنول کی اطلاع کے مطابق طلبہ نے 10ویں یا 12ویں میں اردو بطور مضمون پڑھی ہو اور وہ اردو میں داخلے کے خواہش مند ہوں تو طلبہ مذکورہ کالجوں کے علاوہ لیڈی شری رام کالج اور سینٹ اسٹیفن کالج کے شعبہ اردو بی اے پروگرام میں داخلہ لے سکتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اردو طلبہ کی روزافزوں ترقی سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ اب اردو کا مستقبل بے حد تابناک ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 3 جولائی 2014

ٹیگور کی خودنوشت سوانح 'جیون شریتی' کا اردو ترجمہ 'میری یادیں'

نئی دھلی: شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ٹیگور پروجیکٹ کے زیر اہتمام رابندر ناتھ ٹیگور کی خودنوشت سوانح 'جیون شریتی' کا اردو ترجمہ 'میری یادیں' شائع ہوکر منظر عام پر آگیا ہے۔ واضح ہو کہ وزارت ثقافت حکومت ہند کے تفویض کردہ ٹیگور پروجیکٹ کے زیراہتمام شائع ہونے والی یہ پانچویں کتاب ہے جس کا بنگلہ سے براہ راست اردو ترجمہ فہیم انور (کلکتہ) نے کیا ہے۔ اس کتاب کا اردو میں ترجمہ پہلی بار ہوا ہے جس میں ٹیگور نے اپنی تعلیم، گھر اور باہر کے ماحول، نوکر شاہی، شاعری کی ابتدا، مختلف اسفار، اپنے گھریلو ماحول، والدین اور مختلف ادیبوں اور دوستوں کا ذکر نہایت ہی مؤثر ڈھنگ سے کیا ہے۔ اس کتاب میں متعدد دلچسپ واقعات سے صفحات بھرے پڑے ہیں۔ کتاب کے مترجم فہیم انور نے 'عرض مترجم' میں رابندر ناتھ ٹیگور اور میری یادیں پر مفصل روشنی ڈالی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ ٹیگور کی جملہ تحریروں کی تفہیم کے لیے ان کی خودنوشت 'میری یادیں' کلید کا درجہ رکھتی ہے۔ اس کتاب پر نظر ثانی ڈاکٹر کوثر مظہری نے کی ہے اور 'دو باتیں' کے تحت یہ رقم کیا ہے کہ میری یادیں اس لیے بھی پڑھی جائے گی کہ رابندر ناتھ ٹیگور کی زندگی کے مختلف مرحلوں اور منزلوں نیز ادب اور شب و روز کی کارگزاریوں سے واقف ہوا جاسکے۔ ان کی زندگی میں شخصیت سازی کے کیا مرحلے رہے ہیں قارئین ان سے واقف ہوسکیں۔ اس کتاب کی پہلی کاپی جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر اور اس پروجیکٹ کے سرپرست پروفیسر طلعت احمد صاحب کو پیش کی گئی۔

روزنامہ 'جدید خبر' دہلی، 17 جولائی 2014

اتر پردیش:

علی گڑھ یونیورسٹی میں اردو کی اہمیت کا ذکر

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر لیفٹیننٹ جنرل (ر) ضمیرالدین شاہ نے یو جی سی اکیڈمک اسٹاف کالج کے اس کارنامہ کو سراہا ہے کہ اس نے قومی سطح پر مختلف تعلیمی اداروں کے اساتذہ کے علم کو اپڈیٹ کرنے

کے ساتھ مسلم یونیورسٹی کی سیکولر اور جمہوری شبیہ کو اجاگر کیا ہے۔ وہ یو جی سی اکیڈمک اسٹاف کالج کے 131 اور 132 ویں اورینٹیشن پروگرام کی اختتامی تقریب سے مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے خطاب کررہے تھے۔ انھوں نے شرکا میں اردو کے تئیں رجحان پر مسرت کا اظہار کیا۔ انھوں نے کہا کہ اردو ہر اس ہندوستانی کی زبان ہے جو گنگا کے میدانی علاقوں کا رہنے والا ہے اور اس زبان کا تعلق کسی مذہب سے نہیں ہے۔ اس موقعے پر وائس چانسلر نے دیوا بکس نئی دہلی کی شائع کردہ اور یو جی سی اکیڈمک اسٹاف کالج کے ڈائریکٹر پروفیسر اے آر قدوائی کی مرتب کردہ کتاب 'نیو ڈائرکشنس ان ہائر ایجوکیشن' کا بھی اجرا کیا۔

پروفیسر اے آر قدوائی نے کہا کہ اکیڈمک اسٹاف کالج ہندوستان کی عظیم ثقافتی قومی تعمیر میں یکساں تعاون، پرامن بقائے باہمی اور بھائی چارہ کے فروغ کے لیے سرگرم عمل ہے۔ انھوں نے کہا کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی خود میں سیکولرازم کی زندہ مثال ہے۔ وائس چانسلر کی اہلیہ صبیحہ سیمی شاہ نے شرکا کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے سرٹیفکیٹ تقسیم کیے۔ پروفیسر اے آر قدوائی نے کورس کے شرکا کو اپنی کتاب کی کاپی اور سرٹیفکیٹ کی تقسیم میں بھی تعاون دیا۔ آسام کی پلوی سیکیا، مہاراشٹر کے مسٹر جمیر مومن اور مسٹر پرنو رتنا پارکھی نے اپنے شرکا ساتھیوں کی جانب سے کورس کے تعلق سے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ انھوں نے اس کورس کے ذریعہ رابطہ کی صلاحیت، وقت کا نظم اور تعلیم کو معاشرے سے جوڑنے کی صلاحیت حاصل کی ہے۔ انھوں نے مہمانِ خصوصی وائس چانسلر جنرل شاہ اور اکیڈمک اسٹاف کالج کے اسٹاف کو یادگاری نشانات پیش کیے۔ کیڈمک اسٹاف کالج کی ڈاکٹر ایس ریشما جمال نے نظامت کے فرائض انجام دیے جب کہ ڈاکٹر فائزہ عباسی نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 29 جولائی 2014

یو جی سی اکیڈمک اسٹاف کالج میں قومی یکجہتی مذاکرہ

علی گڑھ: وائس چانسلر ضمیرالدین شاہ نے کہا ہے کہ ہماری تہذیبی اقدار دیگر تہذیبوں سے بلند ہیں اور ہمیں دیگر مذاہب کے سلسلے میں وسیع القلبی کا مظاہرہ کرنا ہوگا۔ وہ یو جی سی اکیڈمک اسٹاف کالج میں منعقدہ قومی یکجہتی مذاکرہ سے بحیثیت مہمانِ خصوصی خطاب کررہے تھے۔ انھوں نے کہا کسی مذہبی تقریب میں رسمی طور پر شامل ہونے سے قومی یکجہتی کو فروغ حاصل ہوتا ہے اور اس سے خود کا مذہبی عقیدہ متاثر نہیں ہوتا، کیونکہ وہ ہمارے دل میں ہوتا ہے۔ تقریب کے مہمان ذی وقار پر وائس چانسلر برگیڈیئر (ریٹائرڈ) سید احمد علی نے اپنی فوجی خدمات کے حوالے سے کہا کہ سب سے زیادہ قومی یکجہتی کا عملی نمونہ ہماری افواج میں دیکھا جاسکتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہمارے ذہن میں پہلے سے موجود فرسودہ نظریات کی وجہ سے قومی یکجہتی متاثر ہوتی ہے لہٰذا ہمیں کوشش کرنی چاہیے کہ فرسودہ نظریات کو ترک کریں اور ایک دوسرے کے ساتھ عزت و احترام سے پیش آئیں۔ ہندو مذہبی پیشوا ڈاکٹر برجیش شاستری نے کہا کہ 18 پران اور 4 ویدوں کی تعلیمات کا نچوڑ یہ ہے کہ اپنی ذات سے کسی دوسرے شخص کو تکلیف نہ پہنچے بلکہ اس سے محبت کرکے عام انسانی ہمدردی کا مظاہرہ کیا جائے یہی ہندو مذہب کی اصل تعلیم ہے۔ کرشچین کمیونٹی کے پیشوا فادر یوسف نے کہا کہ مسلم یونیورسٹی قومی یکجہتی کا ماڈل ہے اگر کسی کو قومی یکجہتی کا عملی نمونہ دیکھنا ہو تو اس کے لیے علی گڑھ مثالی شہر ہے۔ علی گڑھ جامع مسجد کمیٹی کے ناظم حاجی محمد سفیان نے کہا کہ مشترکہ تہذیب اس ملک کی علامت ہے اور قومی یکجہتی ہماری سماجی ضرورت ہے۔ اکیڈمک اسٹاف کالج کے ڈائریکٹر پروفیسر عبدالرحیم قدوائی نے کہا کہ ملک کی گنگا جمنی تہذیب کو پروان چڑھانے اور قومی یکجہتی کو فروغ دینے کے لیے ضروری ہے کہ ایک دوسری کی تہذیب کا احترام کیا جائے۔ نظامت کے فرائض انجام دیتے ہوئے اکیڈمک اسٹاف کالج کی ایسوسی ایٹ ڈائریکٹر ڈاکٹر فائزہ عباسی نے کہا کہ قومی یکجہتی اور بھائی چارہ اس ملک کے خمیر میں شامل ہے۔

روزنامہ 'سیاسی تقدیر'، دہلی، 27 جولائی 2014

اے ایم یو علی گڑھ میں شام ادب کا انعقاد

علی گڑھ: انسان کے اندر انسانیت کا پانی خشک ہورہا ہے اس پانی کی ایک ایک بوند کو ادیب محفوظ کرسکتا ہے۔ تمام بڑے فنکاروں نے دلت اور دبے کچلے طبقے کو اپنے ادب کا حصہ بنایا ہے اور مساوات کا پیغام دیا ہے۔ ان خیالات کا اظہار روڈ ٹرانسپورٹ آفیسر اور معروف شاعر و ادیب ڈاکٹر وکرم سنگھ نے یو جی سی اکیڈمک اسٹاف کالج اے ایم یو علی گڑھ میں منعقدہ 'شام ادب' کے دوران کیا۔ یہ پروگرام ملک بھر سے جمع ہوئے اسکالروں کے اعزاز میں رکھا گیا تھا۔ اس سے قبل ڈاکٹر سیما صغیر نے ڈاکٹر وکرم سنگھ کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ ادب سماج کا درپن ہے اور وہ سماج کو بدل بھی سکتا ہے۔ زندگی کو اچھا بنانے میں ادب کا بڑا اہم کردار ہے۔ انھوں نے کہا کہ وکرم سنگھ کی کہانیوں میں مساوات، محبت، انسانیت کا پیغام ہے تو ان کی شاعری انسان کو انسان سے جوڑنے اور متحد ہوکر ساری دنیا کو مضبوط بنانے کا پیغام دیتی ہے۔ پروفیسر صغیر افراہیم کنوینر پروگرام نے کہا کہ ہندی اردو زبان کے درمیان اتفاق واتحاد دونوں زبانوں کو ترقی کی راہیں ہموار کرے گا۔ انھوں نے کہا کہ ڈاکٹر وکرم سنگھ کے سفرنامے، شعری مجموعہ اور کہانیاں کے مجموعے شائع ہوئے ہیں جن میں 'پانی کے نشان' اور 'لکڑ بگھے شہر میں' خاصے مقبول ہوئے ہیں۔ آخر میں ڈائرکٹر پروفیسر اے آر قدوائی نے کہا کہ ادب انسان کو حساس بناتا ہے اس لیے پروفیسر صغیر افراہیم نے اسکالروں کو ادب سے واقفیت اور ان میں سماج کے لیے حساس رویہ بیدار کرنے کے مقصد کے تحت اس طرح کے پروگرام کو شروع کیا ہے جو کہ قابل ستائش ہے۔ اس موقعے پر فائزہ عباسی، ڈاکٹر مہر الٰہی، مردولا سنگھ (آسام)، فاطمہ زہرہ، فرقان سنبھلی وغیرہ موجود تھے۔ صدارت پروفیسر اے آر قدوائی نے کی اور نظامت پروفیسر صغیر افراہیم نے کی۔

پریس ریلیز فرقان سنبھلی، علی گڑھ، 14 جولائی 2014

رضا لائبریری رام پور میں قرآن مجید کے نادر و نایاب نسخوں کی نمائش

رامپور: رامپور رضا لائبریری کے دربار ہال میں قرآن

مجید کے نادر و نایاب نسخوں کی نمائش لگائی گئی۔ 26 جولائی سے 2 اگست تک چلنے والی اس نمائش کا افتتاح ڈاکٹر شعائراللہ خاں نے کیا۔ اس موقعے پر گفتگو کرتے ہوئے ڈائریکٹر رضا لائبریری پروفیسر سید محمد عزیز الدین حسین ہمدانی نے بتایا کہ خالق کائنات نے انسانی زندگی کی فلاح و بہبود کے لیے جو آخری نظام حیات بنایا تھا اس کا نام قرآن مجید ہے جس کو اس نے اپنے آخری پیغمبر سرور کائناتؐ پر قیامت تک آنے والے انسانوں کی ہدایت و رہنمائی کے لیے نازل فرمایا۔ نمائش کے کنوینر اصباح خاں کے مطابق دربار ہال میں لگائی گئی نمائش کے ان نادر نسخوں میں سب سے قدیم اور سب سے اہم خلیفہ چہارم حضرت علیؓ کے ہاتھ کا لکھا ہوا پہلی صدی ہجری کا کلام پاک ہے جو ہرن کی کھال پر لکھا ہوا ہے اور ساتھ ہی امام جعفر صادقؒ، امام ابوالحسن موسیٰ الرضا کے ہاتھوں کے لکھے ہوئے نسخے بھی ہیں نیز خط نسخ کے موجد ابن مقلیہ اور ہارون رشید کے درباری خطاط یاقوت مستعصمی کا لکھا ہوا نسخہ بھی شامل ہے۔ اس نمائش میں مغل بادشاہ اکبر کی مہر ثبت کیا ہوا 16 ویں صدی کا نسخہ بھی موجود ہے۔ الفی قرآن، ورقی قرآن، واوی قرآن کے علاوہ کوفی رسم الخط کا 8 ویں صدی میں امام ابوعبداللہ جعفر بن محمد بن علی کا لکھا ہوا نایاب قرآن مجید، عربی نسخ بہار رسم الخط کا 1379 کا قرآن مجید جس میں عالمگیر بادشاہ کے منصب دار غضنفر کی ایک مہر ہے۔ عربی نسخ رسم الخط میں 1315 کا لکھا ہوا انتہائی خوبصورت قرآن مجید، محمد رضا کشمیری کے ذریعے خوبصورت کاغذ پر کتابت کیا ہوا 1743 کا عربی نسخہ رسم الخط کا قرآن مجید جس کی دو لائن کے درمیان کی جگہ کو سونے کے پانی سے سجایا گیا ہے موجود ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب'، دہلی، 27 جولائی 2014

'اردو بولے بلبل، ہندی بولے کوئل'

نئی دهلی: 'اردو بولے بلبل، ہندی بولے کوئل' اتر پردیش میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دینے کے خلاف دائر پٹیشن پر بحث کے دوران سپریم کورٹ کے چیف جسٹس راجندر مل لوڈھا نے یہ تبصرہ کیا۔ چیف جسٹس کی قیادت والی آئینی بنچ نے سرکاری زبان کے بارے میں آئینی بنچ میں ہوئی بحث کے دوران دونوں زبانوں کی اہمیت اور ضرورت کی بات کہی۔

آئینی بنچ نے کہا کہ لسانی اقلیت کے لیے ایک زبان کو سرکاری زبان کا درجہ دینے کا ریاستی سرکار کو اختیار حاصل ہے۔ اس لیے اردو کو اتر پردیش کی دوسری سرکاری زبان کا درجہ دینے کے اتر پردیش سرکار کے حکم کو غیر آئینی نہیں کہا جاسکتا۔ چیف جسٹس راجندر مل لوڈھا، جسٹس دیپک مشرا، مدن لوکر، شرداروند بوبڈے اور کرین جوزف کی آئینی بنچ کے سامنے اتر پردیش ہندی ساہتیہ سمیلن کی جانب سے سینئر وکیل شام دیوان نے دلیل دی کہ ہندی کو سرکاری زبان کا درجہ دیے جانے کے بعد کسی دوسری زبان کو سرکاری زبان کا درجہ دیا جانا غیر آئینی ہے۔

آئین ساز اسمبلی کے دلچسپ واقعات کا ذکر آنے پر چیف جسٹس نے دونوں زبانوں کو ایک جملہ میں پرو دیا اور کہا کہ ''اردو بلبل ہے تو ہندی کوئل'' ان کا مقصد تھا کہ دونوں زبانوں کی اپنی اہمیت ہے۔ آئینی بنچ نے کہا کہ یہ کہنا غلط ہے کہ سرکاری زبان کا درجہ دینے کا فیصلہ صرف ایک بار نہیں کئی بار کیا جاسکتا ہے۔ کسی خاص مقصد کے لیے سرکار اپنے آئینی حق کا استعمال کرسکتی ہے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 6 اگست 2014

منشی پریم چند کی خدمات پر مذاکرہ

گورکھپور: ممتاز افسانہ نگار منشی پریم چند اردو کے اہم ترین ادیب ہیں۔ انھوں نے اپنے ناولوں اور افسانوں میں ہندوستانی عوام کے کرداروں کے ذریعے اس عہد کی ایسی تصویر پیش کی ہے جس پر ان سے پہلے کسی ادیب کی نظر نہیں پہنچی تھی۔ مذکورہ خیالات کا اظہار ساجد علی میموریل کمیٹی کے زیر اہتمام منشی پریم چند جینتی پر منعقد ایک مجلس مذاکرہ میں محمد حامد علی نے کیا۔ انھوں نے کہا کہ اپنے افسانوں کے توسط سے پریم چند نے انسانی مسائل کو پیش کیا ہے اور انھیں حل کرنے کی بھرپور کوشش بھی کی ہے۔ اس موقعے پر ضمیر احمد پیام نے کہا کہ پریم چند نے 1900 سے 1936 تک جو کچھ لکھا وہ زمانہ ایسا تھا جب ہندوستانی معاشرت فکر و شعور کے اعتبار سے ایک نئے دور میں داخل ہورہی تھی۔ محبوب سعید حارث نے کہا کہ منشی جی ایسے افسانہ نگار ہیں، جنھوں نے اردو ادب کو سماجی حقیقت نگاری سے روشناس کرایا۔ انھوں نے سماج کے ہر پیشے کے کردار پیش کیے اور ناولوں میں باقاعدہ کردار نگاری کی ابتدا کی۔ اس موقعے پر سنتوش کمار ایڈوکیٹ حافظ عبدالرحمٰن، عمران بشر، آصف سعید، توفیق ساحر، حفیظ الحسن وغیرہ موجود تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، یکم اگست 2014

شبلی کالج میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کا نیا اسٹڈی سینٹر

اعظم گڑھ: شبلی نیشنل کالج کے تعلیمی سال 15-2014 میں مرکزی یونیورسٹی جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی کی اعلیٰ سطح

کی ٹیم نے کالج کے تمام وسائل کا جائزہ لینے کے بعد کچھ مضامین کے لیے کالج کو اپنا اسٹڈی سینٹر بنانے کا فیصلہ کیا ہے۔ مذکورہ اطلاع دیتے ہوئے کالج کے پرنسپل ڈاکٹر افسر علی نے بتایا کہ اس سے پہلے کالج کو یہ فخر حاصل تھا کہ یہاں راج رسی ٹنڈن یونیورسٹی، مولانا آزاد اردو یونیورسٹی حیدرآباد کے کورسیز گزشتہ کئی برسوں سے کرائے جارہے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ اس اسٹڈی سینٹر سے سیاسیات، تاریخ، ایجوکیشن، پبلک ایڈمنسٹریشن مضامین میں ایم اے کے علاوہ چار ڈپلومہ سی سی ایچ این ٹی، بی آئی بی ایف، پی 6 ڈی جی سی اور سی ای آئی ٹی کی بھی کلاسیز ہوں گے۔ انھوں نے امید ظاہر کی ہے کہ اعظم گڑھ کے طلبا و طالبات اس سے فائدہ اٹھائیں گے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 26 جولائی 2014

سو فیصد مسلم طلبہ میں ایک بھی اردو ٹیچر نہیں

اعظم گڑھ: بلاک لال گنج کے تحت موضع بیری ڈیہہ میں جو مسلمانوں کا اکثریتی گاؤں ہے 2007 میں ایک جونیئر ہائی اسکول قائم ہوا اور روز اول سے لے کر آج تک سو فیصد طلبہ اقلیتی سماج یعنی مسلم طبقہ کے ہیں لیکن حیرت ہے کہ اپنے قیام کے دن سے آج تک تعلیمی محکمے کی جانب سے ایک بھی اردو ٹیچر کی تقرری نہیں کی گئی۔ بیری ڈیہہ کے ڈاکٹر مستقیم احمد نے بتایا کہ اس سلسلے میں ریاستی وزیر وسیم احمد نے بھی اس معاملے پر بات کی تھی اور اردو ٹیچر کی تقرری کی طرف توجہ دلائی تھی۔ اسکول کے ہیڈ ماسٹر لال جی ورما نے بتایا کہ اردو ٹیچر کی تقرری کے سلسلے میں بار بار افسران کو لکھا گیا اور اس طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ واضح رہے کہ اس اسکول میں کل 160 مسلم اقلیتی طلبہ زیر تعلیم ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 21 جولائی 2014

انجمن ترقی اردو کے زیر اہتمام محفل آم اور غالب'

لکھنؤ: انجمن ترقی اردو اتر پردیش کے زیر اہتمام ایک جلسہ چودھری شرف الدین کی رہائش گاہ نعمت اللہ بلڈنگ میں 6 جولائی کو زیر صدارت چودھری شرف الدین اور الحاج ظفریاب جیلانی ایڈیشنل ایڈوکیٹ جنرل منعقد ہوا جس میں مختلف حضرات نے اردو کے تعلق سے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اہم مقررین میں ڈاکٹر شارب ردولوی، ڈاکٹر پروفیسر خان محمد عاطف، ڈاکٹر انور جلال پوری، ڈاکٹر مسیح الدین خاں، ڈاکٹر خواجہ محمد یونس، ڈاکٹر عارف الدین صابری اور دیگر شرکا نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ تمام ہی مقررین کا اس بات پر زور تھا کہ حکومت کو کوسنے کے بجائے ہم اپنے طور پر اردو کی ترقی کے لیے جو کچھ کر سکتے ہیں وہ کریں اور اپنے بچوں کو کم سے کم آٹھویں درجہ تک اردو ضرور پڑھوائیں اور گھر پر بھی ان کو اردو کی تعلیم دیں کیونکہ اگر ہماری نئی نسل اردو سے نابلد رہی تو ہماری شناخت اور وجود ختم ہو جائے گا۔ ڈاکٹر انور جلال پوری نے اس بات پر بھی زور دیا کہ یہ معلوم کرنے کی کوشش کی جائے کہ سرکاری امتحانوں میں ہماری حاضری تین فی صدی سے نہ بڑھی ہے اور نہ گھٹی ہے آخر ایسا کیوں کیا یہ ایک سازش ہے۔ اس کے بعد آم اور غالب کے سلسلے میں 36 ویں سالانہ تقریب بڑے اہتمام کے ساتھ منائی گئی جس میں رفعت شیدا صدیقی، پروفیسر شارب ردولوی، آفتاب اثر ٹانڈوی، ڈاکٹر رضوان الرضا اور دیگر حضرات نے نظم اور نثر میں 'آم اور غالب' کا پر لطف ذکر کیا۔ آخر میں صدرِ جلسہ چودھری شرف الدین صاحب اور محمود الظفر رحمانی نے آنے والے تمام شرکا کا شکریہ ادا کیا۔

روز نامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 8 جولائی 2014

انجمن ترقی اردو الٰہ آباد کی تحریک

الٰہ آباد: حکومت ہند کے زیر اہتمام چلائے جانے والے سینٹرل اسکولوں میں اردو اساتذہ کا فقدان ہے چنانچہ ان میں موجود اردو اساتذہ کی اسامیوں کو بحال کرانے اور پرائمری اور سینئر سکنڈری اسکولوں کی سطح پر اردو زبان کو فروغ دینے کے لیے انجمن ترقی اردو ہند کی الٰہ آباد شاخ نے ایک منظم تحریک چلانے کا فیصلہ کیا ہے۔ گزشتہ روز الٰہ آباد میں انجمن ترقی اردو ہند مجلس عاملہ الٰہ آباد شاخ نے ایک اہم میٹنگ کا انعقاد کیا جس میں سابق ایڈوکیٹ جنرل سید محمد احمد کاظمی، انجمن الٰہ آباد کے صدر پروفیسر علی احمد فاطمی، نائب صدر ڈاکٹر فخر الکریم، جنرل سکریٹری جاوید نظر، سکریٹری پروفیسر حسنین اختر، ڈاکٹر حسین جیلانی، محمد ابوبکر خان، ڈاکٹر فاضل ہاشمی، ڈاکٹر اے آر صدیقی، اقبال امیر اور نعیم احمد کے علاوہ دیگر عہدے داران نے شرکت کی۔ قبل ازیں پروفیسر فاطمی نے انجمن کے قیام کا مقصد بیان کرتے ہوئے کہا کہ اس وقت بطور خاص اتر پردیش میں اردو زبان کا فروغ بہت اہم کام ہے جس کے لیے ہمیں تحریک کی سطح پر کام کرنے کی ضرورت ہے۔ انھوں نے کہا کہ سب سے پہلے ہم الٰہ آباد کی سطح پر پرائمری اور سینئر سکنڈری اسکولوں کے اساتذہ کی ایک پوری ٹیم تیار کرنا چاہتے ہیں، تاکہ ان کے ساتھ بیٹھ کر اردو کے مسائل پر تبادلہ خیال کیا جائے۔ انھوں نے کہا کہ اس کے لیے ایک 8 رکنی کمیٹی تشکیل دی جانی ہے، تاکہ یہ کمیٹی تمام اساتذہ کے سامنے انجمن کے اغراض و مقاصد کو پیش کر سکے۔

روز نامہ 'انقلاب'، دہلی، 6 اگست 2014

تلنگانہ ریاست کا لوگو

الٰہ آباد: دوسری سرکاری زبان اردو والی چھ ریاستوں میں سے آندھرا پردیش سے منقسم نو تشکیل ریاست تلنگانہ کے سرکاری 'لوگو' میں اردو زبان کے استعمال سے اس زبان کی ضرورت و عظمت کے ساتھ اہمیت کا بھی اعتراف

کیا گیا ہے۔ ریاست تلنگانہ کے اس قدم پر اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن نے اسے آزاد ملک کی شاندار تاریخ کا حصہ قرار دیا۔ آرگنائزیشن کی کریلی میں منعقدہ مجلس عاملہ کی میٹنگ میں صدارتی خطاب میں ڈاکٹر نظام صدیقی نے کہا کہ ملک کی آزادی میں اہم کردار ادا کرنے اور تہذیب و اقدار کی ہر چہار جانب خوشبو بکھیرنے والی اردو زبان کو اگرچہ سرکاری سرپرستی سے محروم کیا گیا لیکن اس زبان کا کمال اور ہمہ جہت خوبیوں کا ثمرہ کہا جائے کہ ملک کی نو تشکیل ریاست تلنگانہ نے اپنے سرکاری لوگو میں باضابطہ اس کو نمایاں مقام دیا جو ہر سطح سے قابل ستائش اور دیگر ریاستوں کے لیے آئینہ ہے۔ طارق اعظمی نے کہا کہ ریاست میں حکمراں جماعت (سپا) کو اتر پردیش کے لوگو میں بھی ہندی انگریزی کے ساتھ اردو زبان کا استعمال کرنا چاہیے۔ تنظیم کے قومی صدر محمد اختر چوڑی والا نے آرگنائزیشن کی کارکردگی اور حصولیابیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ تلنگانہ کے وزیر اعلیٰ کے چندر شیکھر راؤ نے جس طرح یہ کام کیا ہے اسی طرح اتر پردیش کے کانگریسی سابق وزیر اعلیٰ این ڈی تیواری نے 1989 میں یہاں کا لوگو اردو بشمول زبانوں میں بنوایا چاہا تھا مگر اسے مکمل نہیں کر سکے۔ اس مجلس عاملہ کی میٹنگ میں متفقہ طور پر یہ تجویز منظور کی گئی کہ اس سلسلے میں اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ اکھلیش یادو اور سپا سربراہ ملام سنگھ یادو کو مکتب ارسال کیے جائیں گے اور مکمل اکثریت والی اس حکومت سے اس مطالبہ پر عملدرآمد کے لیے زور دیا جائے گا۔ واضح رہے کہ تلنگانہ حکومت کے تین زبانوں والے اس لوگو میں سے اوپر انگریزی میں، گورنمنٹ آف تلنگانہ، جب کہ دائیں جانب اردو میں تلنگانہ سرکار اور بائیں جانب وہاں کی مقامی تیلگو زبان میں تلنگانہ پربھوتوم' تحریر ہے جیسا کہ لوگو کے عکس کے نمونہ سے عیاں ہو رہا ہے۔

روز نامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 16 جولائی 2014

اترا کھنڈ:

اترا کھنڈ میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دینے کا مطالبہ

لکھنؤ: اتر پردیش میں 17 اکتوبر 1989 سے اردو کو دوسری سرکاری زبان کا قانونی درجہ حاصل ہے، اس کا گزٹ نمبر 980-1-89-21/4171 ہے۔ جس وقت یہ قانون اتر پردیش میں بنا تھا اس وقت اترا کھنڈ بھی اتر پردیش میں شامل تھا۔ اترا کھنڈ بننے کے بعد ابھی تک وہاں پر اردو کو دوسری زبان کا درجہ نہیں مل پایا ہے جبکہ بہار میں بھی اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ حاصل تھا۔ بہار سے الگ صوبہ جھارکھنڈ بنا تو وہاں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دے دیا گیا جبکہ اترا کھنڈ میں سنسکرت کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا گیا ہے۔ یہ ملکی زبانوں کے فروغ کا اچھا قدم ہے۔ لہٰذا عالی جناب سے گزارش ہے کہ اترا کھنڈ میں بھی جھارکھنڈ کی طرح اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دینے کا قانون بنا کر محبان اردو کو شکریہ کا موقع فراہم کریں۔ عزت مآب کی خدمت میں اردو کے فروغ اور اس کی ترویج کے لیے جو چند گزارشات دی گئی ہیں وہ حسب ذیل ہیں: (الف) اترا کھنڈ میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا جائے (ب) اترا کھنڈ و اتر پردیش کے سبھی آٹھویں تک کے اسکولوں میں اردو معلمین کی تقرریاں کی جائیں، نیز اردو کتابیں وقت سے چھپوا کر طلبا میں تقسیم کی جائیں (ج) اترا کھنڈ و اتر پردیش کے سبھی سرکاری دفتروں میں اردو مترجموں کی تقرریاں کی جائیں (د) اترا کھنڈ و اتر پردیش کی ودھان سبھا و ودھان پریشد کی زبان ہندی کے ساتھ اردو میں بھی کی جائے، نیز رکن اسمبلی کو مندرجہ بالا صوبوں کی طرح اردو میں حلف لینے کی سہولیت فراہم کی جائے۔

روز نامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 13 جولائی 2014

جموں و کشمیر:

کشمیری زبان کا رسم الخط

سری نگر: کشمیری زبان پر دیوناگری رسم الخط تھوپنے کی کوشش پر گہری تشویش ظاہر کرتے ہوئے جموں و کشمیر اردو کونسل (جے کے یوسی) نے متنبہ کیا ہے کہ ایسی کسی بھی کوشش کی مشترکہ طور پر اور پرزور مخالفت کی جائے گی۔ جموں و کشمیر اردو کونسل کے ترجمان جاوید منتجی نے کہا کہ ان دنوں چند مخصوص عناصر کی طرف سے کشمیری زبان کے موجودہ رسم الخط کو دیوناگری طریقے تحریر سے بدلنے کے لیے مہم چھیڑی گئی ہے۔ انھوں نے کہا کہ جموں و کشمیر اردو کونسل نے ان اطلاعات پر گہری تشویش ظاہر کی ہے اور یہ محسوس کیا ہے کہ ریاست کی سرکاری زبان اردو کے خلاف سازش کر رہے ہیں۔ کشمیر اردو کونسل کے ترجمان نے مزید کہا کہ یہ عناصر کشمیری زبان کے لیے نیا رسم الخط اختیار کرنے کی بات کر رہے ہیں لیکن جموں و کشمیر اردو کونسل نے ان عناصر کو اس بات سے آگاہ کر دیا ہے کہ دنیا کے کسی بھی حصے میں رہنے والے کشمیری اپنی مادری زبان کے لیے دیوناگری یا کوئی دوسرا رسم الخط قبول نہیں کریں گے۔ انھوں نے تمام لوگوں سے اپیل کی ہے کہ وہ بلاتفریق مذہب و ملت و علاقہ آگے آئیں اور اپنی مادری زبان کے خلاف کی جانے والی سازش کو ناکام بنا دیں۔

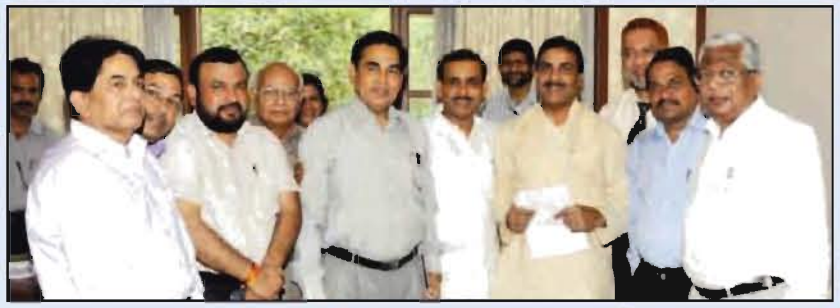

ممبئی یونیورسٹی میں اردو بھون کی تعمیر سے متعلق میٹنگ کے موقعے پر وزیر اقلیتی امور نسیم خان ممبئی یونیورسیٹی میں ذمے دار افسران کے ساتھ

روز نامہ 'صحافت' دہلی، 11 جولائی 2014

مہاراشٹر:

ممبئی یونیورسٹی میں اردو بھون کی تعمیر

ممبئی: مہاراشٹر کی ریاستی حکومت نے ممبئی یونیورسٹی میں اردو بھون تعمیر کرنے کی اجازت دے دی ہے اور اقلیتی امور کے وزیر محمد عارف نسیم خان نے یہ اعلان کیا ہے کہ اردو بھون کی تعمیر کے لیے جتنی رقم درکار ہوگی وہ ان کی وزارت ادا کرے گی۔ سرکاری سہیا دری گیسٹ ہاؤس میں وزیر ہائر ایجوکیشن/ وزیر برائے اعلیٰ تعلیم راجیش ٹوپے، پرووائس چانسلر رمیش چندرا کی موجودگی میں منعقدہ اعلیٰ سطحی میٹنگ کے دوران نسیم خان نے کہا کہ حکومت نے مضافات میں واقع ممبئی یونیورسٹی کی قطعہ اراضی پر چار منزلہ اردو بھون تعمیر کرنے کا فیصلہ کیا ہے جس میں منی تھیٹر، عالمی سطح کی لائبریری اور دیگر سہولیات دستیاب ہوگی۔ منعقدہ میٹنگ کے دوران وائس چانسلر چندرا، رجسٹرار خان، ڈاکٹر صاحب علی، مونیزہ خان (شعبۂ اردو ممبئی یونیورسٹی) نے بتایا کہ یونیورسٹی کی 638 میٹر قطعہ اراضی پر شعبہ اردو کی عمارت و اردو بھون تعمیر کیا جائے گا۔ اس موقعے پر نسیم خان نے کہا کہ اردو کی ترقی و ترویج کے لیے ممبئی یونیورسٹی میں ایک ایسی عمارت کی ضرورت تھی جہاں ایک ہی چھت میں تشنگان اردو کی پیاس بجھ سکے۔ واضح رہے کہ مہاراشٹر میں ریاستی حکومت نے مختلف اضلاع میں اردو بھون تعمیر کرنے کا فیصلہ کیا ہے جس میں ناندیڑ اور شولا پور میں اردو گھر کی تعمیر کا سنگ بنیاد بھی رکھا جا چکا ہے۔

روز نامہ 'انقلاب' ممبئی، 24 جولائی 2014

مہاراشٹر اردو اکادمی کا اردو ڈراما فیسٹول

ممبئی: اگر یہ کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا کہ اردو ڈراما کے 'اچھے دن آ گئے...! مہاراشٹر راجیہ اردو ساہتیہ اکادمی کا سالانہ اردو ڈراما فیسٹول، کردار آرٹ اکادمی کی میزبانی اور اقبال نیازی کی نگرانی میں دو روز تک ممبئی کے میسور اڈیٹوریم میں شائقین ڈراما اور موسیقی کو نہایت پروقار طریقے سے محظوظ کرتا رہا۔ پہلے دن مشہور ڈراما نگار اور فلم کار جناب ساگر سرحدی نے شمع افروزی کر کے فیسٹول کا روایتی انداز سے آغاز کیا، اس موقعے پر اردو اکادمی کے کارگزار صدر خورشید صدیقی، انوار احمد اعظمی، فاروق انصاری، وقار قادری (سپرنٹنڈنٹ) اور اقبال نیازی (کنوینر) موجود تھے۔ رفیق گلاب اپنی شگفتہ بیانی اور لفظوں کی جادوگری کے ساتھ فیسٹول کی نظامت کرتے رہے اور گلوکاروں کو اور ڈراما کے فنکاروں، ہدایت کاروں کو اسٹیج پر بلا کر انھیں متعارف کراتے رہے۔ پہلے دن بامعنی اور معیاری ڈرامے اسٹیج کیے گئے جن میں، کیس نمبر الاں فلاں، میری شادی، ماچس کی ڈبیہ، تین خاموش عورتیں، رام بجیون کی پریم کہانی، پشاور ایکسپریس، اوپن ڈور اور ناٹک نہیں کے نام اہم ہیں۔ دوسرے دن بھی سات ڈرامے راز (مالیگاؤں) جیب کترا (پونا)، اوپر کی منزل، سچ، میں خونی ہوں، یہ وہ سحر تو نہیں اور ناٹک کا چکر جیسے اثر انگیز، سنجیدہ اور پرلطف ڈرامے پیش کیے گئے۔ سعادت حسن منٹو کی کہانیوں پر 4 ڈرامے، کرشن چندر کی کہانی پر ایک ڈراما کرتار سنگھ دگل، اودے پرکاش، انیس جاوید کے تحریر کردہ ڈرامے اور اقبال نیازی مجیب خان، منصف قریشی، رجب جعفری، شکیل سایانی، اکبر خان، جتیندر شرما، آیت اللہ خان کی ہدایت کاری نے فنکاروں کی صلاحیتوں کو اسٹیج سے روشن کر دیا تھا۔ معروف ڈراما نگار، سنگر اور صحافی ناصر یوسف کی نگرانی میں دس سے زائد گلوکاروں نے دو روز میں 36 غزلیں اور گیت پیش کیے اور شائقین ان گیتوں کی سحر انگیزی میں تادیر ڈوبے رہے۔ اختتامی تقریب بھی انوکھی رہی جس میں پہلی بار مہاراشٹر اردو اکادمی کے ڈراما فیسٹول میں اسٹیج پر دس سے زائد معززین و مشاہیر موجود تھے جن میں جناب حسن چوگلے بطور خاص قطر سے اور جناب منور پیر بھائی، مسز ممتاز پیر بھائی، پونا سے تشریف لائے۔ اردو اکادمی کی جانب سے تمام فنکاروں کو یادگاری تمغے اور اسناد تقسیم کیے گئے۔

روز نامہ 'عزیز الہند' دہلی، 3 جولائی 2014

مغربی بنگال:

بردوان اُوور گرام ہائی مدرسہ قومی یکجہتی کی عظیم الشان مثال

آسنسول: اوور گرام ہائی اسکول کے تقریباً 1400 طلبہ میں غیر مسلم زیادہ ہیں اور مسلمانوں کی تعداد ایک چوتھائی

سے بھی کم ہے۔ جبکہ اوور گرام ہائی مدرسہ میں 1410 طلبہ میں 798 طلبہ غیر مسلم ہیں اور مدھیا مک سطح تک یعنی درجہ نہم اور درجہ دہم میں تقریباً 250 طلبہ عربی کی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ ہائر سیکنڈری سطح پر سائنس اور آرٹس کا شعبہ اس مدرسے میں قائم ہے جس میں طلبہ کی کل تعداد تقریباً 450 سے زائد ہے۔ سائنس اور آرٹس کا شعبہ ہونے کے باوجود 14 عدد الکٹیو سبجیکٹ اس مدرسے میں دستیاب ہیں۔ 1975 میں قائم شدہ اس مدرسے میں سنسکرت کے مدرس شیخ بہاؤ الدین ہیں جو سنسکرت کے تمام طلبہ کو سنسکرت پڑھاتے ہیں۔ 30 اپریل 2014 کو ہیڈ ماسٹر انور حسین کی سبکدوشی کے بعد مجلس انتظامیہ نے سینئر ترین مدرس توشار کانتی سائیں کو مدرسے کا ٹیچر انچارج مامور کیا ہے۔ اساتذہ نے ٹیچر انچارج کی سربراہی میں 5 رکنی ایک ٹیم تشکیل دی ہے اور مدرسہ کو بحسن و خوبی اس کی شاندار روایت کے ساتھ کامیابیوں سے چلانے کی حکمت عملی مرتب کی ہے۔ اسکول مجلس انتظامیہ کے صدر شری ہری ہڑدھرا اور سکریٹری سید محمد اعلان نے بھی اساتذہ کی حکمت عملی کو منظور دی ہے۔ اس مدرسے میں 36 عدد کل وقتی مستقل مدرسین میں 3 خاتون مدرسین ہیں جبکہ 6 پیرا ٹیچرس میں 3 خواتین ہیں۔

سینئر مدرس عبدالسلام نے راشٹریہ سہارا کے نمائندہ کو بتایا کہ یہ مدرسہ 1975 سے مستقل اپنی شاندار روایت کے ساتھ ترقی کی منازل طے کر رہا ہے اور نہایت ہی خوش گوار فضا میں مجلس انتظامیہ کے اراکین، مدرسین اور طلبہ مل جل کر ہائی مدرسہ کو رواں دواں رکھے ہوئے ہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ اس ہائی مدرسہ کی مجلس انتظامیہ کے اراکین، تدریسی عملہ اور طلبہ اور سرپرستوں کو دیکھ کر اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ یہی ہے ہمارے ہندوستان کی اصل تصویر جہاں ذات پات، دھرم اپنے اپنے گھر میں ہے اور تعلیم کے شوالہ میں سب کا مذہب صرف اور صرف تعلیم ہے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا'، مغربی بنگال، 16 جولائی 2014

اعزاز و اکرام

مہاراشٹر اردو اکادمی کے انعامات کا اعلان

ممبئی: مہاراشٹر اسٹیٹ اردو ساہتیہ اکادمی نے 2013

محمد کاظم شیخ — یونس اگاسکر — شمس الرحمٰن فاروقی

کے لیے انعامات کا اعلان کر دیا ہے۔ اس اعلان کے مطابق 'سنت گیانیشور قومی انعام' شمس الرحمٰن فاروقی کو، 'ولی دکنی قومی انعام' ڈاکٹر یونس اگاسکر کو اور 'سراج اورنگ آبادی ریاستی انعام' کے لیے ابراہیم اختر کے نام طے ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ سیتو مادھوراؤ پگڑی ایوارڈ برائے مراٹھی اردو ترجمہ' کا انعام پردیپ پھاڑکر اور نئے قلمکاروں کے لیے 'ساحر لدھیانوی ایوارڈ' ڈاکٹر معزہ قاضی کو دیے جانے کی بات طے پائی گئی ہے۔ جبکہ 'ہارون رشید صحافتی ایوارڈ' کے لیے روزنامہ انقلاب کے نمائندہ محمد کاظم شیخ، شارق نقشبندی (ایشیا ایکسپریس)، زاہد اختر (دیوانِ عام مالیگاؤں) اور محمد امین انصاری (اردو ٹائمز ممبئی) کے نام کا اعلان کیا گیا ہے۔

اردو اکادمی کے کارگزار چیئرمین محمد خورشید صدیقی کے مطابق علمی و ادبی خدمات کے لیے خصوصی انعام بریگیڈیئر مختار عالم (پونے)، مظفر سعید افروز (کامٹی ناگپور)، ظہیر الدین صدیقی (اورنگ آباد)، ڈاکٹر محمد یاسین قدسی (کامٹی)، پروفیسر محمد تلاوت علی (اورنگ آباد)، حبیب خان ریت پوری (امراؤتی)، پروفیسر عبدالرزاق شولاپوری، سید ریاض رحیم (ممبئی)، عالم نظامی (ممبئی) اور ایوب قاسم کرجیکر (رائے گڑھ) شامل ہیں۔

تدریسی خدمات کے طور پر خصوصی انعام کے لیے محمد سلمان محمد ادیب (کرلا، ممبئی)، محمد سلیم احمد محمد بشیر (امراؤتی)، تسنیم فاطمہ شیخ عبداللہ (پرلی)، خلیل احمد منیر الدین (ممبئی)، شیخ جمیلہ پرویز احمد (ممبئی)، سلمیٰ بیگم محمد حسین (ناندیڑ)، محمد ارشد راغب (کامٹی)، محمد عطاء الرحیم محمد موسیٰ (گوونڈی، ممبئی)، پروین بیگم قاضی رفیع الدین صدیقی (پربھنی) اور نسیم اسماعیل مقادم (کھیڈ رتنا گیری) کے ناموں کا اعلان کیا گیا ہے۔ اسی طرح کتابوں پر تحقیق وتنقید کے لیے ڈاکٹر رشید اشرف (ممبئی)، ڈاکٹر آغا غیاث الرحمٰن (ناگپور) اور یعوب راہی (میرا روڈ)، کو جبکہ شاعری کے لیے شمیم عباس (میرا روڈ تھانے)، ڈاکٹر مدحت الاختر (کامٹی) اور الیاس صدیقی (مالیگاؤں) انعامات کے لیے منتخب کیے گئے ہیں۔

بچوں کے ادب کے لیے صدر عالم گوہر (بھیونڈی)، نذیر فتح پوری (پونے)، ڈاکٹر اقبال برقی (مالیگاؤں) اور طنز ومزاح کے لیے سعید خان زیدی (اورنگ آباد) اور محمد طارق (امراؤتی) کے نام کا اعلان کیا گیا ہے۔

افسانہ، ناول، ڈراما اور فکشن کے لیے مشتاق مومن (پس از مرگ)، مقصود اظہر اور انیس جاوید (ممبئی) کے نام شامل ہیں۔ تعلیم و متفرقات کے لیے اشفاق عمر (مالیگاؤں)، پروفیسر رؤف الرحمان خان (ممبئی)، حنیف رمضان (بھیونڈی) اور ترجمہ کے لیے ملک اکبر کے نام کا اعلان کیا گیا ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' ممبئی، 17 جولائی 2014

مظفر علی کو راجیو گاندھی سد بھاؤنا ایوارڈ

نئی دھلی: راجیو گاندھی نیشنل سد بھاؤنا ایوارڈ اس سال باہمی میل ملاپ اور قومی یکجہتی پر فلم بنانے کے لیے مشہور ہدایت کار مظفر علی کو دینے کا اعلان ہوا ہے۔ یہ فیصلہ ایوارڈ

کی ایڈوائزری کمیٹی کی میٹنگ میں کیا گیا ہے۔ یہ 22 واں راجیو گاندھی سد بھاؤنا ایوارڈ ہوگا۔ جو مظفر علی کو ان کے سماجی کاموں اور قومی یکجہتی پر مبنی فلمیں بنانے پر دیا جارہا ہے۔ مظفر علی سماجی ورکر اور فلم بنانے کے ساتھ ساتھ صوفیانہ کلام بھی پیش کرتے ہیں۔ مذکورہ جانکاری کانگریس کے سینئر لیڈر موتی لال وورا نے دی ہے جو مشاورتی کمیٹی کے اہم ذمے دار بھی ہیں۔ 22 سال قبل یہ ایوارڈ راجیو گاندھی کی دیش کے لیے قربانی اور قومی یکجہتی کے لیے کیے گئے کاموں کی بنیاد پر قائم کیا گیا تھا۔ راجیو گاندھی نیشنل سد بھاؤنا ایوارڈ ہر سال راجیو گاندھی کے یوم پیدائش پر دیا جاتا ہے۔ ایوارڈ میں ایک توصیفی سند اور پانچ لاکھ روپے نقد دیے جاتے ہیں۔ یہ ایک ایسے شخص کو دیا جاتا ہے جس نے قومی ایکتا، بھائی چارہ، امن وشانتی اور باہمی رواداری اور دہشت گردی اور تشدد کے خلاف اہم کردار ادا کیے ہوں۔ اس سے قبل جن اہم لوگوں کو ان کے اہم کاموں کی وجہ سے مذکورہ راجیو گاندھی سد بھاؤنا ایوارڈ دیا گیا ہے ان میں مدر ٹریسا، استاد بسم اللہ خان، محمد یونس، مشترکہ طور پر ہتیشور سیکیا و محترمہ سبھدرا جوشی، لتا منگیشکر، سنیل دت، جگن ناتھ کول، دلیپ کمار، ڈاکٹر کپلا واتسیاین، مشترکہ طور پر تیستا سیتلواڑ اور ہرش مندر، ایس این سباراؤ، مشترکہ طور پر سوامی اگنی ویش مداری معین الدین، کے آر نارائن، نرملا دیش پانڈے،

اردو کے قلمکاروں، ادیبوں اور شاعروں کے اعزاز میں اترپردیش اردو اکادمی کی جانب سے منعقدہ انعامی تقریب کا ایک منظر

میہ دت، پروفیسر این رادھا کرشنن، گوتم بھائی، مولانا وحیدالدین خاں، اسپک موکے، ڈی آر مہتا اور استاد امجد علی خان شامل ہیں۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 2 اگست 2014

245 ادیبوں کو یوپی اردو اکادمی کے ایوارڈ

لکھنؤ: وزیراعلیٰ اکھلیش یادو نے اپنی سرکاری رہائش گاہ پر منعقد تقریب میں سال 2011، 2012، اور 2013 کی کتابوں پر اترپردیش اردو اکادمی کے ذریعے اعلان کیے گئے انعامات اردو کے قلمکاروں، ادیبوں اور شاعروں کو تقسیم کیے۔ اس تقریب میں تقریباً 245 افراد کو انعامات تقسیم کیے گئے جو اترپردیش کے علاوہ باہر کی ریاستوں سے بھی آئے تھے۔ اس موقعے پر وزیراعلیٰ نے کہا کہ اردو نے ہمیشہ دلوں کو جوڑا ہے۔ جب اردو بولی جاتی ہے تو پیار چھلکتا ہے اور محبت دکھائی دیتی ہے۔ یہ ایسی زبان ہے جو دلوں میں بس جاتی ہے اس لیے اردو کو دلوں کو جوڑنے والی زبان کہا جاتا ہے۔ وزیراعلیٰ نے ہر ادیب کو توصیفی سند، علامتی نشان اور انعامی رقم کا چیک پیش کیا۔ مسٹر یادو نے کہا کہ ہندی اور اردو مل کر سماج کو آگے بڑھانے کا کام انجام دے رہی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ریاستی حکومت کی منشا ہے کہ دونوں زبانیں مزید ترقی کریں اور انگریزی کا مقابلہ کریں۔ فی الوقت جو حیثیت اور احترام انگریزی زبان کو حاصل ہے وہ ان زبانوں کو بھی ملے۔ اکادمی کے چیئرمین ڈاکٹر نواز دیوبندی نے اپنی استقبالیہ تقریر میں ادارہ کی مختلف سرگرمیوں کی معلومات فراہم کرائیں۔ آئندہ اسکیموں کی تفصیل کی اطلاع دیتے ہوئے انھوں نے بتایا کہ اکادمی کے ذریعے اردو لینگویج لیب اور ای پبلشنگ پروجیکٹ پر کام کیا جارہا ہے۔ بچوں کے لیے ایک میگزین کی اشاعت شروع کرنے کا بھی منصوبہ ہے۔ اکادمی کے مرکزی لائبریری میں کتابوں کے ڈیجیٹلائزیشن کا کام جاری ہے۔ اکادمی نے آئی اے ایس اور پی سی ایس امتحانات کے امیدواروں کی کوچنگ کے لیے ایک کوچنگ سنٹر چلانے کی اسکیم بھی تیار کی ہے۔ نواز دیوبندی نے کہا کہ حکومت اترپردیش نے اس سال اردو اکادمی کی اسکیموں کے لیے دو کروڑ 33 لاکھ روپے منظور کیے ہیں، وزیراعلیٰ سے درخواست ہے کہ اترپردیش جیسی ریاست کے لیے یہ امداد بہت قلیل ہے، حیدرآباد، دہلی وغیرہ چھوٹے صوبوں میں ان کی اردو اکادمیوں کی گرانٹ ہم سے کہیں زیادہ ہے۔ جلسے کے اختتام پر سکریٹری اترپردیش اردو اکادمی ڈاکٹر شمیم احمد نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ نظامت کے فرائض اردو اکادمی کی مجلس منتظمہ کے رکن سید محمد ہاشم نے انجام دیے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 5 اگست 2014

ڈاکٹر سید سجاد حسین مدراس یونیورسٹی لینگویج کیمپس کے ڈائرکٹر نامزد

چنئی: ڈاکٹر سید سجاد حسین صاحب، صدر شعبۂ عربی، فارسی و اردو، یونی ورسٹی آف مدراس کو یکم جولائی 2014 سے مدراس یونی ورسٹی لینگویج کیمپس کا ڈائرکٹر مقرر کیا گیا

ہے۔ موصوف 1990 سے بورڈ آف اسٹڈیز کے چیرمین ہیں اور اسکول آف سنسکرت اور دیگر ہندوستانی زبانوں کے چیرپرسن کی حیثیت سے بھی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ان کی اب تک آٹھ کتابیں شائع ہوکر منظر عام پر آچکی ہیں اور پچاس سے زائد تحقیقی مضامین مقتدر رسائل وجرائد میں شائع ہوچکے ہیں۔ تمل ناڈو ٹکسٹ بک کمیٹی کے چیرپرسن کی حیثیت سے اردو کی پہلی جماعت سے بارھویں جماعت تک کی نصابی کتابوں کو ترتیب دینے کا سہرا بھی ان کے سر ہے۔ موصوف کی نگرانی میں 25 مقالہ نگاروں نے پی ایچ ڈی کی ڈگریاں حاصل کی ہیں اور سو سے زائد مقالہ نگاروں کو ایم فل کی ڈگریاں تفویض ہوچکی ہیں۔ تمل ناڈو میں اردو زبان و ادب کی خدمات کے اعتراف میں آپ کو کئی بار اعزازات سے نوازا جاچکا ہے۔ سابق گورنر آف تمل ناڈو سرجیت سنگھ برنالا جی نے 'مولانا ابوالکلام ایوارڈ' اور تمل ناڈو اردو اکادمی نے 'Best Teacher and Scholar Award' ایوارڈ سے نوازا ہے۔

پریس ریلیز، ڈاکٹر امان اللہ، شعبۂ عربی، فارسی و اردو، مدراس یونیورسٹی، چینئی، 8 جولائی 2014

ڈاکٹر سراج الدین ہاشمی کو 'گلشن علم' ایوارڈ

امروھه: ہاشمی ایجوکیشنل گروپ کے چیئرمین ڈاکٹر سراج الدین ہاشمی و ہاشمی گرلس پی جی کالج کی پرنسپل ڈاکٹر نوشابہ پروین کو ان کی اردو ادبی خدمات سے متاثر ہوکر پیتل بستی دستکار ایسوسی ایشن مرادآباد کی جانب سے زاہد حسین منصوری، ترنم ناظم منصوری و اختر العباس گلزار نے گلشن علم ایوارڈ سے سرفراز کیا۔ پیتل بستی دستکار ایسوسی ایشن مرادآباد کا خصوصی وفد اتوار کو ہاشمی گرلس پی جی کالج پہنچا اور وہاں گلشن علم ایوارڈ سے سرفراز کرتے ہوئے ہاشمی ایجوکیشنل گروپ کے چیئرمین سراج الدین ہاشمی کی اردو و ادبی خدمات پر تفصیلی روشنی ڈالی۔ اس موقعے پر ڈاکٹر حکیم سراج الدین ہاشمی نے پیتل بستی دستکار ایسوسی ایشن مرادآباد کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ ان کا مقصد نئی پیڑھی کو اردو سے روشناس کرانا اور طالبات کو معیاری تعلیم سے آراستہ کرانا ہے۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 4 اگست 2014

رونق جمال 'وقار ادب' ایوارڈ سے سرفراز

مالیگاؤں: درگ چھتیس گڑھ کے معروف قلمکار آل انڈیا افسانچہ اکادمی کے صدر رونق جمال کو مالیگاؤں مہاراشٹر میں اردو اکادمی مہاراشٹر، انجمن ترقی ہند اور سنٹرل لائبریری

مالیگاؤں میں منعقدہ پروگرام کا ایک منظر

کے مشترکہ پروگرام میں مقالہ خوانی کے لیے مدعو کیا گیا تھا۔ رونق جمال کو 'اردو افسانچہ زندگی اور اس کے مسائل سے کتنا قریب ہے' عنوان دیا گیا تھا۔ رونق جمال کی ادبی خدمات کو سراہتے ہوئے منتظمین نے انھیں وقار ادب ایوارڈ تفویض کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 2 اگست 2014

گلزار دہلوی کی 89 ویں سالگرہ

نئی دہلی: ملک کی بدقسمتی ہے کہ اب تک معروف شاعر اور مجاہد آزادی آنند موہن زتشی گلزار دہلوی جیسی شخصیت کو پدم ایوارڈ نہیں ملا ہے۔ بزرگ شاعر گلزار دہلوی ہندوستانی تہذیب اور ہندو مسلم اتحاد کی زندہ علامت ہیں۔ ان کی اردو کی خدمات اور گنگا جمنی تہذیب کے فروغ کے لیے گلزار دہلوی کو جلد سے جلد پدم ایوارڈ سے نوازا جائے۔ تقریب میں موجود سابق گورنر سید سبط رضی، سابق وائس چانسلر جامعہ ملیہ سید شاہد مہدی، صفدر ایچ خان و دیگر سرکردہ شخصیات نے اس بات کی تائید کی۔ ان خیالات کا اظہار گروپ ایڈیٹر روزنامہ راشٹریہ سہارا اور عالمی سہارا چینل سید فیصل علی نے ایک تقریب میں کیا۔ وہ انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر میں اردو تہذیب کے علمبردار گلزار دہلوی کی 89 ویں سالگرہ اور ان کے 71 ویں روزہ افطار کے موقعے پر 'روزہ رواداری' کے عنوان سے منعقد پروقار تقریب سے خطاب کر رہے تھے۔ انھوں نے کہا کہ گلزار دہلوی نے اردو زبان کو فروغ دینے میں کافی اہم رول ادا کیا اور نئی نسلوں کو ان کی زندگی سے بہت کچھ سیکھنے کی ضرورت ہے۔ اپنے صدارتی خطبے میں سابق گورنر سید سبط رضی نے کہا کہ گلزار دہلوی کو بھلے ہی ایوارڈ نہیں ملا ہو لیکن وہ ہمارے دلوں میں رقم ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ان کی شخصیت ہمارے لیے روشنی ہے اور ہم اس روشنی سے بہت کچھ حاصل کرسکتے ہیں۔ سید سبط رضی نے کہا کہ یہ مہینہ نہایت ہی برکت والا ہے جس میں عبادت کے ساتھ انسانیت کی فکر کرنا مسلمانوں کا اہم فریضہ ہے۔ سابق وائس چانسلر سید شاہد مہدی نے کہا کہ گلزار دہلوی وضع داری کی زندہ علامت ہیں اور انھوں نے اردو کی عظیم خدمت کی ہے جس پر ہم فخر کرتے ہیں۔ سید شاہد مہدی نے کہا کہ ان کا روحانی اور نعتیہ کلام جلد منظر عام پر آنے والا ہے جس سے نئی نسلوں کو مستفید ہونے کی ضرورت ہے۔ انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر کے نائب صدر صفدر ایچ خان نے کہا کہ گلزار دہلوی واقعی ناقابل فراموش انسان ہیں جنھیں پدم جیسے اہم اعزازات سے نوازا جانا چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ گلزار دہلوی نے تازندگی زبان اردو کی خدمت کی ہے۔ اس موقعے پر وزیر اعلیٰ اترا کھنڈ کے او ایس ڈی سید محمد قاسم اور چوتھی دنیا اردو کی ایڈیٹر محترمہ وسیم راشد نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 14 جولائی 2014

صغریٰ مہدی کی یاد میں ایوارڈ

لکھنؤ: اترپردیش اردو اکادمی نے مشہور اردو مصنفہ، بچوں کی کہانی کار اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کی سابق پروفیسر ڈاکٹر صغریٰ مہدی مرحومہ کی یاد میں قومی یکجہتی کے میدان میں بہترین اردو تخلیق کے لیے سالانہ ایوارڈ شروع کرنے کا اعلان کیا ہے۔

محکمۂ السنہ کے پرنسپل سکریٹری اشک گھوش نے بتایا کہ دو لاکھ روپے پر مشتمل یہ انعام قومی یکجہتی کے میدان میں خدمات کے لیے ہر سال کسی مشہور اردو رائٹر کو دیا جائے گا۔

صغریٰ مہدی جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ اردو میں پروفیسر تھیں، اسی سال 17 مارچ کو ان کا انتقال ہوا۔ ان کی پیدائش بھوپال میں ہوئی تھی۔ انھوں نے ناول، افسانہ، بچوں کی کہانیوں، تراجم اور علمی تحقیق پر مبنی انھوں نے تقریباً 40 کتابیں لکھی ہیں۔ صغریٰ مہدی کے نام پر یوپی اردو اکادمی کے ایوارڈ کا اردو حلقوں نے خیر مقدم کیا ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 26 جولائی 2014

ادب اطفال ایوارڈ

چندر پور / مہاراشٹر: ادب اطفال ایوارڈ 2013 کے لیے کتابیں مطلوب ہیں۔ اس انعام کے لیے ادب اطفال (اردو) کی ہر وہ کتاب (کہانی، ڈرامہ، نظم، ناول، سوانح حیات وغیرہ) جو جنوری 2013 سے دسمبر 2013 کے درمیان شائع ہوئی ہوں بھیجی جاسکتی ہیں۔ انعام میں 2100 روپیہ، شال اور مومنٹو شامل ہیں۔

شائع شدہ کتاب کی 3 جلدیں، ادیب کا مختصر تعارف اور ایک رنگین پاسپورٹ سائز فوٹو، پتہ لکھے پوسٹ کارڈ کے ساتھ 30 ستمبر 2014 تک ڈاکٹر بانو سرتاج بالمقابل آکاش وانی سرتاج سول لائن چندر پور، مہاراشٹر 4424 پر بھیجی جاسکتی ہیں۔ ناندیڑ (مہاراشٹر) میں بال کلیان سنستھان، کانپور (اترپردیش) کے زیر اہتمام ایک پروگرام میں انعام دیا جائے گا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 4 اگست 2014

ڈاکٹر عارف حسن خاں کے اعزاز میں الوداعی تقریب کا انعقاد

مرادآباد: شعبۂ اردو ہندو کالج کے صدر وایسوسی ایٹ پروفیسر ڈاکٹر عارف حسن خاں 36 برس درس وتدریس کے ذریعے اردو ادب کی خدمت انجام دیتے ہوئے 30 جون کو ملازمت سے سبک دوش ہوئے۔ لہٰذا اُن کی خدمات جلیلہ کا اعتراف کرتے ہوئے معززین شہر کی جانب سے اُن کے اعزاز میں الوداعی تقریب کا انعقاد مقامی نگر نگم ہال میں کیا گیا۔ تقریب کی صدارت کے فرائض ڈاکٹر مختار فہیم، ڈاکٹر ایس این سنگھ اور ڈاکٹر صابر سنبھلی نے مشترکہ طور انجام دیے۔ جبکہ شعبۂ اردو اے ایم یو علی گڑھ کے پروفیسر صغیر افراہیم اور ڈاکٹر قمر الہدیٰ فریدی نے بحیثیت مہمان خصوصی شرکت کی اور مہمانِ اعزازی کے طور پر رضا ڈگری کالج رام پور سے ڈاکٹر شریف احمد قریشی، ایم جی ایم کالج سنبھل سے ڈاکٹر عابد حیدری اور امروہہ سے ڈاکٹر مصباح احمد صدیقی نے شرکت فرمائی۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر مجاہد فراز اور محمد آصف حسین نے مشترکہ طور پر انجام دیے۔ اس موقعے پر بعد ڈاکٹر عارف حسن خاں کے مجموعہ رباعیات اور محمد آصف حسین کی مرتبہ کتاب 'ڈاکٹر عارف حسن خاں: شخصیت اور خدمات' کا اجرا عمل میں آیا۔ معززین شہر کی جانب سے ڈاکٹر عارف حسن خاں کو شال اور مومنٹو کے علاوہ ایک سپاس نامہ بھی پیش کیا گیا۔

عارف حسن خاں کی خدمات کا جائزہ پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر صابر سنبھلی، ڈاکٹر ایس این سنگھ سابق پرنسپل ہندو کالج، ڈاکٹر جے پال سنگھ ویست نے اپنے خیالات پیش کیے۔

پروگرام کے کنوینر محمد آصف حسین نے بتایا کہ ڈاکٹر عارف حسن خاں نے اپنی زندگی کے 36 سال میں 12 لوگوں کو پی ایچ ڈی کرائی پندرہ کتابیں تصنیف کیں جن میں تین شعری مجموعے بھی شامل ہیں۔ ان کا خاص میدان علم عروض ہے، اور وہ ہندوستان کے بڑے ماہرین عروض میں شمار کیے جاتے ہیں۔

صاحب اعزاز ڈاکٹر عارف حسن خاں نے حاضرین اور آرگنائزنگ کمیٹی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ مرادآباد کے لوگوں نے مجھے جتنا پیار دیا ہے اُسے فراموش نہیں کرسکتا۔

پریس ریلیز، مرادآباد، 18 جولائی 2014

رسم اجرا:

سرسید کی کتاب کا نیا ایڈیشن

علی گڑھ: سرسید احمد خاں نے نہ صرف ایک تعلیمی ادارہ قائم کیا تھا بلکہ ان کی علی گڑھ تحریک ایک مہذب اور تعلیم یافتہ معاشرے کی تشکیل پر منحصر تھی۔ ان خیالات کا اظہار ممتاز فلم اداکارہ پوجا بھٹ نے کیا۔ وہ نئی دہلی کے میریڈین ہوٹل میں علیشا پبلی کیشنز پرائیویٹ لمیٹڈ کے زیر اہتمام نئے انداز اور گیٹ اپ کے ساتھ شائع سرسید احمد خاں کی کتاب 'اسباب بغاوت ہند' کی

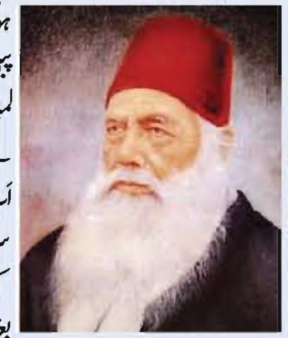

رسم اجرا کی تقریب سے خطاب کر رہی تھیں۔ پوجا بھٹ نے کہا کہ سرسید احمد خاں نے ہندوستانی مسلمانوں میں خوداعتمادی کا جذبہ پیدا کرتے ہوئے مستقبل کی تعمیر کے تئیں ان کی توقعات کو بیدار کیا۔ انھوں نے کہا کہ سرسید جیسی عظیم ہستیاں روز روز پیدا نہیں ہوا کرتیں بلکہ صدیوں میں جنم لیتی ہیں اور وہ جدید ہندوستان کے ایسے معمار تھے جن کا احسان ہمیشہ ملک کی نئی نسلوں پر رہے گا۔ فلم اداکارہ پوجا بھٹ نے ماہنامہ 'داعلی گڑھ مومنٹ' کے زیر اہتمام سرسید احمد خاں کو بھارت رتن دلائے جانے کی مہم کے تحت مطالبہ نامہ پر دستخط کرتے ہوئے کہا کہ میرے لیے یہ لمحات نہایت اہمیت کے حامل ہیں کہ میں ایک ہستی کے لیے بھارت رتن دیے جانے کے مطالبے پر دستخط کررہی ہوں جو قومی نہیں بلکہ عالمی سطح کی ممتاز ہستی ہے اور اس عظیم ہستی کو بھارت رتن دیے جانے کا مطالبہ بھی عالمی سطح پر ہونا چاہیے۔ اس سے قبل ممتاز فلم ساز اور سماجی کارکن مسٹر مہیش بھٹ نے 'اسباب بغاوت ہند' کا اجرا کرتے ہوئے کہا کہ سرسید احمد خاں ان عظیم ہستیوں میں سے ایک تھے جو خود تاریخ رقم کرکے دنیا میں اپنے نشان پا چھوڑ جاتی ہیں۔ انھوں نے نہ صرف ہندوستانی تعلیم کو نئی اقدار سے روشناس کرایا بلکہ اسباب بغاوت ہند تصنیف کرکے انگریزوں کو آئینہ بھی دکھایا جو اس زمانے میں نہایت جرأت وہمت کی بات تھی۔ مسٹر بھٹ نے ماہنامہ داعلی گڑھ مومنٹ کے ذریعہ سرسید احمد خاں کو بھارت رتن دلائے جانے کے لیے چلائی جارہی مہم کو سراہتے ہوئے کہا کہ اس ماہنامے نے سرسید کے لیے بھارت رتن کا مطالبہ کرکے ساری قوم پر احسان کیا ہے اور ہر ہندوستانی کا فرض ہے کہ وہ اس مہم میں ماہنامہ داعلی گڑھ مومنٹ کے ساتھ کاندھے سے کاندھا ملا کر چلے۔

ماہنامہ داعلی گڑھ مومنٹ کے مدیر جسیم محمد نے کہا کہ سرسید کی تعلیمات، نئی نسل کو سرسید کی خدمات سے روشناس کرانے اور علی گڑھ مومنٹ کو فروغ دینے کی غرض سے ماہنامہ داعلی گڑھ مومنٹ جاری کیا گیا تاکہ سرسید کی تعلیمات کو عام کیا جاسکے۔ جسیم محمد نے کہا کہ سرسید کی کتاب اسباب بغاوت ہند 1857 اپنا اصل وجود کھوچکی تھی اس لیے علیشا پبلی کیشنز نے اس کی دوبارہ اشاعت کی جو سرسید کو سب کا خراج عقیدت ہے۔ اس موقعے پر ڈاکٹر دولت رام، این جمال انصاری، فاطمہ علیمہ اور ماجد خاں وغیرہ خصوصی طور پر موجود تھے۔

روزنامہ 'سیاسی تقدیر' دہلی، 6 اگست 2014

اسلامک پرسپشن اینڈ پرسپیکٹو

نئی دہلی: جامعہ کے نومقرر وائس چانسلر پروفیسر طلعت احمد نے شعبۂ اسلامک اسٹڈیز کی بزم تحقیق کی جانب سے منعقدہ ایک تقریب میں شعبہ کے محققین کے مضامین پر مشتمل کتاب بنام 'اسلامک پرسپشن اینڈ پرسپیکٹو' کا اجرا کرتے ہوئے جامعہ میں تحقیق کے معیار کو مزید بلند کرنے پر زور دیا۔ انھوں نے کہا کہ جامعہ کی ترقی کے لیے ہم ویژنری سطح پر کام کریں گے۔ اس موقعے پر شیخ الجامعہ پروفیسر طلعت احمد، کمشنر برائے لسانی اقلیتی کمیشن، حکومت ہند پدم شری پروفیسر اختر الواسع نے شعبہ میں چل رہی تعلیمی سرگرمیوں اور ریسرچ کا مختصر تعارف کرایا۔

جامعہ کے شعبہ اسلامک اسٹڈیز کو جامعہ کی روح بتاتے ہوئے کہا کہ روزاوّل سے ہی یہ بطور مضمون پڑھایا جاتا رہا ہے اور 1988 سے اب تک باضابطہ آزادانہ طور سے شعبے کی حیثیت سے اپنی خدمات انجام دے رہا ہے۔ اب تک یہاں سے 50 کے قریب پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی جاچکی ہیں جبکہ 38 تحقیقاتی پروجیکٹ زیر تحقیق ہیں۔

'اسلامک پرسپشن اینڈ پرسپیکٹو' کے اجرا کا منظر

انھوں نے وائس چانسلر کے ترقیاتی منصوبوں کی تعریف کی۔ پروگرام کے اختتام کے بعد تمام مہمانان اور ریسرچ اسکالرس کے لیے افطار کا بھی اہتمام کیا گیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 16 جولائی 2014

'فکر ہاشمی' کی تیسری جلد

امروہہ: ہاشمی گرلس پی جی کالج امروہہ میں ہاشمی ایجوکیشنل گروپ کے سالانہ رسالے فکر ہاشمی (تیسری جلد) کا اجرا بدست چیئرمین نگر پالیکا پریشد امروہہ ڈاکٹر افسر پرویز و قدیمی تعلیمی درسگاہ امام المدارس انٹر کالج کے پرنسپل ڈاکٹر جمشید کمال کے ہوا۔ رسم اجرا کے بعد میڈیا سے گفتگو کرتے ہوئے تقریب کے مہمان خصوصی ڈاکٹر افسر پرویز نے ہاشمی ایجوکیشنل گروپ کی تعلیمی خدمات و کاوشوں کی پذیرائی کرتے ہوئے کہا کہ ہاشمی ایجوکیشنل گروپ کی میگزین کا شائع ہونا، اس بات کا ثبوت ہے کہ ہاشمی ایجوکیشنل گروپ کے ادارے تعلیمی معیار کے علمبردار ہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ رسالے کے ذریعے گروپ نے طالبات کے مضامین رسالے میں شائع کرا کے نئی پہل کی ہے۔ تقریب کی صدارت کررہے ڈاکٹر جمشید کمال نے کہا کہ فکر ہاشمی کی تیسری جلد کا مختصر مطالعہ کرنے سے ہی محسوس ہورہا ہے کہ یہاں زیر تعلیم طالبات آگے بڑھنے کے لیے بیتاب ہیں، اس موقعے پر انجمن ترقی اردو اترپردیش کے کنوینر شوق امروہوی، عادل رشید، ہاشمی لا کالج کی پرنسپل رعنا پروین، ہاشمی گرلس انٹر کالج کی پرنسپل حنا خان، معروف مصنف مصباح احمد صدیقی، مشاہد علی عباسی وغیرہ کے علاوہ شہر سے وابستہ جملہ ادبی وسماجی شخصیات موجود رہیں۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 4 اگست 2014

مینا کماری کی شاعری پر کتاب

نئی دہلی: ہندوستان کے معروف اقلیتی ادارہ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں مینا کماری کی شاعری پر مبنی 'مینا کماری کی

ڈاکٹر حدیث انصاری کی کتاب 'بدلتے پیمانے' کا اجرا

شاعرانہ زندگی سنیما گھر کے پیچھے' نام سے ایک کتاب کا رسم اجرا عمل میں آیا۔ کتاب کا رسم اجرا جامعہ کلچرل سوسائٹی اور رولی بکس کے تحت کیا گیا۔ نور الحسن نے اس کتاب کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ اس کتاب پر مصنف نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ مینا کماری کی جو شاعری ہے وہ ان کی زندگی پر مبنی ہے اور انھوں نے اس میں وہ پیش کرنے کی کوشش ہے جو عورت کی زندگی سنیما گھر کے پیچھے ہوتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ اس کو اردو میں ترجمہ اس لیے کیا ہے کہ مینا کماری کی زندگی اور ان کی شاعری عام اردو داں قاری تک پہنچے اور وہ بھی سمجھ سکیں کہ مینا کماری کیا تھی اور سنیما گھر کی زندگی کیا ہوتی ہے۔ پروگرام کلچرل کمیٹی کے انیس الرحمٰن، تسنیم مینائی، اور رول بکس کے دیڈسی حسن حریش ترویدی، بھی موجود تھے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 6 اگست 2014

بدلتے پیمانے

اندور: شعبۂ اردو کریمیہ کالج، اندور کی طرف سے ڈاکٹر حدیث انصاری (ایسوسی ایٹ پروفیسر شعبۂ اردو، موہن لال سکھاڈیا یونیورسٹی، اودے پور) کی کتاب 'بدلتے پیمانے' کا ایک باوقار تقریب میں اجرا کیا گیا۔ بدلتے پیمانے' ہندی کے معروف ادیب ڈاکٹر یوگیندر ناتھ شکل کے افسانچوں کا انتخاب ہے جس کو ڈاکٹر حدیث انصاری نے 'بدلتے پیمانے' کے نام سے اردو ترجمہ سے آراستہ کیا ہے۔

رسم اجرا کی تقریب میں مہمان خصوصی دیوی اہلیہ یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر پروفیسر اے اے عباسی، مہاتما گاندھی یونیورسٹی چتر کوٹ کے سابق وائس چانسلر ڈاکٹر نریندر ویرمنی، آئی کے سوسائٹی، اندور کے سکریٹری پروفیسر محمد حلیم خاں، ہندی کے معروف شاعر جناب ستیہ نارائن ستن نے شرکت کی۔ کتاب کے اجرا کرتے ہوئے تقریب کے صدر ڈاکٹر نریندر ویرمنی نے کہا کہ ڈاکٹر حدیث انصاری کی کتاب 'بدلتے پیمانے' ہندی اردو لسانی اتحاد کا انمول رتن ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ علم وفن کے فروغ میں ترجمے کا عمل روز اوّل سے کلیدی رہا ہے۔ ان افسانچوں کا موضوع انسان، سماج، سیاست اور کائنات کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتا ہے جس میں فرد، جماعت، سماج، سیاست اور تہذیب کے موجودہ نشیب وفراز کی حقیقی تصویر کو دیکھا جاسکتا ہے۔ اس موقعے پر دیگر حضرات نے بھی اپنے خیالات پیش کیے۔ اس موقعے پر شہر اور مضافات کے محبِّ اردو اور ہندی کے ادیب، فنکار اور شاعر کثیر تعداد میں موجود رہے۔ تقریب کی نظامت ایچ باجپئی نے کی اور آئی کے کالج کے پرنسپل پروفیسر ایم کے جھنور کے اظہار شکر پر اجلاس کا اختتام ہوا۔

پریس ریلیز، صدیق اختر، اسلامیہ کریمیہ کالج، اندور، 14 جولائی 2014

پاکستان کے تاریخی مندروں پر کتاب

نئی دهلی: پاکستان کی ایک صحافی ریمہ عباسی اور فوٹو گرافر مدیحہ اعجاز نے پاکستان کے تاریخی ہندو مندروں پر ایک کتاب بمعہ تصویروں کے مرتب کی ہے جس کا اجرا دہلی میں کیا گیا۔ پرسار بھارتی بورڈ کے سی ای او جواہر سرکار نے کتاب کا اجرا کیا۔ اس کتاب کا عنوان ہے 'پاکستان کے تاریخی مندر۔ ضمیر کی آواز' اور اسے دہلی کے نیوگی بکس نے شائع کیا ہے۔ اس کتاب کا پیش لفظ مشہور ہندوستانی صحافی جاوید نقوی نے لکھا ہے۔ اس کتاب میں پاکستان میں موجود کئی قدیم ہندو مندروں جیسے ہنگلاج، کٹاس راج، کالکا گپھا، شیوالہ مندر، پنچ مکھی ہنومان مندر کو شامل کیا گیا ہے جو 1500 برس سے بھی زیادہ پرانے ہیں۔ اس کتاب میں پنجاب کے چکوال ضلع میں مقیم کٹاس راج مندر کا ذکر قدرے تفصیل سے کیا گیا ہے جسے ہندو مقدس مندر تسلیم کرتے ہیں اور جس کے بارے میں یہ خیال کیا جاتا ہے کہ پانڈو چودہ برس کی اپنی جلاوطنی کے دوران یہاں رہے تھے۔ کتاب کی مصنفہ ریما عباسی اور مدیحہ اعجاز پچھلے کئی برسوں سے اس پروجیکٹ پر کام کر رہی تھیں اور تقریباً ایک برس تک انھوں نے پاکستان کے چار صوبوں بلوچستان، خیبر، پختون، پنجاب اور سندھ کا دورہ کرکے پاکستان میں موجود ہندو مندروں کی تفصیلات بیان کی ہیں اور تقریباً 400 فوٹو گرافس اس کتاب میں شامل کیے گئے ہیں۔ اس کتاب کا پیش لفظ لکھنے والے صحافی جاوید نقوی کا کہنا ہے کہ گزشتہ دس برسوں میں پاکستان میں غیر معمولی تبدیلی رونما ہوئی ہے اور دس برس پہلے جہاں کسی دوسرے مذاہب کی عبادت گاہوں کا ذکر کرنا غیر اسلامی فعل تصور کیا جاتا تھا۔ اب وہاں دوسرے مذاہب خاص کر ہندو تہذیب اور ہندو عبادت گاہوں کا ذکر احترام کے ساتھ ہونے لگا ہے اور ریما عباسی کی یہ کتاب اس کا ایک نمونہ ہے۔ خود کتاب کی مصنفہ ریما عباسی کا کہنا ہے کہ انھوں نے جان بوجھ کر کتاب کا عنوان ضمیر کی آواز اس مقصد سے دیا ہے تاکہ ملک کے ساجھا ضمیر کو جھنجھوڑا جاسکے۔ ریما عباسی کا کہنا ہے کہ ہمیں تمام مذاہب اور عبادتوں کا احترام کرنا چاہیے اور انھیں برابری کی اہمیت دی جانی چاہیے۔ یہی اس کتاب کا اصل مقصد ہے۔

روزنامہ 'عزیز الہند' دہلی، 5 اگست 2014

ریت پہ پانی لکھتا ہوں

جودھپور: 26 جون 2014 کی شام ہوٹل چندرا ان کے آڈیٹوریم میں منعقدہ اس پروگرام میں اشراق الاسلام کا پہلا مجموعہ 'ریت پہ پانی لکھتا ہوں' کا اجرا محترم شین کاف نظام کے دست مبارک سے عمل میں آیا۔ 'تحریر' کے سکریٹری محمد نعمان شیرانی نے استقبالیہ تقریر میں بزم کے اغراض و مقاصد پیش کیے۔ رسم اجرا کے موقعے پر منعقدہ ادبی مذاکرے میں مقالہ پڑھتے ہوئے سردار پٹیل پولس یونیورسٹی جودھپور میں انگریزی کی اسسٹنٹ پروفیسر ڈاکٹر جاگرتی اپادھیائے نے مابعد جدیدیت کے تناظر میں مغربی شعرا کے ساتھ ماہر کا موازنہ و تجزیہ کیا تو ہندی کے ادیب راکیش موتھا نے ایک شاعر کے نظریہ سے ماہر کی غزلوں میں چھپی حسیت کو اجاگر کیا۔ وہیں جے نرائن ویاس یونیورسٹی جودھپور میں سنسکرت کی پروفیسر ڈاکٹر سروج کوشل نے ماہر کے شعروں میں تضاد سے پیدا شدہ حسن کو ظاہر کیا۔ اس موقعے پر پروفیسر ظہور خاں مہر، پروفیسر کنہیالال راج پروہت، پروفیسر کوشل ناتھ اُپادھیائے جیسے عالموں کے ساتھ ساتھ اردو کے علاوہ ہندی اور راجستھانی کے معزز شعرا موجود تھے۔ آخر میں محمد افضل جودھپوری نے شکریہ ادا کیا۔ پروگرام کی کامیاب نظامت ڈاکٹر نثار راہی نے کی۔

پریس ریلیز، ریاض الدین آفریدی، نائب صدر تحریر، جودھپور، 21 جولائی 2014

وفیات

ہلڑ مرادآبادی

ممبئی: طنز ومزاح کے مشہور ہندی شاعر ہلڑ مرادآبادی کا دل کا دورہ پڑنے سے انتقال ہوگیا۔ وہ 72 برس کے تھے۔ ان کے پسماندگان میں اہلیہ کرشنا چڈھا، بیٹا نونیت، بیٹی ونیا اور منیشا ہیں۔ ہلڑ مرادآبادی کے بیٹے نونیت نے یو این آئی کو بتایا کہ ان کا انتقال شام چار بجے ہوا۔ ادبی دنیا میں ہلڑ مرادآبادی کے نام سے مشہور سشیل کمار چڈھا کی پیدائش 29 مئی 1942 مں ہوئی تھی۔ ان کے انتقال پر ادیبوں، صحافیوں اور فنکاروں نے رنج وغم کا اظہار کیا ہے۔ پاکستان کے گجرانوالہ میں پیدا ہونے والے مسٹر ہلڑ مرادآبادی نے ہندی ادب میں اہم رول ادا کیا۔ ان کی مشہور مجموعے اونچی مت چھوڑو، کیا کرے گی چاندی، یہ اندر کی بات ہے، تروینی، ہلڑ کا ہلڑ، تتھا کتھت بھگوان کے نام، سب سے مقبول اور انعام یافتہ کتاب ہے۔ انھیں کلاشری انعام، تھتولی پرسکار، مہاکوی نرالا سمان، اٹہاس ساہتیہ کار سمان، کاکا ہاتھری سمان اور ہاستیہ رتن جیسی کئی مشہور انعام سے نوازے گئے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 13 جولائی 2014

ڈاکٹر محمد یوسف عثمانی

گلبرگه: ممتاز شاعر و ادیب ڈاکٹر محمد یوسف عثمانی طویل علالت کے بعد ممبئی کے ایک ہسپتال میں 27 جون 2014 بروز جمعہ کی دوپہر 76 برس کی عمر میں انتقال کر گئے۔ ان کی تدفین 28 جون کی صبح 9 بجے اورنگ آباد دکن میں عمل میں لائی گئی۔ پسماندگان میں اہلیہ ڈاکٹر رعنا حیدری سابق صدر شعبۂ اردو، ڈاکٹر بی اے ایم یونی ورسٹی اورنگ آباد) دختران ڈاکٹر نائیلہ، ڈاکٹر سویدا کے علاوہ فرزند جناب ہشام عثمانی ہیں۔ ڈاکٹر یوسف عثمانی 29 دسمبر 1938 کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کی ابتدائی تعلیم، میڈیکل ڈپلوما اور ایم اے (اردو) تاریخی شہر اورنگ آباد کی دین ہے۔ 'خودکلامی' اور 'آئینے' کے نام سے یوسف عثمانی کے شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

بذریعہ ڈاک: غضنفر اقبال، گلبرگہ، کرناٹک، جولائی 2014

زلیخا حسین

کوچی: برصغیر کی معروف ومشہور ناول نگار زلیخا حسین کا انتقال اپنے آبائی مکان ودھوتھلا میں بروز منگل بتاریخ 16 جولائی 2014 کو ہوگیا۔ ان کی آخری رسوم کی ادائیگی ورناکولم کے جامع مسجد قبرستان میں کی گئی۔ موصوفہ 85 برس کی تھیں۔ ان کی

پیدائش کچھی میمن خانوادے متچیری، کوچی کیرالا میں 1 جنوری 1930 میں ہوئی۔ ان کے والدین حاجی عبداللہ احمد پیٹھ مریم بی بی کا سایہ بچپن میں ہی ان کے سر سے اٹھ گیا، لہٰذا ان کی (کفالت) پرورش و پرداخت کی ذمے داری ان کے دادا جان جانی سیٹھ جو ایک اردو شاعر تھے نے اٹھائی۔ انھوں نے اپنی ابتدائی تعلیم مشن چیری کے ایشیا بھال مدرسہ سے اردو اور عربی کی تعلیم حاصل کی۔ ان کے تخلیقی محرک موصوفہ کے خاوند حسین سیٹھ بنے جن کی صحبت میں ناول لکھنا شروع کیا۔ موصوفہ نے 27 ناول اور درجنوں افسانے لکھے جو سب کے سب اردو زبان میں ہیں۔ ان کا پہلا ناول 'میرے صنم' تھا اس ناول کو وشواجیت پران نے 1965 میں فلمایا تھا جو اپنے وقت میں سوپر ہٹ ہوئی۔ اس فلم کے نغمہ نگار او پی نیر اور گلوکار محمد رفیع تھے۔ اس ناول کے علاوہ کچھ اور مشہور ناول تھے جن میں راہ اکیلی، دشوار ہوا جینا، ایک خواب حقیقت، اور سرلا ہے کالی، میرے صنم، ایک پھول اور ہزار غم، راہ اکیلی، تاریکیوں کے بعد، صبا، اور بھولنے والے، پتھر کی لکیر، یادوں کے ستم، زندگی مسکرائی، آدمی اور سیک ہے، آسمان کے تلے، نصیب نصیب کی باتیں، مزرعِ ساحل، کل کیا ہوا، اپنا کون قابل ذکر ہیں جنھیں شمال اور جنوبی ہند کے علاوہ پاکستان 'طمیں بھی شہرت ملی۔ ان کا سب سے زیادہ کامیاب اور مشہور ناول 'تاریکیوں کے بعد' کا ترجمہ ملیالم زبان میں روی ورمانے 1980 میں کیا تھا۔ اردو ادب میں ان کی بیش بہا خدمات کو دیکھتے ہوئے وزارت ثقافت ہند نے فیلوشپ اوارڈ کے لیے سلیکشن کمیٹی کے رکن کی حیثیت سے 2012 میں نامزد کیا ان کے خاوند حسین سیٹھ کا انتقال 1996 میں ہوگیا تھا۔

نیو انڈین اکسپریس، کوچی، 16 جولائی 2014

خراج عقیدت

شبنم گورکھپوری کی یاد میں گورکھپور میں جلسہ

گورکھپور: جدید اردو ادب فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام ایک اہم مجلس بیاد شبنم گوکھپوری منعقد ہوا جس میں گورکھپور یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے صدر ڈاکٹر رضی الرحمٰن بطور خاص شریک ہوئے، اور فاؤنڈیشن کے سکریٹری عبدالرحمٰن استاد شبنم گورکھپوری کی یاد میں منعقد ہونے والے جلسے میں عقیدت ومحبت کے ساتھ شریک ہوئے، جلسے میں اردو ادب سے تعلق رکھنے والی اہم شخصیات نے بھی شرکت کی۔ گورکھپور کے عظیم شاعر ومترجم شبنم گورکھپوری کی پہلی برسی پر متعلقین دوست واحباب اور شاگردوں نے نہایت افسوس کا اظہار کیا۔ جلسے میں موجود سبھی لوگوں نے شبنم صاحب کو عقیدت ومحبت سے یاد کرتے ہوئے انھیں خراجِ عقیدت پیش کیا۔ جدید اردو ادب فاؤنڈیشن کے

سکریٹری عبدالرحمٰن جو ان کے خاص شاگردوں میں رہے ہیں نے شبنم صاحب کو تحسین پیش کرتے ہوئے کہا کہ اس ایک سال میں مجھے احساس ہوگیا کہ شبنم صاحب کی رہنمائی کا کوئی بدل نہیں ہے۔ اشفاق احمد عمر نے کہا کہ استاد کی مہربانیوں اور شفقتوں کا میں ہی نہیں بلکہ یہ شہر ہمیشہ مقروض رہے گا۔ گورکھپور یونیورسٹی میں صدر شعبہ اردو ڈاکٹر رضی الرحمٰن نے کہا کہ شبنم گورکھپوری ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ اللہ رمضان المبارک کی برکتوں کے طفیل انھیں جنت الفردوس عطا فرمائے۔ اس جلسے میں عہد لیا کہ جلد ہی استاد شبنم گورکھپوری کی یاد میں ایک بڑا سیمینار منعقد کرایا جائے اور شبنم گورکھپوری کے نام سے ایک 'ایوارڈ' بھی ادب کے طلبا کو ہر سال دیا جائے گا اور شبنم گورکھپوری صاحب کی خدمات کو اردو ادب میں کبھی فراموش ہونے نہیں دیا جائے گا۔

روزنامہ 'جدید خبر' دہلی، 9 جولائی 2014

محمد رفیع کی یاد میں انوکھی خراج عقیدت

ممبئی: ہندوستان کے مشہور ترین گلوکار مرحوم محمد رفیع کی یاد میں بہت سے پروگرام منعقد ہوئے اور ان پر متعدد کتابیں لکھی گئیں مگر گزشتہ دنوں ممبئی میں بالی ووڈ آن ایئر نے محمد رفیع کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لیے کچھ ایسی انوکھی پہل کی جس کی مثال اس سے پہلے کبھی نہیں ملتی۔ اس کوشش کے تحت پہلی بار رفیع صاحب کی یاد میں ایک تھیم سانگ بنایا گیا ہے جسے فلمی دنیا کے 31 مشہور گلوکاروں نے ایک ساتھ مل کر آواز دی۔ اس نغمے کو ممبئی میں منعقد ایک شاندار پروگرام میں بالی ووڈ کی تمام مشہور شخصیات کی موجودگی میں لانچ کیا گیا۔ اب اس گانے کو مختلف ذرائع سے رفیع صاحب کے دیوانوں کے درمیان پہنچایا جائے گا۔ اس گانے کو ایڈ اسٹیشن اور رفینس نے مل کر تیار کیا ہے۔ اس انوکھی پہل کی شروعات کرنے والے عمران شاہد نے کہا کہ ہماری ٹیم نے اس کے لیے بڑی محنت کی اور ہم نے ایسا اس لیے کیا تاکہ ایک طرف جہاں ہم ہندوستان کے اب تک کے بہترین سنگر کو خراجِ عقیدت پیش کرسکیں وہیں ہم اس کے ذریعے یہ بتانا بھی چاہتے ہیں کہ سنگیت کی روح بچی رہے اور اس کا معیار گرنے نہ پائے۔ عمران نے کہا کہ میوزک انسان کی زندگی کا ایک

اہم حصہ ہے اور اگر یہ اوریجنل بنا رہے گا تبھی اس کے فائدے سامنے آئیں گے اور لوگ اس کا مزہ لے سکیں گے۔ لانچنگ کے موقعے پر کئی بڑی فلمی ہستیاں شریک ہوئیں۔

روزنامہ 'جدید خبر' دہلی، 2 اگست 2014

ممبئی میں محمد رفیع کی 34 ویں برسی کا اہتمام

ممبئی: بالی ووڈ کے مشہور گائیک پلے بیک سنگر محمد رفیع کی 34 ویں برسی منائی گئی، محمد رفیع کے مختلف زبانوں میں

گائے گئے گیتوں کی مجموعی تعداد کا اندازہ پچیس اور چونتیس ہزار کے درمیان لگایا جاتا ہے۔ وہ چوبیس دسمبر 1924 کو امرتسر کے قریب کوٹلہ سلطان سنگھ میں ایک متوسط مسلمان گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد حاجی علی محمد اہلِ خانہ کے ساتھ 1935 میں لاہور منتقل ہوگئے۔ محمد رفیع اپنے گاؤں کی گلیوں میں پھرنے والے ایک فقیر کی نقل کرتے ہوئے گایا کرتے تھے۔ ان کے بڑے بھائی جناب حمید صاحب کو اپنے چھوٹے بھائی کے اندر چھپی فنکارانہ صلاحیتوں کا جلد ہی اندازہ ہوگیا اور پھر انھوں نے پنی پوری توجہ محمد رفیع کو دنیائے موسیقی میں وہ مقام دلوانے میں صرف کردی، جس کے وہ بجا طور پر مستحق بھی تھے۔ سات سال کی عمر سے ہی محمد رفیع نے اپنے دور کے بڑے فنکاروں استاد بڑے غلام علی خاں اور استاد وحید خان سے کلاسیکی موسیقی کی تعلیم حاصل کرنا شروع کردی تھی۔ 1941 میں لاہور میں بطور پلے سنگر اپنے فنی کریئر کا آغاز کیا۔ محمد رفیع 1944 میں ممبئی میں منتقل ہوگئے۔ محمد رفیع کے مختلف زبانوں میں گائے گئے گیتوں کی تعداد 34 ہزار بتایا جاتا ہے۔ 31 جولائی 1980 کو بھارت کے مایہ ناز گلوکار کا دل کا دورہ پڑنے سے انتقال ہوگیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس دور کے نامور گائیک کے ایل سہگل کو ایک پروگرام میں اپنے فن کا مظاہرہ کرنا تھا تاہم عین وقت پر غالباً بجلی چلے جانے کے بعد انھوں نے گانے سے انکار کردیا۔ تب محمد رفیع بھی وہیں موجود تھے، جنھیں اسٹیج پر آکر اپنی آواز کا جادو جگانے کا موقع دیا گیا۔ وہیں انھیں موسیقار شیام سندر جی نے پہلی مرتبہ سنا تھا۔ اُس وقت ان کی عمر تقریباً بیس برس تھی، جب انھوں نے فلم 'گل بلوچ' کے لیے اپنا پہلا گیت پنجابی زبان میں ریکارڈ کروایا۔ یہ فلم اٹھائیس فروری 1944 کو ریلیز ہوئی۔ شیام سندر جی محمد رفیع کی آواز سے اتنا متاثر ہوئے کہ انھوں نے اپنی تمام آنے والی فلموں کے لیے رفیع صاحب کو پلے بیک سنگر کے طور پر بک کرلیا۔ اگلے چار برسوں میں یعنی 1948 تک محمد رفیع بمبئی کی فلمی دنیا میں بہت سی فلموں میں اپنی آواز کا جادو جگانے کے بعد پلے بیک گلوکار کے طور پر اپنا ایک مستحکم مقام بنا چکے تھے۔ اُسی دور میں محمد رفیع کو موسیقار نوشاد کے ساتھ بھی کام کرنے کا موقع ملا اور پھر تو نغمہ نگار شکیل بدایونی، موسیقار نوشاد اور گلوکار محمد رفیع کی ایک ایسی ٹیم بن گئی کہ جس نے دنیائے موسیقی کو ایک سے ایک ہٹ گیت دیا۔ محمد رفیع نے اپنے دور کے تقریباً سبھی بڑے موسیقاروں کے ساتھ کام کیا۔ 1965 میں بھارت کا اعلیٰ ترین اعزاز پدم شری سے نوازا گیا۔ لکشمی کانت اور پیارے لال کی موسیقار جوڑی کے ساتھ بھی محمد رفیع نے کام کیا۔ آنجہانی لکشمی کانت نے محمد رفیع کی یادیں تازہ کرتے ہوئے ڈوئچے ویلے کو بتایا تھا کہ وہ اُن لوگوں کے لیے بھی گیت گادیا کرتے تھے، جو کہتے تھے کہ اُن کے پاس کم پیسے ہیں یا معاوضہ ادا نہیں کرسکیں گے۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 2 اگست 2014

فلمی کامیڈین محمود کا یومِ وفات

ممبئی: اپنے مخصوص انداز، حرکات وسکنات اور آواز سے تقریباً پانچ عشرے تک شائقین کو ہنسانے اور گدگدانے والے محمود نے فلمی صنعت میں 'کنگ آف کامیڈی' کا درجہ حاصل کیا لیکن انھیں اس کے لیے کافی محنت اور جدوجہد کرنی پڑی تھی اور یہاں تک سننا پڑا تھا کہ 'وہ نہ تو کبھی ایکٹنگ کرسکتے ہیں اور نہ ہی کبھی اداکار بن سکتے ہیں'۔ چائلڈ آرٹسٹ سے مزاحیہ اداکار کی شکل میں اپنا مقام بنانے والے محمود کی پیدائش ستمبر 1933 کو ممبئی میں ہوئی تھی۔ ان کے والد ممتاز علی بمبئی ٹاکیز اسٹوڈیو میں کام کیا کرتے تھے۔ گھر کی مالی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے محمود ملاڈ اور ورار کے درمیان چلنے والی لوکل ٹرینوں میں ٹافیاں فروخت کرتے تھے۔ بچپن کے دنوں سے ہی محمود کا رجحان اداکاری کی طرف تھا اور وہ اداکار بننا چاہتے تھے۔ ان کے والد کی سفارش کی وجہ سے محمود کو بمبئی ٹاکیز کی سال 1943 میں ریلیز ہونے والی فلم 'قسمت' میں اداکار اشوک کمار کے بچپن کا کردار نبھانے کا

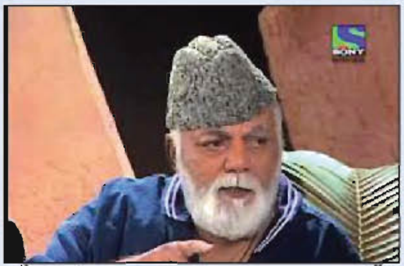

موقع مل گیا۔ دریں اثنا محمود نے کار ڈرائیو کرنا سیکھا اور فلم ساز گیان مکھرجی کے یہاں بطور ڈرائیور کام کرنے لگے۔

محمود کی قسمت کا ستارہ اس وقت چمکا جب فلم 'نادان' کی شوٹنگ کے دوران اداکارہ مدھوبالا کے سامنے ایک جونیئر اداکار دس ری ٹیک کے بعد بھی اپنا ڈائیلاگ نہیں بول سکا۔ فلم کے ڈائرکٹر ہیرا سنگھ نے یہ ڈائیلاگ محمود کو بولنے کے لیے دیا، جسے انھوں نے غیر ری ٹیک کے ایک بار میں ہی اوکے کردیا۔ اس فلم میں محمود کو بطور محنتانہ 300 روپے وصول ہوئے۔ اس کے بعد بطور جونیئر آرٹسٹ محمود نے 'دو بیگھہ زمین'، 'جاگرتی'، 'سی آئی ڈی' اور 'پیاسا' جیسی فلموں میں چھوٹے موٹے رول کیے، جن سے انھیں کچھ خاص فائدہ نہیں ہوا۔ اس کے بعد محمود نے نئے جوش خروش کے ساتھ کام کرنا جاری رکھا۔ اسی دوران محمود کو بی آر چوپڑا کے کیمپ سے بلاوا آیا اور محمود کو فلم 'ایک ہی راستہ' کے لیے کام کرنے کی تجویز ملی۔ 1958 میں ریلیز ہونے والی فلم 'پرورش' میں ان کو ایک اچھا رول مل گیا۔ اس فلم میں محمود نے راج کپور کے بھائی کا کردار نبھایا۔ اس کے بعد انھیں ایل وی پرساد کی فلم 'چھوٹی بہن' میں کام کرنے کا موقع ملا، جو ان کے فلمی کیریئر کے لیے اہم فلم ثابت ہوئی۔ فلم 'چھوٹی بہن' میں بطور معاوضہ محمود کو 6000 روپے ملے۔ فلم کی کامیابی کے بعد بطور اداکار محمود فلم انڈسٹری میں اپنی شناخت بنانے میں کامیاب ہوگئے۔ فلم میں ان کی اداکاری کو دیکھ ایک اخبار ٹائمز آف انڈیا نے ان کی جم کر تعریف کی۔ سال 1961 میں محمود کو ایم وی پرساد کی فلم 'سسرال' میں کام کرنے کا موقع ملا۔ اس فلم کی کامیابی کے بطور مزاحیہ اداکار محمود فلم انڈسٹری میں اپنی شناخت بنانے میں کامیاب ہوگئے۔ محمود نے کئی فلموں میں فلم سازی اور ہدایت کاری کی۔ محمود نے کئی فلموں میں اپنے خود گائے گانے سے بھی سامعین کو اپنا دیوانہ بنایا۔ محمود کو اپنے فلمی کیریئر میں تین بار فلم فیئر ایوارڈ سے نوازا گیا۔ اپنے پانچ دہائی سے طویل فلمی کیریئر میں تقریباً 300 فلموں میں اپنی اداکاری کا جوہر دکھانے والے محمود 23 جولائی 2004 کو اس دنیا سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہوگئے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 23 جولائی 2014